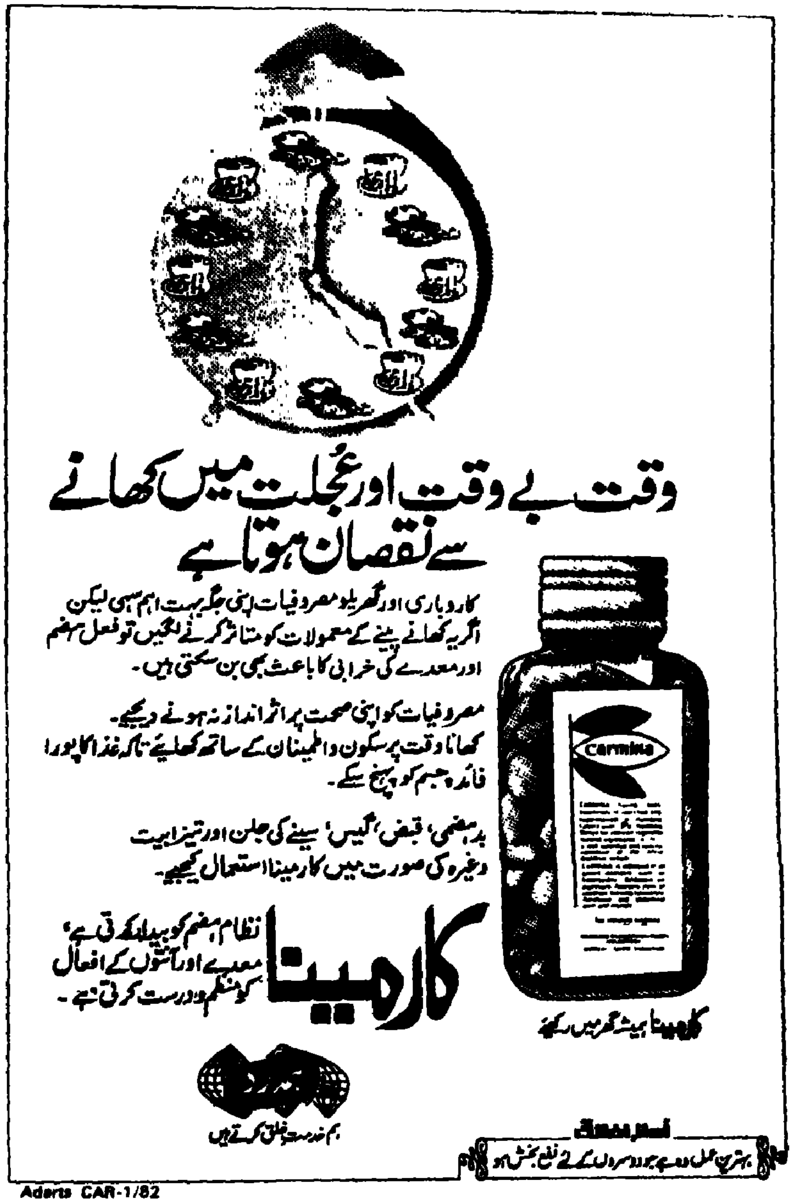
نیرنگِ خیال

اشاعتِ خصوصی

سلسلۂ اشاعت [illegible] شعبۂ [illegible] اردو [illegible] دہلی



Aderts CAR-1/82

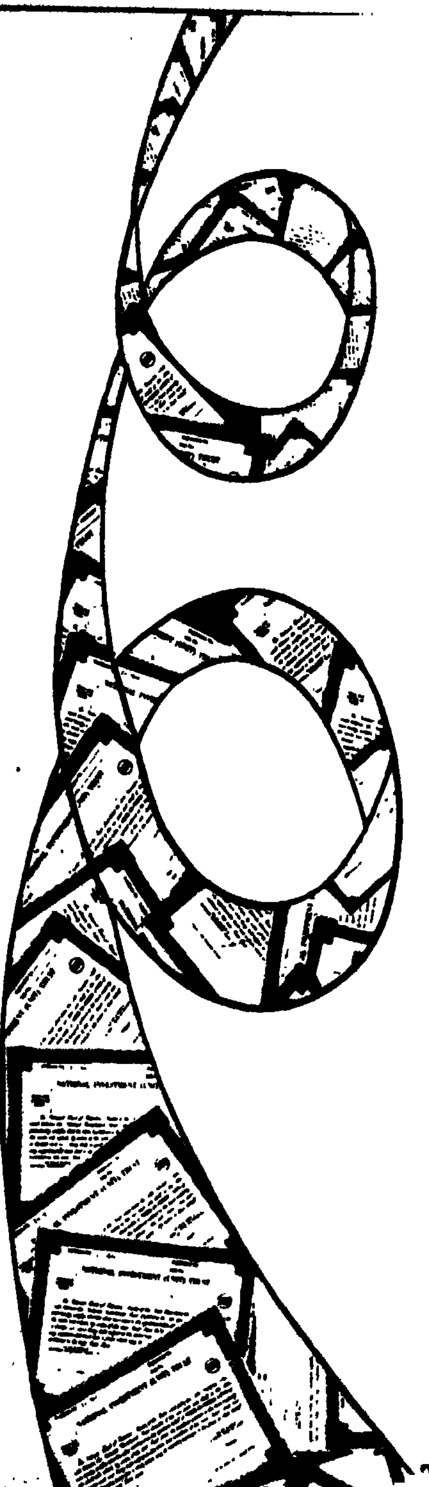
"Let us work and trust to God
so that we may leave
a richer heritage to our children
than all the gold of the world,
viz freedom for which
no sacrifice is too great."

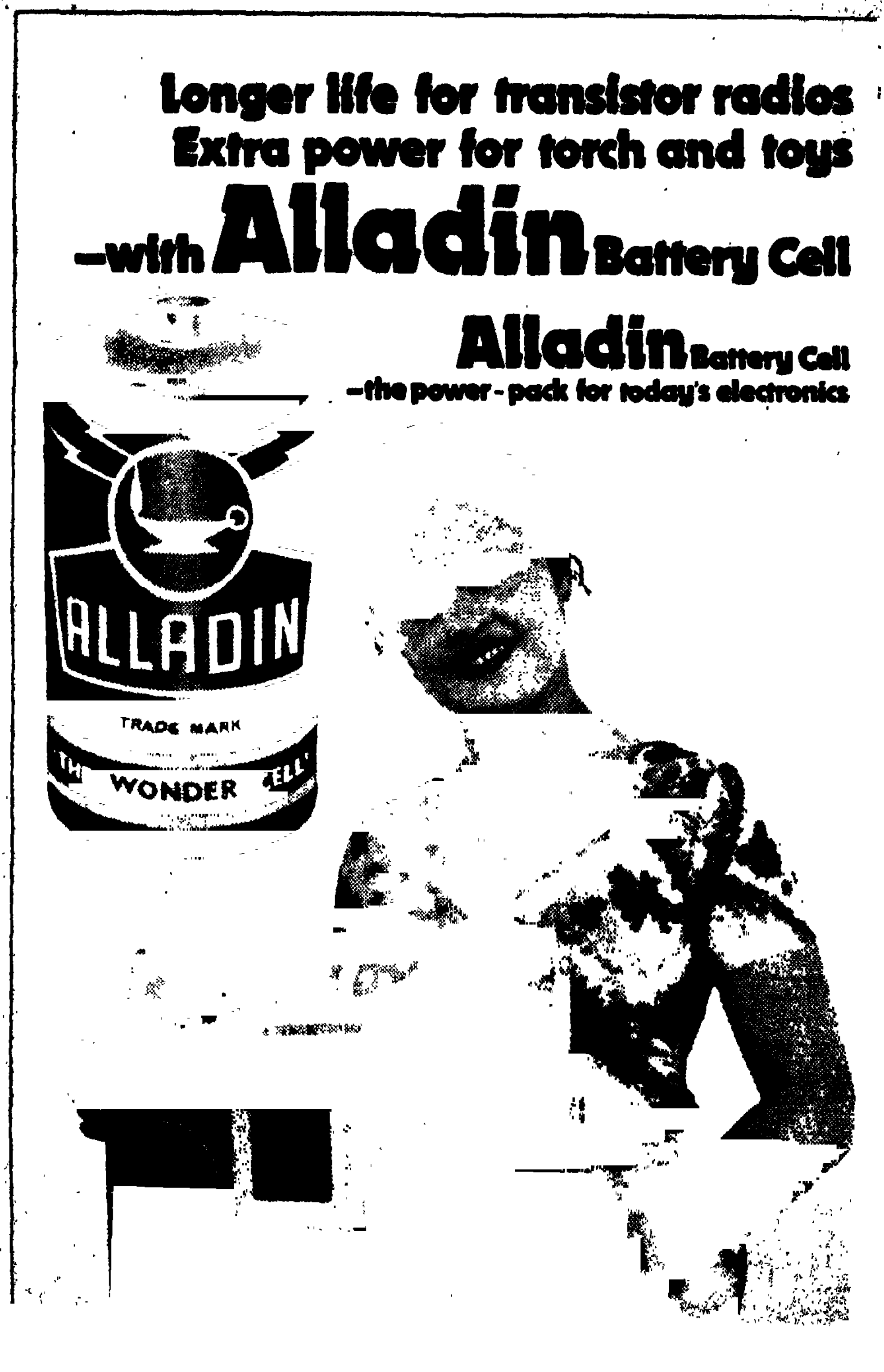




سمرکوئین — ہابرموکر کا شاہانہ لباس

بہ شکریہ ... راولپنڈی




Longer life for transistor radios
Extra power for torch and toys
—with Alladin Battery Cell
Alladin Battery Cell
—the power-pack for today's electronics
ALLADIN
TRADE MARK
WONDER

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ

ترجمہ : اللہ تعالےٰ فضول خرچی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے

توانائی میں بچت کیجئے

آپ کے ملک کا اربوں روپیہ توانائی پر خرچ ہوتا ہے۔ اس کے بے جا استعمال سے گریز کیجئے۔ یاد رکھیئے! پٹرولیم پر حکومت روزانہ ۵ کروڑ روپے کا زرِ مبادلہ خرچ کرتی ہے۔ گیس کے استعمال پر بیرونِ ملک قیمت کے لحاظ سے روزانہ ۶ کروڑ روپے۔ بجلی کی پیداوار پر حکومت کا خرچ ۲۰،۵ کروڑ روپے روزانہ ہوتا ہے۔ پٹرول، ڈیزل، مٹی کا تیل، قدرتی گیس، بجلی ہمارے لئے نعمتیں ہیں۔ ان کا ضیاع مت کیجئے۔ توانائی کے استعمال میں بچت روزمرہ کی زندگی کا اصول بنایئے۔ ایندھن کل کی ضرورت ہے

ادارہ وسائل توانائی حکومت پاکستان


کیڑے مکوڑے کہیں بھی چھپیں
ٹائی فون
ٹوٹل کنٹرول
وسیع تر ہے
Perfumed
TYFON
TOTAL CONTROL
FOR SURE KILL
TYFON LIMITED, KARACHI. LANDHI

بانی: حکیم محمد یوسف حسن

ماہنامہ

نیرنگِ خیال

راولپنڈی

جلد:- ۵۹
شمارہ:- ۷۵۹ - ۷۵۸

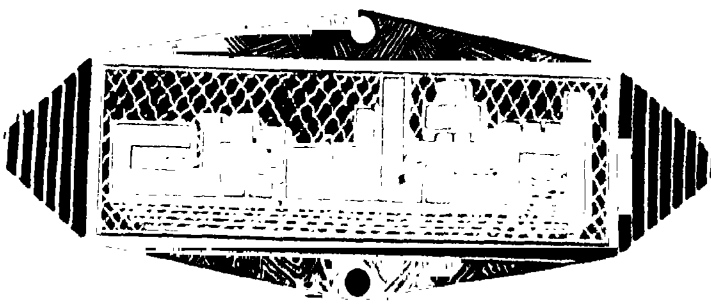
ستمبر - اکتوبر —————— ۱۹۸۲ء

مدیر —————— سلطان رشک

Fixed Price Rs. 45/-
قیمت —————— تیس (۳۰) روپے

مراسلت کے لئے
۸، محمدی مارکیٹ نرنکاری بازار راولپنڈی - فون ۷۰۹۰۱-۷۲۹۲۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



طنز و مزاح

انشائیے

شاعری

فن اور شخصیت

خاکے

انتظاریہ اور تبصرے

مینجر ———— ملک محمد عظیم

معاون ———— عبدالرحمٰن چشتی

تزئین و کتابت ———— افتخار احمد - محمد اسلم چیمہ

بیرونی ممالک سے: ابر انڈیا ۲۰ ڈالر زر سالانہ ۵۰ روپے مع محصول ڈاک قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے ناشر سلطان رشک طابع شکیل انجم مطبع نارنگ پرنٹرز راولپنڈی

—— سلطان رشک

مطلع

عصری ادب کیا ہے ؟ کیا تقسیم سے قبل جو ادب لکھا جارہا تھا ہمارے آج کے ادیب اُسے اون کرتے ہیں اور کیا وہ ہماری تہذیبی ضروریات اور چاہئے معیار پر پورا اُترتا ہے یہ چند سوالات آج کل موضوعِ گفتگو ہیں ہمارے خیال میں زندہ ادب ، توانا ادب زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب عصری ادب ہوتا ہے اسے صدیوں اور دہائیوں کی قید سے آزاد رہنا ہوتا ہے۔ حقیقی ادب کی طرح عصری ادب بھی زندگی سے اور مسائلِ زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور وہ ادب جو کسی خاص جذباتی لمحے یا بحران کی پیداوار ہو وہ بحران کی شدت اور طوفان کی تیزی کے ساتھ ہی دریا بُرد ہو جاتا ہے اس کا حقیقی عصری ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ سچا ، جرأت مند ، زندگی آفریں اور خیال افروز ادب حقیقی عصری ادب ہے جو انتہائی اخلاص اور دردمندی سے پیدا ہوتا ہے جو انسان دوستی ، وطن دوستی ، امن اور تعمیرِ ذہن جیسے بڑے جذبوں سے مملو ہوتا ہے جس کا کام عقائد اور نظریات میں پختگی پیدا کرنا اور قبلہ کی سمت کو راست رکھنا ، سرمایہ ، سررزم اور سرمایہ داریت کی ترویج کرنا ، مسائل کی نشاندہی کرنا ہوتا ہے۔ ایسا ادب پیدا کرنے والا ادیب اقتدار اور ہر طرح کے طمع سے بے نیاز اپنا فریضہ سرانجام دیتا ہے اور یہیں سے عظیم ادب کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

اس شمارے کے مندرجات کے بارے میں حقیقی رائے تو ہمارے معزز قارئین ہی دے سکیں گے مگر ہم اشارتاً چند باتیں عرض کرتے ہیں۔ ہمیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس مرتبہ ہماری درخواست پر جمیل الدین عالی صاحب نے "اُردو غزل" پر ایک یادگار اور پُر مغز مقالہ عنایت فرمایا اور شفیق الرحمٰن صاحب نے ایک خوبصورت افسانہ عطا کیا جس کی شرکت سے تقسیم سے پہلے والے افسانہ نگار شفیق الرحمٰن سے ملاقات ہو گئی جس کے لئے ہم آن کے ممنون ہیں۔

مقالات و مضامین کے گوشے میں مشاہیر اہلِ قلم کے فکر انگیز رشحاتِ قلم شامل ہیں طنز و مزاح کا حصہ آپ کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ شاعری میں نامور شعراء کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کو بھی پوری طرح نمائندگی دی گئی ہے۔ "فن اور شخصیت" کے عنوان سے عزیز احمد ، ابن الحسن ، صمد انصاری اور مظفر رزمی کے فکر و فن کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ قارئین! ماہنامہ "فن اور شخصیت" بمبئی نے ممتاز شاعر قتیل شفائی پر ایک بھرپور مبسوط اور یادگار نمبر شائع کیا ہے جس کا تفصیلی تجزیہ بھی اس شمارے کی زینت ہے۔

ادارہ "نیرنگِ خیال" نے امسال جون میں سالنامہ ، اور اب اکتوبر میں یہ اشاعتِ خصوصی پیش کی ہے۔ ہمارا ارادہ دسمبر ۸۱ء میں پھر خاص نمبر شائع کرنے کا ہے ہمیں امید ہے ہمارے معزز قلمکار ہمیں اپنی محبتوں سے نوازتے رہیں گے اور جن قابلِ صد احترام ادیبوں ، دانشوروں اور شاعروں نے اس نمبر کو اپنی انتہائی گرانمایہ تحریروں سے نوازا ہے ہم ان کے دل کی گہرائیوں سے ممنون ہیں۔

قارئینِ گرامی : ہمیں آپ کی گراں قدر اور بے لاگ رائے کا انتظار رہے گا جو ہماری تمام سعی و کاوش کا حاصل اور سرمایہ ہوگی۔

محسن احسان

نعت

یہی کمائی مری عمرِ برقِ پا کی ہے
خُدا کے بعد محمدؐ ہی کی ثنا کی ہے

ہے یادِ پاک سے روشن مرا مدینۂ دل
اِس آئینے میں چمک عکسِ خوشنما کی ہے

خدا مجھے بھی دکھائے کبھی جمالِ حرم
کہ میرے دِل میں تڑپ شہرِ مصطفٰےؐ کی ہے

ہر اِک نفس ہے مُعطر گلاب کی صورت
مہک ہواؤں میں بادِ گرہ کشا کی ہے

یہ افتخار مجھے ہے کہ سب رسولوں میں
مرے رسولؐ نے سب کیلئے دعا کی ہے

مرے کلام میں تاثیر اُس کے فیض سے ہے
کہ جس نے درد کی دولت مجھے عطا کی ہے

حسن طاہر

نعت

وہ جس کا ذکر باعثِ تسکینِ جاں ہوا
اُس سا کوئی زمانے میں پیدا کہاں ہوا

اس گنبدِ فلک کے درو بام گونج اُٹھے
کیا اِسم تھا کہ خلق کے وردِ زباں ہوا

گرہوں نے راہ نہ دی جب تو خود بخود
میری زباں پہ اسمِ محمدؐ رواں ہوا

ہے فیض یاب ہر کہ و مہ ترے فیض سے
دُنیا میں تیرے فیض کا سِکہ رواں ہوا

قائم ہے یہ جہاں ترے خلقِ عظیم سے
تیرا ہی نام وجہِ قرارِ جہاں ہوا

حرفِ اُلوہیت تھا مگر عرش پر رقم
قرآں تو جب بنا کہ وہ تیری زباں ہوا

ہیں عرش و فرش زمزمہ خواں تیری نعت میں
مجھ سا گناہ گار بھی رطب اللساں ہوا

قتیل شفائی

دعا

کھلا کھلا ہو یہ جہاں ، دُھلا دُھلا سماج ہو
تری زمیں پہ اے خدا ، محبتوں کا راج ہو

ہری بھری یہ وادیاں ، بنی ہوں شاہزادیاں
بچھے بہار پاؤں میں ، گلوں کا سر پہ تاج ہو

کسی وطن میں بھوک کا ، رہے نہ کوئی مسئلہ
نگر، نگر، ڈگر ڈگر ، اناج ہی اناج ہو

رکھیں نہ دل میں بیر ہم ، سبھی کی چاہیں خیر ہم
سبھی کی ایک آن ہو ، سبھی کی ایک لاج ہو

وہ دے جواب اس طرح ، کھلے گلاب جس طرح
مخاطب اپنے پیار کا ، بہت ہی خوش مزاج ہو

سمندروں کی وسعتیں ، دلوں میں ہم اُتار لیں
جو کل تلک نہ ہو سکا ، وہ نیک کام آج ہو

مفضل حق

غمِ حبیبؐ

کہتے ہیں جب تبوک حبیبِ خدا چلے   لشکر جلو میں صورتِ سیلِ وفا چلے
یثرب کے شہسوارِ نبوت کے جاں نثار   چلتے تھے یوں کہ دشت میں جیسے ہوا چلے
ہر اک کی آرزو تھی کہ اس جستجوِ گام میں   گر ہو سکے تو ہمرہِ خیرالوریٰ چلے
قائد کی بھی نگاہ تھی ہر رہ سپار پر   وہ سست گام ہو کر مثالِ صدا چلے
میرِ سفر ہوں سرورِ کون و مکاں جہاں   جائز ہے رہگذار بھی گر برق پا چلے
ایسے میں ایک راہ رو گُم اپنی ذات میں
آتا تھا جیسے دور کا مہتاب رات میں
آقائے دو جہاں نے عناں کھینچ کر کہا   بوذرؓ ہمارے ساتھ تھے آتے نہیں نظر
ڈھونڈیں انہیں کہ اس سفرِ جاں گداز میں   وہ خستہ جاں نہیں ہے تو سونی ہے رہگذر
ہائے وہ خوش نصیب کہ ڈھونڈیں جسے نبیؐ   واللہ وہ کم خرام کہ ہو حاصلِ سفر
کی عرض، راہیانِ وفا نے بصد ادب   وہ اشترِ نحیف پہ آتے ہیں بے خبر
سستی ہے راہوار کی غفار کی نہیں   اب آ رہے ہیں موجِ تمنا کے دوش پر
بولے رسولؐ میری دعا ہے کرم کرے   بوذرؓ پہ ربِ عرش، خداوندِ بحر و بر
تنہا جئیں گے اور بوقتِ وصال بھی   تنہائیوں کی گود میں ہوگی انہیں سحر
تنہا اُٹھیں گے حشر کے شور و فغاں میں یہ   اُن پر نہ کر سکے گی قیامت بھی کچھ اثر
سچ ہے غمِ حبیب ہو جس کی نظر کا نور
اس کے لئے فلک بھی دھواں اور زمیں بھی دور

میر قمرالدین منتؔ

رنگِ تصوّف

از مئے عشقِ تو مستم تننا ہو یا ہو — جامِ پندار شکستم تننا ہو یا ہو

باز دل رفت زِ دستم تننا ہو یا ہو — سرِ راہِ تو نشستم تننا ہو یا ہو

طرفے از ہوش بہ بستم تننا ہو یا ہو — مستِ صہبائے الستم تننا ہو یا ہو

نیست گنجائشِ ادراک بہ جائے کہ منم — بر تر از وہمِ تو ہستم تننا ہو یا ہو

خرقۂ زہد گرو کردہ قدح می نوشم — مفلسِ بادہ پرستم تننا ہو یا ہو

منتؔ رند و خرابم، خبرم نیست ز غیر
مستِ او گشتم و رستم تننا ہو یا ہو

احمد شجاع پاشا

جنگِ آزادی، طویل نظم

کہتے ہیں زبان سے جو بات نکلتی ہے وہ ماحول میں معلق رہتی ہے ۔ مکمل طور پر فنا نہیں ہوتی ۔ جس صورت اور جس انداز سے ادا کی گئی ہو اسی صورت اور اسی انداز سے زندہ و پائندہ رہتی ہے ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آغازِ آفرینش سے لے کر آج تک جو کچھ بھی کہا گیا ، جہاں بھی کہا گیا اسی ماحول میں موجود ہے ۔ وہ سنسنی کی آواز ہو یا دف کی نے کی ، گیت ہو یا نوحہ ، راز کی بات ہو جو تنہائی میں کی گئی ہو یا کوئی ایسی بات جو سب کے سامنے کی گئی ، کل کی گئی ہو یا ہزار سال قبل اسی طرح زندہ ہے ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سائنسداں ان آوازوں کو جو صدیوں سے ماحول میں آویزاں ہیں جن پہ وقت کی گرد تو ضرور ہے مگر جو بعینہٖ اسی طرح موجود ہیں جس طرح ادا کی گئی ۔ ریکارڈ کرنے کی مساعی میں مصروف ہوں اور ممکن ہے وہ وقت بھی آجائے جب ہم یا ہمارے بعد آنے والی نسلیں اپنے اسلاف کی آوازوں کو اپنے کانوں سے سن سکیں ۔ پاکستان کی جنگِ آزادی سے متعلق اس نظم کا پس منظر بھی کچھ ایسا ہی ہے

یہ ۲۰۵۰ء کی بات ہے ۔ ۲۰۵۰ء ۔ ایک پاکستانی سائنسدان ماحول کی آوازوں کو ریکارڈ کرنے میں مصروف ہے ۔ اس نے پاکستان کی تاریخ کا مطالعہ تو کیا ہے اسے یہ معلوم ہے کہ پاکستان کا قیام کس طرح عمل میں آیا پاکستان کیسے بنا ۔ پاکستان بنانے والوں کو کن مراحل سے گزرنا پڑا ۔ کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ۔ اس کے ذہن میں اس عمل کی اک تصویر موجود ہے ۔ مگر وہ اپنے کانوں سے وہ آوازیں سننا چاہتا ہے جن کے متعلق اس نے صرف کتابوں میں پڑھا ہے ۔ وہ ایک مشین کی سوئیاں گھمائے جا رہا ہے ۔ سپیکر سے مختلف قسم کی آوازیں آرہی ہیں ، سوئی ڈائل پہ ایک جگہ لمحہ بھر کے لئے تھرتھراتی ہے ۔ پھر ایک آواز آتی ہے ۔ سائنسدان کا ہاتھ رک جاتا ہے ۔ آواز پھر آتی ہے ۔ سائنسدان معمولی ایڈجسٹمنٹ کرتا ہے ۔ آواز مدھم ہے ۔ ٹھیک سے سمجھ نہیں آتی ۔ پھر بلند اور واضح ہو جاتی ہے ۔ سائنسداں سنتا ہے اور ریکارڈنگ کے آلات کو مشین کے ساتھ منسلک کر کے خود

خاموشی سے بیٹھ جاتا ہے۔ آوازیں ماحول میں گونجتی ہیں

پہلا منظر

ایک آواز: ہم خوابِ گراں سے جاگ اُٹھے ہم سوزِ نہاں سے جاگ اُٹھے

دوسری آواز: وہ ظلمتِ غم اب ختم ہوئی گلنار سویرا آ پہنچا
دنیا کی حدوں سے دور کہیں ذلت کا اندھیرا جا پہنچا

بہت سی آوازیں: ہم جاگ اُٹھے بیدار ہوئے
مرنے کے لئے تیار ہوئے
اب رکنے کا طوفان نہیں
اب جھکنے کا انسان نہیں
یہ ظلم و ستم اب اور نہیں
اب رنج و الم کا دور نہیں

پہلی آواز: وہ نور کے چشمے پھوٹ بہے مشرق کا اندھیرا دور ہوا
مشرق کا اندھیرا دور ہوا۔ سنسان جہاں پُرنور ہوا

بہت سی آوازیں: ہم خوابِ گراں سے جاگ اُٹھے ہم سوزِ نہاں سے جاگ اُٹھے
پھر نیند سے وہ شکتی اُٹھے پھر خواب سے باغی راگ اُٹھے
آہن کی سلاسل ٹوٹ گئیں بیباک جوانی رُک نہ سکی
طوفان بڑھے ساحل کی طرف دریا کی روانی رُک نہ سکی
تسکینِ دلِ مجروح کے لئے وہ مہوشوں کے گیت گئے
جب ہمتِ دلِ زندانی مغموم تھی اب وہ زمانے بیت گئے
اب چاند پہ شعلوں ماریں گے
اب تاروں سے ٹکرائیں گے
ہم دنیا پہ چھا جائیں گے
ہم خوابِ گراں سے جاگ اُٹھے
ہم سوزِ نہاں سے جاگ اُٹھے

آواز خاموش ہو جاتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے لوگ رقص کر رہے ہوں ۔ جیسے ان پر اک جنون سا طاری ہو۔ کچھ دیر یہ کیفیت رہتی ہے ۔ پھر موٹروں کی آواز ماحول میں گونجتی ہے جیسے بہت سی موٹریں اس مقام پر آ گئی ہوں جہاں لوگ رقص و سرود میں معروف تھے۔ موٹروں کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آتی ہیں ۔ قدموں کی چاپ ۔۔۔ گڑبڑ ۔۔۔ پھر ایک آواز آتی ہے

ایک بچے کی آواز:۔ ہشیار سپاہی آ پہنچے
ہشیار سپاہی آ بھی گئے

ایک آواز:۔ وہ مکر و ریا کے متوالے وہ پیٹ پجاری آ پہنچے
بندوق لئے تلوار لئے عزت کے بھکاری آ پہنچے

ایک نسوانی آواز آنے دو انہیں آنے دو انہیں
اور تیغ و سناں لانے دو انہیں
مرنے کے لئے تیار ہیں ہم
اس جینے سے بیزار ہیں ہم
کمزور یہ مشت خاک نہیں
ہم لے کے رہیں گے پاک زمیں

لاتعداد آوازیں ہم لے کے رہیں گے پاکستان
ہم لے کے رہیں گے پاکستان
بن کے رہے گا پاکستان
دینا پڑے گا پاکستان
پاکستان ——— زندہ باد
پاکستان ——— زندہ باد ——— زندہ باد پاکستان
یہ جان سے ہم کو پیارا ہے
ہم لے کے رہیں گے پاکستان
ہم لے کے رہیں گے پاک زمیں
کمزور یہ مشت خاک نہیں

قدموں کی چاپ جیسے سپاہی اپنی پوزیشنیں سنبھال رہے ہوں۔ پولیس کی سیٹیاں ۔ شور اور پھر اک دم

خاموشی - مرگ آسا سکوت - سناٹا۔

پولیس:۔ خاموش رہو ۔ خاموش رہو
سرکار کا ہے یہ حکم سنو
چپ چاپ یہاں سے ہٹ جاؤ

ایک نسوانی آواز:۔ ہم دھول نہیں جو چھٹ جائیں
خاشاک نہیں جو ہٹ جائیں
ہم لے کے رہیں گے پاکستان

بہت سی آوازیں:۔ پاکستان ——— پاکستان ——— زندہ باد پاکستان

فرنگی پولیس:۔ گر یونہی رہا یہ ہنگامہ تم نے جو یونہی اصرار کیا
یوں زیست سے گر بیزار رہے یوں موت سے تم نے پیار کیا
تم جان لو ہم خوں پی لیں گے، ہم سینے چھلنی کر دیں گے
ہم آج تمہاری لاشوں سے دھرتی کی جھولی بھر دیں گے

ایک آواز:۔ کچھ فکر نہیں - کیا خوف ہمیں ہم آج تو مرنے آئے ہیں
تدفین کی کچھ تدبیر کرو۔ ہم ساتھ کفن بھی لائے ہیں

فرنگی پولیس:۔ اِک لفظ زباں سے نکلے گا تم سب کو قضا آ جائے گی
اور موت کی دیوی اپنا علم ان گلیوں پر لہرائے گی

پہلی آواز:۔ ہم موت سے ڈرنے والے نہیں بے موت بھی مرنے والے نہیں
ہم لے کے رہیں گے پاکستان

فرنگی پولیس:۔ گستاخ ہو تم بیباک ہو تم انساں ہو مگر ناپاک ہو تم

فرنگی افسر کی آواز:۔ خاموش کھڑے کیا دیکھتے ہو
بندوق اٹھا کر فیر کرو

نسوانی آواز:۔ ہشیار رہو جانبازو تم میداں سے اب اکھڑیں نہ قدم
اونچا ہی رہے یہ سبز علم
کیا موت کا ڈر کیا موت کا غم
اب جاگ اٹھے ہیں خواب سے ہم

میدان سے اب اکھڑیں نہ قدم

بہت سی آوازیں　　میدان سے اب اکھڑیں نہ قدم
اونچا ہی رہے یہ سبز علم
ہم سوزِ نہاں سے جاگ اُٹھے
ہم خوابِ گراں سے جاگ اُٹھے
وہ ظلمتِ غم اب ختم ہوئی گلنار سویرا آ پہنچا
دنیا کی حدوں سے دور کہیں ذلت کا اندھیرا جا پہنچا
آہن کی سلاسل ٹوٹ گئیں
ادبار کی نبضیں چھوٹ گئیں

گولیاں چلنے کی آواز ـــــ بھگدڑ ـ چیخیں ـــــ شور ـــــ

ایک نسوانی آواز　　میاں سے ابھی تم بھاگ چلے
بزدل نہ بنو ـ بزدل نہ بنو
میداں میں رہو اور جم کے لڑو

ایک چیخ ـــــ کسی کے گرنے کی آواز

ایک آواز　　یہ کون گرا اک جورِ جہاں
یہ خون میں لتھڑا جسمِ جواں
ہم اور یہ ظلم ـ ہم اور یہاں
ہم آج تو مرنے آئے تھے
ہم ساتھ کفن بھی لائے تھے
مردانِ وفا طوفان بنو
ہاں آج دلیر انسان بنو
کیوں حوصلۂ دل پست ہوا اصرار کا تو یہ طور نہیں
یہ ظلم و جفا یہ جور و ستم ـ اب اور نہیں اب اور نہیں
افرنگ کے عدمت کا رو تم اب اور نئی تدبیر کرو
اس آگ سے ہم مرنے کے نہیں سامانِ دار و گیر کرو

اب اونچا رہے گا سبز علم
میداں سے نہیں اکھڑیں گے قدم
ہم لے کے رہیں گے پاکستان
لے کے رہیں گے — لے کے رہیں گے۔ لے کے رہیں گے

آواز مدہم ہو جاتی ہے۔ پھر یوں خاموش ہو جاتی ہے جیسے کھو گئی ہو۔ کچھ دیر خاموشی — پھر ماحول میں نغمے گونجتے ہیں۔ بہت سی آوازیں آتی ہیں جیسے شہر کا شہر مسرت سے دیوانہ ہوا جا رہا ہو، رقص کر رہا ہو گا رہا ہو

بہت سی آوازیں ہم خوابِ گراں سے جاگ اُٹھے ہم سوزِ نہاں سے جاگ اُٹھے
ماحول کی ظلمت دور ہوئی
گلشن کی فضا پُر نور ہوئی
طوفان اٹھا آزادی کا سب قفل پرانے ٹوٹ گئے
زنداں کی بڑی دیوار گری آلام کے بندی چھوٹ گئے
وہ دور گیا۔ وہ بات گئی۔ مشرق کا سویرا جاگ اُٹھا
دولت کے سرہانے سے آخر مغرب کا فرنگی ناگ اُٹھا
پھر فکر و عمل آزاد ہوئے
ویران چمن آباد ہوئے
یہ دیس بنا انساں کے لئے فردوس سے بھی کم کیا ہو گا
صد شکر کہ اک غم ختم ہوا اب اور کوئی غم کیا ہو گا

دوسرا منظر

آواز مدہم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے۔ مکمل خاموشی چھا جاتی ہے۔ فضا کچھ دیر خاموش رہتی ہے طوفان کی آمد سے پہلے کی خموشی۔ پھر اچانک خموشی کا طلسم ٹوٹتا ہے۔ فضا میں چیخیں گونجتی ہیں عورتوں اور بچوں کی چیخیں۔ مرے آبا۔ مری امی۔ ہائے میرا بچہ۔ میرے سرتاج خون — خون — خون — ہائے مری جوان لڑکی۔ رحم رحم۔ اے پروردگارِ عالم رحم۔ اور ان چیخوں اور نالوں کے ساتھ ساتھ شور۔ گولیاں چلنے کی آوازیں۔ مشین گنوں کی ٹھز ٹھز

پھر خاموشی ———

قدموں کی چاپ ۔ بارش ۔ جنگل کے درختوں کی سائیں سائیں ۔ چیختی چنگھاڑتی تیز ہوا ، جیسے
دو ساتھی کسی ویرانے میں چپ چاپ جا رہے ہوں۔

ایک آواز :۔ اے دیدۂ گریاں کیا ہوگا اے حالِ پریشاں کیا ہوگا
تعمیرِ گلستاں کب ہوگی ۔ دستورِ گلستاں کب ہوگا

دوسری آواز وہ شاخِ نشیمن ٹوٹ گئی تخریبِ گلستاں ہو بھی چکی
تقدیرِ غزلخواں ہو بھی چکی تدبیرِ پریشاں ہو بھی چکی
تم اپنے جہاں کی فکر کرو
آفاتِ نہاں کا ذکر کرو

پہلی آواز کیا رات ابھی باقی تو نہیں ہر سمت اندھیرا ہے کیسا
اے دوست سحر یہ کیسی ہے تاریک سویرا ہے کیسا
کیا نورِ سحر کا حشر ہوا
کیا فتح و ظفر کا حشر ہوا
کیوں مہرِ درخشاں کی کرنیں اے دوست ابھی آزاد نہیں
بے نور ضیا ہے گریہ کناں کیوں بزمِ طرب آباد نہیں
تاریک فضائیں کیسی ہیں سنتا ہوں سحر تو ہو بھی چکی
سنتا ہوں مری فریادِ زبوں پابندِ اثر تو ہو بھی چکی
پھر صحنِ چمن گلنار ہے کیوں چہروں پہ گلوں کے خون ہے کیا
افسانۂ ماضی ختم ہوا یہ آج نیا مضمون ہے کیا
پھر اہلِ چمن صیاد کی آہٹ پائے ہوئے سہمے بیٹھے ہیں
خاموش سبھی اک گوشے میں گھبرائے ہوئے سہمے بیٹھے ہیں
اے دوست بتا کیا بات ہوئی
کب دن گزرا کب رات ہوئی

دوسری آواز ۔ انسان کہاں آزاد ہوئے خونخوار درندے چھوٹ گئے
سڑکوں پہ ہمارا خون بہا ہم لوٹ گئے دل ٹوٹ گئے
طوفان کا اتنا زور بڑھا اس ناؤ کے لنگر رہ نہ سکے
[illegible]

تاریخِ جہاں چنگیز کے سب دلدوز فسانے بھول گئی
وہ سرخ زمانے بھول گئی
پھر حسنِ جواں کا خون ہوا معصوم امیدیں خاک ہوئیں
پھر ہاتھ بڑھے جسموں کی طرف رنگین قبائیں چاک ہوئیں
سورج بھی چڑھا اور شب بھی رہی تاریک سویرا آ پہنچا
محبوس اندھیرا ختم ہوا ـــــ آزاد اندھیرا آ پہنچا
کچھ بھی نہ رہا برباد ہوئے
یوں قید سے ہم آزاد ہوئے

ـــــ خاموشی ـــــ گہری اتھاہ خاموشی۔ ایسی خاموشی جس سے ہول آئے۔ پھر آوازیں بہت سی آوازیں۔ بہت دور سے آنے والی آوازیں جو آہستہ آہستہ قریب آ جاتی ہیں۔ واضح، غیر مبہم آوازیں غمگین ہونے کے باوجود مترنم ہیں۔ پُرسوز ہونے کے باوجود پُر امید ہیں جیسے سامنے کوئی بہت ہی خوبصورت چیز نظر آ رہی ہو۔ کوئی ایسی چیز جسے دیکھ کے دل کو ٹھنڈک پہنچے۔ ذہن کو سکون نصیب ہو۔ آوازیں۔ پُر امید۔ پُر عزم

ایک آواز:۔ زنداں سے چھٹے آزاد ہوئے
کیا فکر جو ہم برباد ہوئے

بہت سی آوازیں:۔ ویراں ہے چمن ویران سہی
سنسان ہے دل سنسان سہی
امید کا ماتم کیا کیجئے
لٹ جانے کا اب غم کیا کیجئے

ایک کمزور آواز:۔ کیا فکر جو دلی چھوٹ گئی
کیا غم ہے جو آشا ٹوٹ گئی

دوسری کمزور آواز:۔ اب دل کو غمِ پنجاب نہیں
اب سامنے ہے اک اور زمیں

بہت سی آوازیں:۔ وہ جس کے گلوں کا بھیس نیا
وہ پاک زمیں وہ پاک وطن

شاداب جہاں شاداب چمن
اے خانہ بدوشو آؤ چلیں
وہ دیس نیا آباد کریں
زنداں سے چھٹے آزاد ہوئے
کیا فکر جو ہم برباد ہوئے
آہن کی سلاسل ٹوٹ گئیں
اوبار کی نبضیں چھوٹ گئیں
لو ظلمتِ غم اب ختم ہوئی گلنار سویرا آ پہنچا
دنیا کی حدوں سے دور کہیں ذلت کا اندھیرا جا پہنچا
صد شکر گلستاں مل تو گیا تعمیرِ گلستاں کر لیں گے
برباد سہی ۔ ویراں سہی ۔ تزئینِ چمن کے ساماں کر لیں گے

ساز — موسیقی — رقص — خاموشی — اور پھر ایک آواز — لے بدلتی ہے
سر مختلف — پر اعتماد —

تیسرا منظر

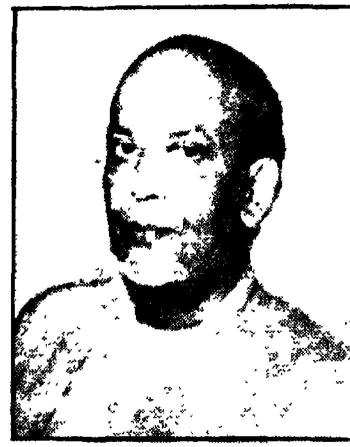
پھر نورِ سحر جاگا پھر بندِ قفس ٹوٹے — ظلمت کی اسیری سے پھر اہلِ چمن چھوٹے
پھر محفلِ گلشن سے نغموں کی صدا آئی — پھر موسمِ گل آیا پھر ہنستے ہیں گل بوٹے
مشرق سے اٹھا ایسا طوفان اجالوں کا — مقہور اندھیروں کے سب رنگ پڑے جھوٹے
برسوں ہی رہے قابض صیاد گلستاں پر — برسوں ہی اندھیروں نے انوار کے گھر لوٹے
پھر اپنوں کے چہروں پر اک نور سا لہرایا
اغیار کے دل چھوٹے اوبار کے دل ٹوٹے

ڈھول تاشے اور رقص کے ساتھ گیت
بہت سی آوازیں ۔

گجر بجا گجر بجا سحر ہوئی سحر ہوئی
طلوعِ آفتاب سے وہ رات مختصر ہوئی
وہ جن کے سائے میں وطن کی زندگی بسر ہوئی
وہ ظلمتِ غمِ حیات عازمِ سفر ہوئی

فضا پہ نور چھا گیا
قریب و دور چھا گیا
سحر کے لشکری لئے
جلو میں روشنی لئے
زمیں پہ جھومتا ہوا
فلک کو چومتا ہوا
وہ آفتاب آ گیا
وہ انقلاب آ گیا
وہ رات مختصر ہوئی وہ انقلاب آ گیا
سحر ہوئی سحر ہوئی وہ آفتاب آ گیا
گلوں کو پیرہن ملا
فضا کو بانکپن ملا
چمن ہے پھر چمن وہی
گلوں کی انجمن وہی
سکوں کے گیت بھی وہی
فسوں کی ریت بھی وہی
جمالِ دلبراں وہی
مزاجِ عاشقاں وہی
ہوئی ہے رات مختصر
اٹھی ہے جھومتی سحر
وہ رات مختصر ہوئی ۔ وہ انقلاب آگیا
سحر ہوئی سحر ہوئی وہ آفتاب آگیا

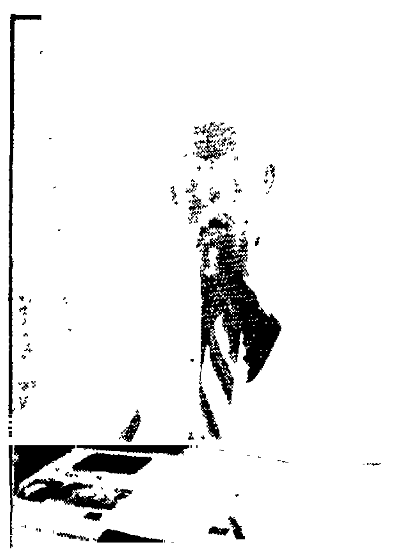
سوئی ڈائل پہ پھر سحر ٹھہرائی - ان آوازوں کے ساتھ اور بھی بہت سی آوازیں کمرے کی فضا میں گونجنے لگیں کچھ واضح اور کچھ مبہم - کچھ بلند - کچھ دھیمی - کچھ پر اعتماد - کچھ شکایت آمیز - ریکارڈ کرنے والا کیسٹ ختم ہوا - آوازیں پھر بھی گونج رہی تھیں - اور سائنسدان نیا کیسٹ ڈھونڈ رہا تھا - سحر کے بعد کی آوازوں کو



محمد ابن الحسن



شفیق الرحمٰن



میجر جنرل ڈاکٹر محمود الحسن



پرتو روہیلہ



جمیل الدین عالی



سلیم احمد



قتیل شفائی



احمد شجاع پاشا



جیلانی کامران



فتح محمد ملک



جمیل یوسف



مجیب الرحمٰن



کرنل غلام سرور


بشریٰ رحمٰن


پروین فناسید


پروین شاکر


ممتاز میرزا


عذرا وحید


شمشاد نازلی

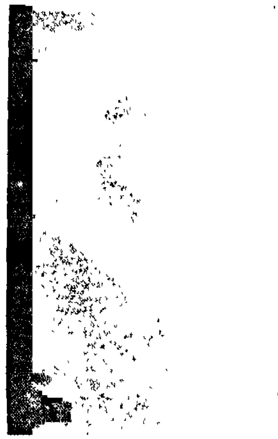

منیرؔ جہاں


حسین بانو


نسیم نازش



ڈاکٹر انور سدید



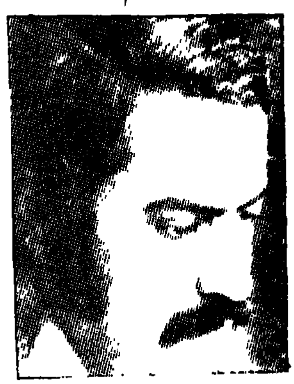
پروفیسر شمیم احمد



میاں غلام قادر



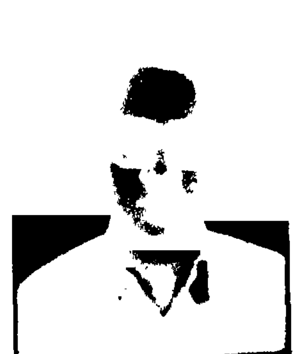
اظہر جاوید



منظر الاسلام



محمد منشا یاد



احمد رئیس



احمد شریف



منظفر حسین رزمی



سید ضمیر جعفری



ڈاکٹر وزیر آغا



سراج منیر



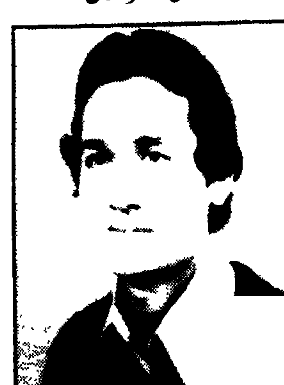
حسن اختر جلیل



سلیم اختر



مرزا حامد بیگ



سجاد بخاری



جاوید اقبال ناصر



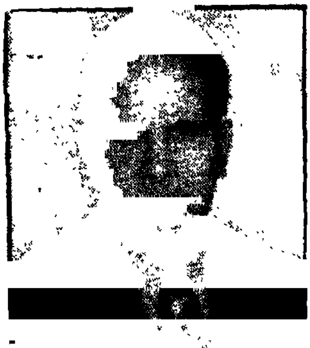
حسن عباس رضا



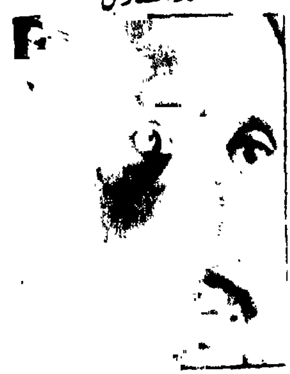
محمد انصاری



سید عطاء حسین کلیم



ش۔م۔ اعظم



رشید امجد



منصور قیصر



امیرالاسلام ہاشمی



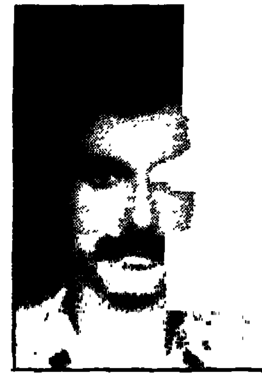
بشارت علی سید



قمر رعینی



وزیر پانی پتی



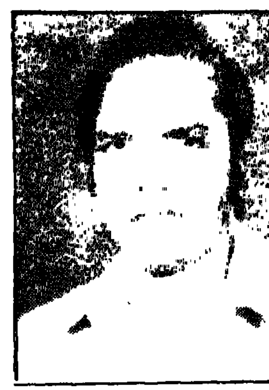
شوکت ہاشمی



عبد الرحمن ریاض خوارزمی



نجمی صدیقی



منظر امکانی



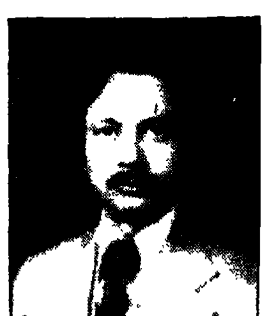
سید عارف



عبدالوحید



سحر صدیقی



خاور اعجاز

امجد ایوب



انبالہ :۔ سلطان رشک، رفعت سلطان اور کے ایل پوسوال (صدر مشاعرہ)



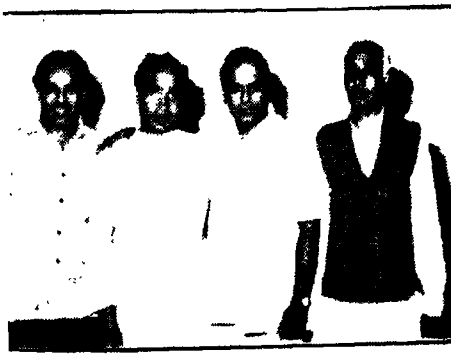
دہلی :۔ سید ضمیر جعفری، قتیل شفائی، اور کنور مہندر سنگھ بیدی



اسلام آباد :۔ (نمایاں) قتیل شفائی اور جوش ملیح آبادی



بمبئی :۔ (نمایاں) قتیل شفائی اور اٹل بہاری باجپائی



راولپنڈی :۔ اختر ہوشیارپوری، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، منصور قیصر اور سلطان



راولپنڈی :۔ عبدالوحید، سلطان رشک، فیصل سلطان، مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، احمد جاوید، جلیل عالی اور خالد اقبال یاسر

مقالات و مضامین

ڈاکٹر وزیر آغا

اردو ادب میں فنِ مزاح نگاری

ہندوستان پر اسلامی تہذیب کے اثرات زیادہ تر ایرانیوں کے ذریعے پہنچے اور اس لئے ہندی مسلمانوں کے ہاں ایک طویل عرصہ تک ظرافت کا وہی انداز رائج رہا جس کا ایران میں سب سے بڑا علم بردار عبید زاکانی تھا۔ مثلاً مغل دورِ حکومت کے دو اہم ظریفوں یعنی ملا دو پیازہ اور جعفر زٹلی کی ظرافت عجمی اسلامی روایت ہی کا ثمر تھی۔ ان میں سے ملا دو پیازہ نے ذہن کی چمک دمک، نیز معمے کو مزاحیہ انداز میں حل کرنے کی خداداد قابلیت کے طفیل دربار میں مقبولیت حاصل کی اور جعفر زٹلی نے ہجو کے اس انداز کو اپنایا جو تیموری مغل فرمانرواؤں کو بہت عزیز تھا اور جسے ایرانی بادشاہوں اور امیروں کے ہاں فروغ ملا تھا۔ ویسے یہ امر دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے کہ مغل سلطنت کے ابتدائی دور میں جب اس کا آفتابِ اقبال نصف النہار پر تھا تو ظرافت کے اس رنگ کو فروغ ملا جو بذلہ سنجی اور نکتہ آفرینی کی اساس پر استوار تھا۔ مثلاً ملا دو پیازہ کی ظرافت! جب کہ مغل سلطنت کے دورِ زوال میں جب قدریں رو بہ انحطاط تھیں اور شکست و ریخت معاشرے کے تمام طبقوں پر طاری تھی تو جعفر زٹلی کی ظرافت کو مقبولیت حاصل ہوئی جس کی اساس ہزل، فحاشی اور پست درجے کی ہجو گوئی پر استوار تھی۔ جعفر زٹلی کو فرخ سیر نے قتل تو کرا دیا مگر اس سے ہجو گوئی کی روایت ختم نہ ہوئی۔ چنانچہ جب اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں سودا نے مرزا فاخر مکیں، میر ضاحک اور بقا کی مٹی پلید کی یا بقا اللہ بقا نے میر و میرزا کی ہجو میں لکھیں یا پھر انشا اور مصحفی اور ان کے ہم عصر شعرا نے ایک دوسرے کو ہجو کا نشانہ بنایا تو یہ سارا رجحان دراصل اسی روایت ہی کا حصہ تھا جو ایران کے دورِ انحطاط میں فروغ پذیر ہوئی تھی اور جو مغل سلطنت کے دورِ زوال میں ایک بار پھر مقبول ہو گئی۔

عجمی اسلامی اثرات نے تو درباری ظرافت کو فروغ دیا اور غزل میں زاہد یا ملا سے چھیڑ چھاڑ کی روش کو ابھارا مگر ہندی مسلمانوں کے ہاں ہندوستانی معاشرے کی ناہمواریاں ابھی نظر کی گرفت میں آئیں اور یوں مذاق کا نشانہ بنیں۔ اس سلسلہ میں دو مزاحیہ کردار بطور خاص بہت مقبول ہوئے۔ شیخ چلی اور خوجی! ان میں سے شیخ چلی کا کردار تو معاشرے کے اجتماعی ذہن کی پیداوار تھا اور اس لئے ہم نہ تو اس کے خالق کے نام سے واقف ہیں اور نہ اس کے شجرۂ نسب

ہے۔ اس کردار کے ذریعے ہندی مسلمانوں نے نہ صرف سادہ لوحی، حماقت اور بیکاری کا مذاق اڑایا۔ بلکہ خواب پرستی کی تخیل کی پرواز کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا کر ایک پرلطف صورت واقعہ بھی پیدا کر دی۔ شیخ چلی جب پاؤں کی ٹھوکر سے چینی کے سارے برتن توڑ دیتا ہے تو وہ اصل اپنے خوابوں ہی کو چکنا چور کرتا ہے۔ ہندوستان کے اجتماعی ذہن نے شیخ چلی کے ذریعے "شوق کی بلندی اور ہمتوں کی پستی" کا احساس دلا کر ہندوستانی معاشرے کی ناکردگی اور اضمحلال کو اجاگر کیا اور یہ بات درباری ظرافت کی مروجہ روش سے بالکل الگ تھی۔

دوسرا کردار سرشار کا خوجی ہے جس کے ہاں لاف زنی، کم ہمتی اور خواب پرستی، ناکردگی، انفعالیت اور حماقت ایک نقطہ پر مرکز دکھائی دیتی ہیں۔ یہ کردار اردو ادب پر مغربی اثرات کا بھی غماز ہے بلکہ ڈان کہوٹے کا ہندوستانی روپ نظر آتا ہے۔ تاہم اس کردار کی وساطت سے ایک مٹتے ہوئے معاشرتی نظام کی ناہمواریاں منظر عام پر آگئیں اور ان پر ہنسنے کی ترغیب ملی۔ گویا اب طنز کا نشانہ فرد نہ رہا (جیسا کہ درباری ظرافت میں تھا) بلکہ پورا معاشرہ اور اس کے رجحانات اس کی زد میں آئے جس کا مطلب یہ ہے کہ انیسویں صدی تک آتے آتے ہندوستانی مسلمان بحیثیت قوم وجود میں آگئے تھے اور اب وہ لاف زنی، انفعالیت (جس کی مظہر ریختی بھی تھی) اور شیخ چلی پن کو مذاق کا نشانہ بنانے کے قابل ہو گئے تھے اس کے بعد اردو ادب میں جو ظرافت ابھری اس پر اسلوب اور مواد ہر دو اعتبار سے مغربی ظرافت کے گہرے اثرات مرتسم تھے۔ چنانچہ اگر اردو میں مزاح، طنز، تحریف، تقلیب خندہ آور، رمز اور تلخ اندیشی کو بروئے کار لانے کی کوشش ہوئی تو یہ مغربی اثرات کے نفوذ ہی کا نتیجہ تھا۔ تاہم یہ بات مستثنیات کے تابع بھی ہے۔ مثلاً غالب کو لیجئے جس کے ہاں پہلی بار شاعرانہ مزاح ابھرا جو مغربی اثرات کا نتیجہ نہیں تھا۔ دراصل غالب کے ہاں آگہی، عرفان اور بیداری کی وہ صورت پیدا ہو گئی تھی جس کے اظہار کے لئے تبسم کی ایک زیر لبی لہر ہی بہترین ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ احساسی سطح پر بھی غالب اس کیفیت کی زد میں تھا جو مسکراہٹ اور آنسو سے مل کر مرتب ہوتی ہے۔ چنانچہ غالب بھی اس بچے کی طرح نظر آتا ہے جو آنسوؤں میں مسکرا رہا ہو۔ دوسری مثال فرحت اللہ بیگ کی ہے جن کے ہاں اسلوب کی تازگی نے نفسی انبساط کی کیفیت پیدا کی نہ کہ خندۂ دنداں نما کی۔ خندۂ دنداں نما کی روایت تو پنچ اخبارات بالخصوص اودھ پنچ کے ذریعے پروان چڑھی مگر اس سلسلے میں مغربی ظرافت کے عناصر کو بھی بڑے پیمانے پر قبول کیا گیا۔ تاہم بدقسمتی سے مغربی ظرافت کے معیار کو قائم نہ رکھا جا سکا!

تاحال اردو ادب میں فنِ مزاح نگاری نے تین واضح صورتوں میں خود کو اجاگر کیا ہے۔ پہلی اور سب سے قدیم تر یہی صورت تو یہ ہے جو خود کو بدل بدل کر اور نئے سے نئے حالات حسب سے لیس ہو کر اردو ادب میں بار بار ابھرتی رہی ہے۔ چنانچہ غزل میں زاہد اور محتسب کا مذاق اڑانے سے لے کر انشا اور مصحفی کے زمانے کی لطیفہ گوئی تک اور پھر دور جدید میں ادبی معاصرت پر ابھرنے والی حیلہ بازی اور حریف کو ذلیل کرنے کی روش تک اس کے متعدد روپ ہمارے سامنے ہیں۔

دوسری صورت اسلوب کی اس شگفتگی میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے جو ایک لطیف سے تبسم زیر لب سے ملو ہے۔ اس کی نفیس تر یہی صورت تو غالب کا شاعرانہ مزاح ہے۔ مگر یہ بعض دوسرے لکھنے والوں مثلاً محفوظ علی بدایونی، فرحت اللہ

سجاد علی انصاری، خواجہ حسن نظامی، قاضی عبدالغفار، ملا رموزی اور جدید دور میں رشید احمد صدیقی، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، محمد خالد اختر، مشتاق احمد یوسفی اور کرنل محمد خان کی تحریروں میں کسی نہ کسی انداز میں مزاح کارفرما رہا ہے۔

تیسری صورت وہ کشش ہے جس کے تحت مغرب کی ظرافت میں استعمال ہونے والے عناصر کو اردو ادب میں برتا گیا ہے۔ اس ضمن میں طنز کو بطور خاص بہت فروغ ملا ہے۔ طنز اور مزاح میں ایک بنیادی فرق ہے۔ بہت عرصہ ہوا میں نے ان دونوں کے فرق کو واضح کرنے کے لئے ایک ضرب المثل ترتیب دی تھی۔ ضرب المثل تھی: قبل از طعام طنز بعد از طعام مزاح! ـــــ کہنے کا مقصود یہ تھا کہ جب معدہ خالی ہو اور بھوک اپنے پورے جوبن پر ہو تو انسانی مزاج میں برہمی اور چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے اور حیاتین کی عارضی کمی ماحول کی طرف انسان کے سارے ردِ عمل کو تبدیل کر دیتی ہے۔ ایسے میں اس کی ہنسی میں بھی نشتریت کے عناصر پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن کے نتیجے میں طنز اور زہرخند کو تحریک ملتی ہے۔ دوسری طرف کھانے کے بعد انسانی ردِ عمل ایک نیا روپ اختیار کرتا ہے۔ سیرابی کے ساتھ ساتھ ماحول سے یگانگت بڑھ جاتی ہے اور زندگی کانٹوں کے بجائے پھولوں کی سیج سی دکھائی دینے لگتی ہے۔ ایسے میں اگر ہنسی کو تحریک ملے تو اس میں مفاہمت، انس اور ہمدردی کے عناصر ابھرتے ہیں۔ شاید اسی لئے دعوت کے بعد ہلکے پھلکے لطائف کا رواج عام ہے۔ اس نکتے کو اگر پھیلائیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب معاشرہ بھوکا ہو یا کسی قومی، اخلاقی یا معاشرتی محرومی کا شکار ہو تو اس میں طنز کو فروغ ملتا ہے۔ دوسری طرف فارغ البالی اور سکونِ قلب کے دور میں ماحول سے یگانگت اور انس بڑھ جاتا ہے اور اسی لئے خالص مزاح کو عروج نصیب ہوتا ہے۔ انیسویں صدی بالخصوص وکٹورین عہد اور اس کے بعد کے انگریزی ادب میں خالص مزاح کا فروغ اور جدید اردو ادب میں طنز کا رواج اسی نکتے کی روشنی میں پوری طرح واضح ہوتا ہے۔ سو اگر ہمارے ادبا نے طنز کو بڑے پیمانے پر استعمال کیا تو اس کی بڑی وجہ معاشی اور سیاسی حالات کی وہ ناہمواریاں تھیں جن کے باعث ایک واضح برہمی کے ردِ عمل کو تحریک ملی۔ نثر میں کرشن چندر، کپور، فکر تونسوی، رشید احمد صدیقی، فلک پیما، ابنِ انشاء، احمد جمال، شاعری میں اکبر، اقبال، ظفر علی خان، ظریف لکھنوی اور ان کے بعد شاد عارفی، ضمیر جعفری اور نذیر احمد شیخ وغیرہ زیادہ تر طنز ہی کو بروئے کار لائے اور یہ عمل حالات کے تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ طنز کے مقابلے میں خالص مزاح کو ہمارے ہاں زیادہ فروغ نہیں مل سکا۔ تقسیم سے پہلے امتیاز علی تاج، پطرس اور راجہ مہدی علی خاں کے علاوہ مشکل ہی سے کوئی اول درجے کا مزاح نگار دکھائی دیتا ہے۔ البتہ تقسیم کے بعد خالص مزاح کے امکانات کچھ روشن ہوئے۔ راجہ مہدی علی خاں، مسعود مفتی، ہوش ترمذی، غلام جیلانی اصغر، مجتبیٰ حسین اور غلام الثقلین نقوی۔ ان سب نے (کم یا زیادہ) خالص مزاح نگاری کے رجحان ہی کو فروغ دیا ہے۔

طنز اور مزاح کے علاوہ تحریف یا پیروڈی بھی ایک ایسا عنصر ہے جسے ہمارے ادبا نے مغرب سے مستعار لیا۔ تحریف کسی تصنیف کی ایک ایسی لفظی نقالی کا نام ہے جس سے اس تصنیف کی تضحیک ہو سکے، اپنے عروج پر اس کا منتہا ادبی یا نظریاتی خامیوں کو منظر عام پر لانا ہوتا ہے۔ لیکن اس سے ورے یہ حالات زمانہ کا مضحکہ اڑاتی، کسی بلند پایہ مضمون کو خفیف مضمون میں تبدیل کرتی یا محض لفظی تبدیلیوں سے تفریح طبع کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ اردو ادب میں تحریف نگاری کو بڑے پیمانے پر تو فروغ نہیں مل سکا پھر بھی بعض نہایت خوبصورت تحریفیں وجود میں آئی ہیں۔ نثر میں پطرس، شفیق الرحمان، کرشن چندر، کنہیا لال کپور، چراغ حسن حسرت

احمد جمال پاشا اور انور سدید کی تحریفات قابلِ ذکر ہیں۔ شاعری میں پروفیسر عاشق محمد۔ سید محمد جعفری۔ کنہیا لال کپور۔ مجید لاہوری فرقت کاکوروی اور نذیر احمد شیخ نے تحریف کے نہایت عمدہ نمونے پیش کئے ہیں۔

بہت عرصہ ہوا مولانا صلاح الدین احمد نے لکھا تھا کہ کسی زبان کی لطافت اور کسی قوم کی ذہنی پختگی کا اندازہ کرنے کے لئے اس زبان کی ادبی ظرافت اور اس قوم کا احساسِ مزاح ہی سب سے عمدہ معیار ہے۔ مولانا کی یہ بات سو فی صد درست ہے مگر میں اس میں یہ اضافہ کروں گا کہ کسی زبان کی ادبی ظرافت کے معیار میں جو نشیب و فراز آتے ہیں ان کا براہ راست تعلق اس زبان کے بولنے والوں کے سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی عروج و زوال سے بھی ہے۔ چنانچہ اگر اردو ادب میں فنِ مزاح نگاری کا گراف پستی سے بلندی اور دوبارہ پستی کی طرف آیا ہے تو یہ ابتدائی قومی اضمحلال کی سطح سے ایک بلند تر قومی سطح کے احساس کو چھونے اور پھر دوبارہ ابتدائی اضمحلال اور زوال کی طرف مراجعت کرنے کی داستان ہی کی ایک منقلب صورت ہے مغلوں کے دورِ زوال میں جب قومیت کا احساس روبہ زوال تھا تو ہجو گوئی اور لطیفہ بازی کا رجحان ہی سکۂ رائج الوقت بنا۔ پھر جب اس برصغیر کے باسی سیاسی اور سماجی طور پر متحرک ہوئے اور آزادی کے حصول کی تحریک نے زور پکڑا تو احساسِ مزاح اور اس کے نتیجے میں فنِ مزاح نگاری میں بھی ترقی ہوئی۔ چنانچہ جمہوری دور کے اردو ادب میں طنز اور مزاح کا معیار خاصا بلند ہے۔ مگر پچھلے دس پندرہ سالوں میں اردو ادب میں فنِ مزاح نگاری کا گراف مزید اوپر چلنے کے بجائے بتدریج سرنگوں ہوتا چلا گیا ہے۔ آج ہماری تنقیدی مجالس نیز اخبارات کے ادبی صفحات کی وساطت سے جملہ بازی لطیفہ گوئی اور ہجو نگاری کی جو روش پروان چڑھ رہی ہے وہ اس مغلیہ دورِ زوال ہی کی یاد دلاتی ہے جس میں اول اول جعفر زٹلی اور دوسرے ہجو گو شعرا نے اپنے "کمالات" کا مظاہرہ کیا تھا اور آخر میں انشا اور مصحفی کے معرکوں نے۔۔۔!

ممتاز مفتی

آج کے سائنسی دور میں ادب کی ضرورت

(نوٹ:۔ یہ مضمون قلم قبیلہ کے سیمینار میں پڑھا گیا)

سائنس کے تین پہلو ہیں۔

۱۔ سائنس علم ہے اس حوالے سے ہم اس کی قدر کرتے ہیں۔

۲۔ سائنس ٹیکنالوجی ہے۔ یعنی ایسا علم جسے کام میں لایا جا سکتا ہے اس کے کامی پہلو کی حیثیت اس قدر اہم اور فعال ہو چکی ہے کہ علم کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی ہے۔ سیدھے سادے الفاظ میں یوں ہے کہ سائنس نے مشین ایجاد کی اور صاحب حیثیت لوگ اسے برت رہے ہیں بلکہ کیفیت یہ ہے کہ سائنس ایسی ایجادات کرنے پر مجبور کر دی گئی ہے جو صاحب حیثیت لوگ اپنے مفاد میں کام میں لانا چاہتے ہیں یعنی اس حیثیت سے سائنس ایک جن ہے جو الہ دینوں کے ہتھے چڑھی ہوئی ہے اس لحاظ سے سائنس ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔

۳۔ سائنس ایک رویہ ہے ایک ذہنی رُخ ہے ایک ATTITUDE ہے جو آج کے پڑھے لکھے لوگوں اور دانشوروں یعنی آپ اور میں۔ ہم سب کے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔ یہ رویہ جسے ہم بڑے فخر سے سینے پر تمغے کی طرح سجائے پھرتے ہیں۔ غلط ہے۔ جھوٹ ہے۔ گمراہ کن ہے۔ جہالت پر مبنی ہے۔

صاحبو! یہ میں نہیں کہہ رہا۔ میری کوئی حیثیت نہیں کہ اتنی بڑی بات زبان پہ لاؤں۔ یہ بات جدید ترین سائنس دان خود کہہ رہے ہیں۔

ویسے تو کتابی لوگ رسمی طور پہ یہ کہنے کے عادی ہیں کہ ہر علم کے جس کو کام میں لایا جا سکتا ہے دو پہلو ہوتے ہیں ایک خیر کا دوسرا شر کا۔ لیکن یہ بات کہنے کی بات ہے۔ ہم ایسی ٹھنڈی میٹھی باتیں کر کے خود کو خوش رکھنے کے عادی ہیں بہر طور اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ ہمیشہ ہر دور میں صاحب توفیق لوگ علم کو برتتے رہے آج کے دور میں یہ لوگ کھل کر سامنے آ گئے ہیں ایک با اقتدار طبقہ دوسرے سرمایہ دار طبقہ۔

بااقتدار طبقے نے سائنسی علوم کو اسلحہ سازی کے لئے برتا برت رہے ہیں، سرمایہ داروں نے منافع خوری کے لئے برتا برت رہے ہیں۔ اگر چلتے چلتے اتفاق سے خلق خدا کی خدمت بھی ہو گئی تو وہ ایک ضمنی بات ہے۔

سائنسی علوم کے برتے جانے کا پہلو اس حد تک اہم ہو گیا ہے کہ اسے علم کہنا میری دانست میں علم کے لفظ کی توہین ہے، سائنس بیچاری اب چاکر بن گئی ہے اور سائنس دان مظلوم۔ یا وہ بکنے لگے ہیں یا انہیں اغوا کر لیا جاتا ہے۔ طوق غلامی ڈال دیا گیا ہے تاکہ اقتدار پسندوں اور سرمایہ داروں کی ہوس کی تسکین کریں۔

صاحبو! اگرچہ لطیفہ ہے لیکن حق ہے۔

ایک صاحب نے پوچھا ایٹمی ٹیکنالوجی میں روس نے زیادہ ترقی کی ہے یا امریکہ نے؟ دوسرے نے جواب دیا میرے خیال میں جو جرمن انجنیئر روس کے تحت کام کر رہے ہیں وہ اتنے قابل نہیں جتنے وہ جرمن انجنیئر جو امریکہ کے تحت کام کر رہے ہیں۔

صاحبو! یہ آج کے بڑے، جو بڑے کہلاتے ہیں۔ طاقت کے زور پہ بڑے ہیں بے شک ہیں لیکن ان کی ہے لیکن انہیں بڑا بننا نہیں آیا۔ ہمارے لئے بڑے کا مفہوم کچھ اور ہے جناب والا میں ایک بڑے کو جانتا ہوں، اسے بڑا مانتا ہوں اس کا عہدہ اتنا اونچا تھا کہ آج تک کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔ اس کے باوجود وہ خود کو کسی سے برتر نہیں سمجھتا تھا، کسی کو خود سے کم تر نہیں سمجھتا تھا۔ بڑا ہو کر بڑا نہیں بنتا تھا۔ صاحبو میں صرف اس شخص کو بڑا مانتا ہوں جو اس بڑے کے نقش قدم پر چلے۔

اب لیجئے سائنسی رویے کی بات۔ میرے موضوع کو سائنس یا ٹیکنالوجی سے اتنا تعلق نہیں جتنا سائنسی رویئے سے ہے جسے SCIENTIFIC ATTITUDE کہتے ہیں اور جس نے آپ کا میرا ہم سب دانشوروں کا ستیاناس کر رکھا ہے۔ اس سائنسی رویئے سے مجھے سب سے پہلے برٹرینڈ رسل نے روشناس کیا۔ کہنے لگا دوستو شک کرو ہر بات پہ شک کرنا سیکھو۔ شک کے بغیر تم سچائی کو پا نہیں سکتے۔ شک کی تلقین کر کے اس نے مجھے مذہب سے کاٹ دیا۔ روایات سے کاٹ دیا۔ لوک دانش سے کاٹ دیا یوں مجھ پر سائنٹیفک ٹیمپرامنٹ کا پالش چڑھ گیا۔ اس وقت یہ خیال نہ آیا کہ مجھے سائنسی رویے پہ ہی شک کرنا چاہیئے۔ آج بھی ہمارے دانشور اسی سائنسی اور عقلی رویئے کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ یہ رویہ انیسویں صدی کی سائنس کا پیداوار ہے۔

بیسویں صدی میں سائنس کی کایا پلٹ ہو گئی۔ پرانی کینچلی اتر گئی جس طرح سورج غروب ہونے کے باوجود ہم اسی کی روشنی میں گردوپیش کو دیکھ رہے ہیں۔ خود کو دانش ور سمجھ کر مونچھوں کو تاؤ دے رہے ہیں۔ بیسویں صدی میں تین بڑے اہم انکشافات ہوئے ہم نے ان انکشافات کو سُنا جانا گھسانا نہیں۔ مان لیتے تو ہمیں اپنے BELIEFS

[illegible]

اور کہا کہ سامنے کوئی نئی بات موجود نہیں۔ مگن بیٹھے رہو۔ جب حشر کا دن آئے گا اس روز دیکھا جائے گا۔ پہلا انکشاف یہ ہوا کہ مادہ اور روح دو الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی ٹہنی کے دو پتے ہیں۔ ہم نے دونوں کو الگ الگ ڈربوں میں بند رکھا تھا۔ سائنس کو پتہ چلا کہ مادہ صرف مادہ ہی نہیں بلکہ بیک وقت مادہ بھی ہے انرجی بھی، بیک وقت جامد بھی ہے متحرک بھی اور وہ طرح طرح کے روپ بدل سکتا ہے۔ اس بات نے فزکس کی بنیاد ہی ہلا دی۔ ساتھ بے چاری منطق بھی پٹ گئی کہ کوئی چیز ایک وقت میں یا تو A ہو سکتی ہے یا B۔ یہ بیک وقت A اور B نہیں ہو سکتی۔ یہ مفروضہ غلط نکلا۔ یعنی دلیل کی کمر ٹوٹ گئی۔ پھر فزکس پر یہ انکشاف ہوا کہ نچلی منزلوں کے اصول سائنس کی اوپر کی منزلوں پر پہنچ کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ کبھی تو روشنی سیدھی لکیروں پر چلتی ہے اور کبھی سانپ کی طرح بل کھانے لگتی ہے۔ پہلے ہی ارسطو نے پتہ نہیں کس خوش فہمی کے زیر اثر اعلان کر دیا تھا۔ انسان ریشنل انیمل ہے۔ مجھے سیب کو زعم ہو گیا کہ میں پکا ہوا ہوں لہٰذا اسی خوشی میں وہ ڈال سے ٹوٹ کر زمین پر گر گیا۔

اس بھلے آدمی کا مطلب یہ تھا کہ انسان میں ریشنل ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ چاہے تو اس صلاحیت کو برت سکتا ہے اسے معلوم نہ تھا کہ انسان اس صلاحیت کو برتنا نہیں چاہتا۔

صاحبو ہم ریشنل نہیں۔ ریشنلائز کرنے کے شوق میں مقصد کی گاڑی کو چلانے کے لئے کل کا گھوڑا۔ آگے نہیں بلکہ گاڑی کے پیچھے جوتتے ہیں۔ دینے ہوں تو دو اور دو تین گنتے ہیں لینے ہوں تو پانچ۔

انسان کی سب سے امتیازی خصوصیت عقل نہیں جذبہ ہے۔ کتابی لوگ کہیں گے جذبات اچھے بھی ہوتے ہیں بُرے بھی ہوتے ہیں۔ بے شک بُرے بھی ہوتے ہیں لیکن اچھے جذبات کی فراوانی ہے۔ برے آٹے میں نمک کی مصداق ہیں۔ بے شک ذائقہ نمک کا حاوی رہتا ہے لیکن آٹے کی فراوانی سے انکار نہیں کیا جا سکتا میرا ایمان ہے کہ انسان کے خمیر میں جب شر خیر پر حاوی ہو جائے گا تو زندگی کا دھارا سوکھ جائے گا۔

ہاں تو میں مادے کا ذکر کر رہا تھا۔ بیسویں صدی میں مادے کے متعلق نئی باتوں کا پتہ چلا۔ پہلے ہم سمجھتے تھے۔ مادہ جتنا بھی ہے اتنا ہی رہے گا۔ نہ وہ آتا ہے نہ جاتا ہے۔ پتہ چلا کہ یہ غلط ہے۔ مادہ آتا ہے پتہ نہیں کہاں سے آتا ہے۔ انوکھے طریقوں سے آتا ہے حتیٰ کہ مادے کی بارش بھی ہوتی ہے مختصر یہ کہ فزکس میں یہ کہنا ناممکن ہو گیا کہ فلاں عمل ممکن ہے فلاں ناممکن یا فلاں اصول اٹل ہے یعنی بے چاری فزکس کا چھلکا اڑ گیا۔

دوسرا انکشاف وقت کے متعلق تھا۔

ہم سمجھتے تھے کہ وقت آتا ہے جاتا ہے۔ پتہ چلا کہ نہ آتا ہے نہ جاتا ہے۔ وقت ایک اٹل دوامی چیز ہے ماضی حال مستقبل اس کے تین روپ ہیں جو ہماری CONSCIOUS NESS نے ایجاد کر رکھے ہیں۔ آئن سٹائن کے چیلے اب حال کے سوا کسی روپ کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہی بات صوفی کہا کرتے تھے اور ہم ان پر ہنسا کرتے تھے۔

اگر وقت ایک زندہ اور پائندہ چیز ہے تو PRECOGNITION یعنی کشف ایک سائنسی حقیقت ہے۔ اب لوحِ قلم سے انکار کون کرے پھر CONSCIOSNESS کی عظمت مسلم ہو گئی۔ تمام OCCULT سائنسوں کو جن پر فزکس ہنسا کرتی تھی عزت کا مقام حاصل ہو گیا۔ سپر نیچرل کا لفظ بے معنی ہو کر رہ گیا چونکہ ہمیں یہ احساس ہو گیا کہ ہمارا نیچرل کا کانسپٹ غلط ہے، محدود ہے۔ اس کے علاوہ انسان کی CONSCIAUONESS کی اہمیت سامنے آ گئی۔ اندر کا انسان اتنا ہی اہم ہو گیا جتنا باہر کا انسان سمجھا جاتا تھا۔ اس ضمن میں آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب سائنس انیسویں صدی کا چشمہ لگائے بیٹھی تھی۔ اوکلٹ سائنسز کو نہیں مانتی تھی ان دنوں ای ایس پی نے ٹیلی پیتھی کا شور مچا رکھا تھا۔ فزکس اس پر ناک بھوں چڑھا رہی تھی۔ کوئی سائنسدان ایسا نہ تھا جو ٹیلی پیتھی کو آزمانے کے لئے تیار ہو۔

دفعتہً روسی فوج کو سوجھی کہ ٹیلی پیتھی کو کام میں لایا جا سکتا ہے جب فوجی کمیونیکیشن کے دوسرے ذرائع فیل ہو جائیں تو ــــ کیوں نہ اسے آزمایا جائے۔ آزمانے کے لئے وسیع قسم کے تجربات کئے گئے۔ کچھ کچھ ٹھیک پایا۔ تو بولے ہاں کام لیا جا سکتا ہے۔ ٹیلی پیتھی کو بحیثیت علم نہیں مانا۔ بحیثیت کام کی چیز مان لیا۔ آج کا تحقیقی سنٹر جو پارا سائیکولوجی پر تجربات کر رہا ہے اسے علم کی حیثیت نہیں دے رہا چونکہ ہتھیار کی حیثیت دے رہا ہے لہٰذا تحقیق کے نتائج کو خفیہ رکھا جاتا ہے صرف پارا سائیکالوجی کی بات نہیں سائنس کی جدید ترین دریافتوں کو بھی خفیہ رکھا جا رہا ہے اس کی دو وجوہات ہیں۔

۱۔ ہتھیار کا راز دشمن تک نہ پہنچے۔

۲۔ کہ نئی دریافتیں عوام کے دلوں پر اثر انداز نہ ہونے پائیں۔ اگر عوام کو پتہ چل گیا تو رویئے بدل جائیں گے ذہنوں کی کایا پلٹ ہو جائے گی۔ مذہب مفروضہ کی حیثیت سے نکل کر حقیقت بن جائے گا۔ روحانی دنیا کی اہمیت بڑھ جائے گی۔ خارجی دنیا کی حیثیت کم ہو جائے گی عقل و دلیل دم دبا کر بیٹھ جائیں گے اور اللہ میاں برسرِ عام کرسی پر براجمان ہو جائیں گے۔

بیسویں صدی میں جو تیسرا انکشاف ہوا وہ اہم ترین تھا کہ ہم انسانی ذہن کے صرف ۱/۱۰ حصے سے کام لے رہے ہیں۔ ۹/۱۰ صلاحیتیں خوابیدہ پڑی ہیں۔ اس بات کا پتہ لگانا ازبس ضروری ہو گیا کہ انسان میں کیسی کیسی قوتیں پنہاں ہیں سائنسدانوں کا رخ خارجی حقائق سے ہٹ کر داخلی کیفیتوں پر مرکوز ہو گیا انہوں نے اعلان کیا کہ دروازے کھلنے والے ہیں، پردے اٹھنے والے ہیں۔ سائنس کا زاویہ نظر بدل گیا ہے۔ نئے علوم سامنے آئیں گے۔ نئی طاقتوں کا ظہور ہوگا

دقت یہ ہے کہ سائنس والوں کا بس نہیں چلتا انہیں علم کی تلاش سے روکا جا رہا ہے۔ صاحبِ اقتدار ان کی آزادانہ تحقیق میں مزاحم ہیں۔ صاحبو یہ باحیثیت لوگ اور اقتدار پسند ملکوں کے سربراہ نہیں ہیں یہ لوگ سرمایہ

کی کرسیوں کی اوٹ میں بیٹھے ہیں کھل کر سامنے نہیں آتے۔ مثلاً مشہور زمانہ ہے کہ انگلستان پر بینکروں کی حکومت ہے۔ امریکہ پر یہودی کارخانہ دار قابض ہیں۔ فرانس پر فری میسنز کی اجارہ داری ہے۔ اس لئے ہم۔ آپ اور بیش اندھیرے میں ہیں اور جہاں تک ان کا بس چلتا ہے اندھیرے میں رہیں گے اور ہمارا ذہنی رویہ وہی انیسویں صدی والا رہے گا اور ہم خود کو دانشور سمجھ کر مونچھ مروڑتے رہیں گے۔ تو صاحبو یہ ہے آج کی سائنسی دنیا کی صورتِ حال۔ میں نے اسے خاصی وضاحت سے اس لئے بیان کیا ہے کہ اس کی روشنی میں ہم ادب کی ضرورت کا جائزہ لے سکیں۔ سائنسی صورتِ حال کے متعلق مندرجہ ذیل نکات قابل توجہ ہیں۔

۱۔ آج کے پڑھے لکھے لوگوں اور ادیبوں کو جدید سائنس کے رجحانات کا شعور نہیں۔

۲۔ ہمارا ذہنی رویہ قدیم سائنس کی بنیادوں پر قائم ہے جو بیشتر غلط ثابت ہو چکی ہیں۔

۳۔ صاحب اقتدار لوگ جو میڈیا کو کنٹرول کر رہے ہیں نہیں چاہتے کہ عوام کو جدید سائنس کے رجحانات کا علم ہو۔

۴۔ سائنس دان خود زبان بند ہیں۔

اب لیجئے ادب کی بات۔

میں ادب کی DEFINITION نہیں کروں گا۔ چونکہ نہ تو محقق ہوں نہ نقاد ہوں۔ الحمدللہ کہ نقاد نہیں ہوں الحمدللہ عالم نہیں ہوں۔ نکتہ دان نہیں ہوں۔ نکتہ چین نہیں ہوں۔ قلم قبیلے کا ایک عام تخلیق کار ہوں۔

سائنس کے متعلق جو گزارشات میں نے پیش کیں وہ میری نہیں بلکہ مستند سائنس دانوں کے بیانات سے اخذ کی گئی ہیں۔ ادب کے متعلق میں جو گزارشات پیش کروں گا وہ میرے ذاتی تاثرات ہیں۔ آپ انہیں مانیں یا نہ مانیں آپ کی مرضی، سائنس اور ادب میں کیا فرق ہے۔

۱۔ سائنس عقل کی بات کرتی ہے۔ ادب جذبات کی بات کرتا ہے۔

۲۔ سائنس اصولوں کی بات کرتی ہے۔ ادب انسانوں کی بات کرتا ہے۔

۳۔ سائنس کا کام قوتوں کو زیر کرنا ہے۔ ادب کا کام انسانوں کو قریب تر لانا ہے۔

۴۔ سائنس کی اپیل ذہن پر ہے، ادب کی دل پر۔

۵۔ سائنس باہر کے انسان سے تعلق رکھتی ہے۔ ادب اندر کے انسان سے تعلق رکھتا ہے۔

صاحبو! آپ کو علم ہے کہ ہر فرد ایک جزیرہ ہے۔ دوسرے فرد سے دور ــــ درمیان میں سمندر حائل ہے ہر فرد کے اپنے مسائل ہیں۔ اپنی مشکلات ہیں، اپنی مجبوریاں ہیں، جسے دوسرا فرد نہیں جانتا نہیں سمجھتا۔ افراد میں ہر ایک چیز سانجھی ہے وہ یہ کہ ہم سب حواس خمسہ میں مقید ہیں۔ وقت یہ ہے کہ یہ حواس خمسہ بھی ایک جیسے نہیں۔ کچھ لوگ

زیادہ دیکھتے ہیں، کچھ زیادہ سنتے ہیں۔ مثلاً میں اپنے بیٹے عکسی کی نسبت کم سنتا ہوں۔ اپنے دوست اشفاق احمد کی نسبت کم دیکھتا ہوں۔ قدرت اللہ شہاب کی نسبت کم دیکھتا اور کم سنتا ہوں۔ اپنی سہیلی بانو قدسیہ کی نسبت کم محسوس کرتا ہوں۔

میری دانست میں ادب کا مقصد ہے کہ ان جزیروں کو قریب لایا جائے۔ فرد کے جذبات اور احساسات کا دوسروں کو شعور دلایا جائے۔ دلوں میں ہمدردیاں پیدا کی جائیں۔ یہ نہیں کہ دوسروں کے خلاف غم و غصہ بھڑکایا جائے۔ لوگوں کو کمٹمنٹ پر مجبور کیا جائے۔

صاحبو ادیب کی کمٹمنٹ بنی نوع انسان سے ہے جس طرح حضورؐ اعلیٰ کی کمٹمنٹ بنی نوع انسان پر رحمت تھی جس طرح اللہ تعالےٰ رب المسلین نہیں رب العالمین ہے۔ اگرچہ ہم ادیب بڑے مسکین بڑے عاجز بندے ہیں لیکن ہم تخلیق کار ہیں۔

تقسیم سے پہلے ہماری ایک عیسائی بھنگن تھی۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھا، بشنی تمہاری ذات کیا ہے، بولی میری جات وہ ہے جو بادشاہ کی ہے ہم تخلیق کاروں کی ذات بھی وہ ہے جو بادشاہ کی ہے اصحاب اقتدار کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ جس طرح وہ سائنس کو کام میں لا رہے ہیں۔ اسی طرح ادب اور ادیبوں کو کام میں لائیں لیکن یوں کہ احساس نہ ہو کہ انہیں کام میں لایا جا رہا ہے بلکہ اس خوش فہمی میں مگن رہیں کہ وہ ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے وہ اپنے مطلب کے خیالات کا گڑ ہماسے ہاں بھیجتے رہتے ہیں تاکہ ادبی مکھیاں اس پر بھنبھنائیں اور OPINION MAKERS کی حیثیت سے یہ گڑ جگہ جگہ پھیلائیں تاکہ اقتدار پسندوں کے مفادات کا پرچار ہوتا رہے۔

تقسیم سے پہلے بدیشی اقتدار پسندوں نے ایک بہت بڑی ادبی تحریک چلائی تھی جو بہت کامیاب ہوئی اور جس میں ہمارے کئی ایک نامور ادیب شامل ہوئے۔ کچھ ابھانے میں کلنٹے پر لگ گئے کچھ فیشن کی مقبولیت کے لئے شامل ہو گئے۔ کچھ چوہدری بننے کے چاؤ میں تحریک کا نام ترقی پسند ادب تھا۔ اس ادبی تحریک کا کنٹرول کیمونسٹ پارٹی کے ہاتھ میں تھا۔ ادیبوں سے کام لیا جاتا تھا خصوصی مقاصد سے بے بہرا رکھا جاتا تھا۔

پاکستان بننے پر ہند کی کیمونسٹ پارٹی نے فیصلہ کیا کہ پاکستان اور ہند کے ترقی پسند ادیبوں کا مرکز ہندہی میں رہے گا جہاں سے وہ دونوں کو کنٹرول کریں گے۔ یہ بات پاکستانی ادیب چوہدریوں کے لئے ناقابل قبول تھی لہٰذا پھوٹ پڑ گئی اور یہاں یہ تحریک ختم ہو گئی لیکن آج کل ہمارے ادیب آن جانے میں پھر سے ترقی پسندی کو ہوا دے رہے ہیں۔ انٹلکچول ازم کی وبا فرانس سے آئی اور آج بھی زوروں پر ہے۔ مجھے واضح طور پہ علم نہیں کہ ان کے کیا مقاصد ہیں لیکن نتائج سے ظاہر ہے کہ ا۔

۱۔ ادب کی توجہ جذبات سے ہٹا کر ذہن کی طرف مرکوز کر دی جائے۔
۲۔ ادیب کو دانشور بنا کر عوام سے کاٹ دیا جائے۔
۳۔ ادیب کو اسلام سے کاٹ دیا جائے۔ اس کے ذہن میں مذہب اور روایت کے لئے تحقیر پیدا کی جائے۔

پتہ نہیں اہل مغرب اسلام سے اس قدر خوفزدہ کیوں ہیں۔ یورپ میں کئی ایک ایسی انجمنیں کام کر رہی ہیں جن کا واحد مقصد اسلام دشمنی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں جب میں صدر گھر میں ملازم تھا تو مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ یورپ میں ایسی ۱۳۶ انجمنیں باقاعدہ کام کر رہی ہیں۔ یہ تو خیر جملہ معترضہ تھا آج بھی ہمارے کچھ نوجوان ادیبوں میں انٹلکچول بننے کا شوق عام ہے وہ خود کو خواص سمجھتے ہیں۔ نزدیک کی کوڑی لانا اپنی توہین سمجھتے ہیں، اونچی اونچی باتیں کرنے کے مشتاق ہیں جو عوام کی سمجھ میں نہ آئیں اور اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

صاحبو سچی بات یہ ہے کہ ہم تو کچھ بھی نہیں، ادیب دراصل وہ علاقائی صوفیائے کرام تھے جن کی تصنیفات صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی عوام کے دلوں پر نقش ہیں۔ منہ زبانی حفظ ہیں۔ میں نے بھی زندگی میں کتابیں لکھیں جن میں دانشورانہ باتیں کیں۔ نہ عوام نے منہ لگایا نہ نقادوں نے گھاس ڈالی۔ پھر میں نے عوام کے لئے ایک کتاب لکھی لبیک۔ میں حیران رہ گیا مجھے عام لوگوں کے تقریباً دو ہزار خط موصول ہوئے ہر کسی نے کہا مفتی تو نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ کتاب لکھی ہے۔ خوشی سے دل باغ باغ ہو گیا پھر دفعتاً مجھ پر سات آٹھ بم گرے۔ ساری خوشی ہرن ہو گئی۔ یہ علماء کے خط تھے وہ وہ ڈانٹ پڑی کہ خون خشک ہو گیا۔ اے بے ادب گستاخ نابکار نیکی چھوڑئیے پھر سے تلخ یاد تازہ کرنے کا فائدہ ـــ بڑی مشکل سے انہیں بھلایا ہے۔

آئیے اب ذرا ادب اور ادیب کا جائزہ لیں۔

۱۔ اس وقت ادب اور ادیب دونوں کا عوام سے رابطہ نہیں ہے۔
۲۔ ادیب کی ذہنیت پر شہر سوار ہے یعنی ادیب CITY ORICUTED ہے وہ دیہات کو گنتی شمار میں نہیں لاتا۔ اس کے نزدیک عوام سے مفہوم شہری عوام ہیں۔ صاحبو! شہر ایک قیامت ہے جو ہم پر انڈسٹریل ریولیوشن نے ڈھائی۔ شہر پاکستان کا نمائندہ نہیں ہے۔ شہر میں ایک بیگانہ کھچڑی کلچر پایا جاتا ہے خیال ہے کہ مغربی فیشن اس کھچڑی کلچر کو سینچتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے اسے کوکا کولا کلچر بھی کہا جاتا ہے۔ شہر کے لوگ مغربی فیشن اور انڈسٹریل ریولیوشن کی پیداوار ہیں اس لئے مصنوعی ہیں۔ انہیں اپنے کلچر اور روایات سے تعلق نہیں۔

تاجر پبلسٹی اور مفاد پرستی کی دھن میں سرگرداں ہیں۔ عہدے دار سٹیٹس زدہ ہیں۔ مزدور اس سوشلزم کے نعرے لگانے میں مصروف ہیں جس کے بارے میں انہیں کچھ علم نہیں۔ عالم جو مغرب سے تحصیل علم کر کے آتے ہیں مغربی خطوط پر سوچتے ہیں۔ طلبہ الجھانے میں ہڑبونگ مچاتے ہیں۔ سیاستدان ذاتی اقتدار کی ہوس کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

بے شک شہر ایک دیدہ زیب جنت ہے۔ کسے را باکسے کارے نہ باشد قسم کی جنت جہاں ہر کوئی اپنی دھن میں لگا ہے آج کے ادیب کے لئے شہر ہی دنیا ہے شہر ہی زندگی ہے۔

۲۔ حکومت ادیب اور ادب سے یکسر بے تعلق ہے کوئی ادیب فوت ہو جائے تو اظہار افسوس کا بیان چھپ جاتا ہے کبھی کبھار کوئی وزیر یا اہل کار اعلان کرتا ہے کہ اب ادیبوں کا فرض ہے کہ قوم کو راستہ دکھائیں انہیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ خود ادیبوں کے راستے بند پڑے ہیں۔

۳۔ چند ایک سرکاری ادارے جو ادب اور ادیبوں کے لئے بنائے گئے ہیں وہ سال میں ایک زناٹے کا جلسہ کرتے ہیں اور باقی سال بیٹھے اونگھتے رہتے ہیں۔ بیچارے کیوں نہ اونگھیں۔ ادیب کی فلاح سے متعلق ان کی تجاویز متعلقہ محکمے میں یوں بے تعلقی کا شکار ہو جاتی ہیں جیسے بینک میں فقیر گھس آئے۔ کبھی کبھار یہ ادارے سیمینار قسم کا اکٹھ کرا دیتے ہیں جن میں باتیں ہوتی ہیں۔ نیک خواہشات بھری باتیں۔ علمی باتیں، کتابی باتیں، منہ زبانی باتیں

ادب کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ کتابیں نہیں چھپتیں۔ ایک طرف تخلیق کی دنیا میں طوفان آیا ہوا ہے نوجوان جذبۂ تخلیق سے یوں بھرے بیٹھے ہیں جیسے مالٹا رس سے بھرا ہوتا ہے۔ دوسری طرف پروجیکشن کے ذرائع مسدود ہیں۔ مزید مسدود ہوتے جا رہے ہیں۔ نوجوان ادیب بغل میں مسودے دبائے پھرتے ہیں پبلشر انہیں گھاس نہیں ڈالتے۔ بیشتر ادیب شوق اشاعت سے مجبور ہو کر قرض لے کر اپنی کتاب خود چھاپنے پر مجبور ہوتے ہیں اگر بالفرض محال پبلشر کتاب چھاپ ہی دے تو سالہا سال ایک ہزار کی ایڈیشن چلتی ہے۔

ادبی جریدے روز بروز بند ہوتے جا رہے ہیں، میڈیا انہیں اس قابل نہیں سمجھتی کہ اشتہاروں سے نوازے وہی محدودے چند لوگ انہیں پڑھتے ہیں جنہیں پرچہ اعزازی طور پر بھیجا جاتا ہے۔ پاکستان میں ایک اندازے سے پانچ ہزار لائبریریاں ہیں اس کے علاوہ سکول اور کالج ہیں جہاں ادبی پرچوں اور کتابوں کی کھپت ہو سکتی ہے ظاہر ہے کہ سرکار کو ادب پر اعتماد نہیں۔ وہ اختلاف رائے کو برداشت نہیں کر سکتی ورنہ یقیناً ایک سرکاری پبلشنگ ادارہ قائم ہو چکا ہوتا۔ ویسے بھی ادبی تحریر بے اثر ہے۔ آج کے دور میں جس میں پگڑی اچھالنے کی طاقت نہیں وہ تحریر بے اثر ہے۔ صاحبو! ادب کی کیفیت آپ کے صوبہ بلوچستان کے مترادف ہے۔ اتنا بڑا صوبہ جس میں دو ایک سڑکیں باقی بے سڑک بے رابطہ۔ اتنا بڑا ادب جس میں دو ایک پگڈنڈیاں۔ باقی لق دق لق دق۔ آپ کہیں گے مفتی بہت مایوس ہے۔ مایوس کن ہے۔ نہیں ایسی بات نہیں۔ صاحبو میں نے ادب کے بارے میں دو عزم کئے ہوئے ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ رسمی بات نہیں کہوں گا۔ حتی الوسع سچی بات کہوں گا۔

۲۔ دوسرے یہ کہ اونچی بات نہیں کروں گا۔ دانشوری نہیں چھانٹوں گا تاکہ عوام سے رابطہ قائم رہے۔

جناب والا میں اکیلا ہی نہیں قلم قبیلہ میں میرے اور بھی بھائی ہیں جو سچی بات کہتے ہیں، سادہ بات کہتے ہیں جو امپورٹیڈ ادبی فیشنوں کو منہ نہیں لگاتے۔ اپنی مٹی کی خوشبو کا احساس رکھتے ہیں۔ علاقائی رنگ میں لکھنے والے اس ضمن میں پیش پیش ہیں۔ ویسے بھی بدقسمتی سے اردو زبان درباری زبان ہے اور درباداری ہمارا قومی وصف ہے۔ اردو زبان میں سچی اور سادہ بات لکھنا بے حد مشکل ہے۔ بہرطور الحمدللہ کہ میں اپنے عزم پر قائم ہوں میرا ایمان ہے کہ یہ کھوکھلی کلچر، مغرب زدگی، ظاہر پسندی اور چمک دمک کا دور آخری دموں پہ ہے۔ اس دور نے باہر کے آدمی کو دیوتا بنایا۔ اس کی پوجا کی۔ اسے منایا۔ باہر کے آدمی کو آسائشیں بہم پہنچائیں، اس کی دیکھ بھال کی۔ اسے نوازا۔ اس حد تک نوازا کہ وہ راون بن گیا۔ راکشس بن گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ باہر کے آدمی کا دور زیادہ دن قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ دور میری ہوش میں آیا تھا اور اب میرے سامنے ہی اس کے اختتام کے عوامل واضح طور پہ ظاہر ہو رہے ہیں۔ صاحبو جب چیونٹیوں کو پر لگ جائیں تو جان لو کہ جلد ہی جلے ہوئے پروانوں کا ڈھیر لگنے والا ہے۔ یہ قدرت کا اصول ہے۔ یقین کیجئے کہ باہر کے انسان کا راون گر رہا ہے۔ اندر کا رام ابھر رہا ہے۔ سائنس دم توڑ رہی ہے۔ مذہب اندر کے انسان کا سواگت کرنے کے لئے آگے بڑھ رہا ہے۔ ادب کی بے قدری کا دور ختم ہونے کو ہے۔

نہیں صاحبو! مفتی مایوس نہیں، پُر امید ہے، مجھے امن، محبت اور روحانیت کی سحر صاف نظر آ رہی ہے



پاکستانی شاعر

اجتماع میں

بسمل صابری، ضمیر جعفری، جگن ناتھ آزاد (انڈیا) سلطان رشک اور ہو چی جہلمی

ڈاکٹر جمیل جالبی

نیاز فتحپوری اور نگار

آج سے تیرہ سال پہلے ۲۷ مئی ۱۹۶۶ء کو مولانا نیاز فتحپوری نے وفات پائی تھی اور ان کے ٹھیک ایک سال بعد ۲۷ مئی ۱۹۶۷ء کو جناب شاہد احمد دہلوی اللہ کو پیارے ہوگئے تھے۔ نیاز فتحپوری اور شاہد احمد دہلوی، دونوں اُردو کے دو بڑے رسالوں "نگار" اور "ساقی" کے بانی اور مدیر تھے۔ دونوں نے اپنے اپنے ماہناموں کے ذریعے اردو ادب اور ادیبوں پر گہرے نقوش ثبت کئے اور کم از کم دو نسلوں کے ذوقِ ادب کی آبیاری کی۔ نیاز فتحپوری ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۶۶ء میں ۸۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ شاہد احمد دہلوی ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۶۷ء میں اکسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔ شاہد صاحب نیاز فتحپوری سے ولادت کے اعتبار سے بائیس سال چھوٹے تھے اور وفات کے لحاظ سے صرف ایک سال چھوٹے تھے۔ آج ۲۷ مئی کو جب ہم نیاز فتحپوری کی یاد میں جلسہ کر رہے ہیں تو مجھے نیاز صاحب کے ساتھ اپنے عزیز و بزرگ دوست شاہد احمد دہلوی کی یاد بھی شدت سے آرہی ہے۔ نیاز صاحب اور شاہد صاحب دونوں تیور کے آدمی تھے۔ نیاز صاحب دلی جاتے تو شاہد صاحب انہیں کھانے پر بلاتے ایک دفعہ گئے تو شاہد صاحب نے نہاری کی دعوت کی۔ سب لوگ صبح ہی صبح پہنچ گئے۔ اتفاق سے نیاز صاحب گیارہ بجے کے قریب پہنچے۔ دعوت ختم ہوچکی تھی اور مہمان اپنے اپنے گھروں کو جاچکے تھے۔ شاہد صاحب نے نیاز صاحب کو دیکھا تو دلی والوں کے مخصوص انداز میں کہا "حضرت! نہاری کی دعوت تھی" دوپہری" کی نہیں، آئیے تشریف لائیے"۔ طاہرہ دیوی شیرازی والا معاملہ جس میں نیاز فتحپوری بھی اسیر تھے، دلی والوں کا مشغلہ تھا۔ اس واقعہ کے مصنف فضل حق قریشی آج بھی ناظم آباد کراچی میں موجود ہیں۔

نیاز فتحپوری مرحوم سے میری ملاقات کراچی میں ہوئی لیکن خط لکھتا بہت اس وقت سے تھی جب میں بی اے کا طالب علم تھا، اور ادب کی دنیا میں کچھ کر گزرنے کا جذبہ ہر دم سرشار کئے ہوئے تھا۔ اس وقت جو بات سوجھتی یوں معلوم ہوتا کہ یہ بات اس دنیا میں پہلی بار کسی انسان کے ذہن میں آئی ہے۔ اسی زمانے میں یہ بات سوجھی کہ اُردو میں گل و بلبل کی علامتوں پر کام کرنا چاہیئے۔ اُردو شعراء کے دواوین کھنگال ڈالے اور ایسے سینکڑوں اشعار جس میں گل و بلبل کی علامتیں استعمال ہوئی تھیں جمع کر لئے۔ اشعار تو جمع کر لئے لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ لکھیں اور کیسے کام کریں؟ اس وقت "ساقی" کی طرح "نگار" بھی میرے ان پسندیدہ رسالوں میں تھا جسے میں پابندی اور شوق سے پڑھتا تھا۔ میرے ایک استاد ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مضامین اکثر نگار میں چھپتے تھے۔ شبلی کی معاشقہ والی بحث بھی اسی زمانے میں "نگار" میں چلی۔ "حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں" والی بحث بھی اسی زمانے میں اٹھی۔ مولانا مودودی اور شوکت سبزواری کی مذہبی بحثیں بھی اسی زمانے میں نگار کے صفحات پر ہوئیں۔ انتقادیات نمبر حصہ اوّل و حصہ دوم بھی اسی زمانے میں چھپ اور مجھ پر

اثر انداز ہوئے۔

نیاز فتحپوری مرحوم کے مضامین جو انتقادیات حصہ اول اور حصہ دوم کے نام سے چھپے تھے۔ اسی زمانے میں پڑھے۔ جمالستان، مکتوبات نیاز، حسن کی عیاریاں، شہاب کی سرگزشت، جذبات بھاشا، نقاب اٹھ جانے کے بعد، نگارستان، ایک شاعر کا انجام اور حرفِ نفز بھی اسی زمانے میں پڑھے۔ اس زمانے میں نیاز فتحپوری کا اسلوب اور ان کا علم و فضل میرے لئے بڑی کشش رکھتا تھا۔ اسی لئے یہ طے کیا کہ ایک خط نیاز فتحپوری کو لکھ کر ان سے استفسار کیا جائے۔ چونکہ نگار میں یہ لکھا ہوتا تھا کہ جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ ساتھ آنا ضروری ہے۔ میں نے اپنے خط میں ایک اور لفافہ رکھا اور ڈاک میں ڈال دیا۔ ایک مہینہ گزر گیا اور جواب نہ آنا تو عالم اضطراب میں دوسرا خط لکھا اور اس دفعہ بھی جوابی لفافہ ساتھ رکھ دیا۔ ایک ہفتے بعد نیاز صاحب کا مختصر سا جواب آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ آپ اس موضوع پر کیوں کام کرنا چاہتے ہیں؟ ظاہر ہے اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میں نے جب بہت سوچا تو صرف یہ جواب ذہن میں آسکا کہ کسی کام کرنے کے لئے "کیوں" کا ہونا ضروری نہیں ہے لیکن پھر طے کیا کہ اس کام کو نہ کیا جائے۔ نیاز صاحب کی ذات اور ان کی تحریروں کے حوالے سے یادوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جسے اگر لکھوں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ میرے اپنے ذہن کی تشکیل کے اس دور میں نیاز کا اثر میرے وجود میں شامل ہے۔

نیاز فتحپوری مرحوم نے "نگار" کے ذریعے وہ کام کیا کہ آج "نگار" کسی رسالے کا نام نہیں رہا بلکہ یہ ایک تہذیبی ادارے اور ایک انجمن کا نام ہے جس نے اردو ادب کے رُخ کو موڑنے، اس میں نئے مزاج کو سمونے اور اسے زمانے کے ساتھ آگے بڑھانے کے لئے نہایت اہم اور عالیشان خدمات انجام دی ہیں۔ اردو ادب کی رومانی تحریک اسی رسالے کے صفحات پر نمودار ہوئی اور سارے برصغیر میں پھیل گئی۔ "نگار" کا پہلا شمارہ فروری ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۲۲ء کے برصغیر کا تصور کیجئے جو روایت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ تحریکِ خلافت کا اندر ٹوٹ چکا تھا۔ "نگار" نے سب سے پہلے ان مسلمہ اصولوں اور ان تسلیم شدہ باتوں کو چیلنج کیا جن کے بارے میں معاشرہ صرف قبول کرنے کے سوا کچھ اور سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ "نگار" شروع ہی سے آزادیٔ اظہار اور روایت شکنی کا علمبردار تھا۔ "نگار" کے صفحات پر ان تمام باتوں پر بحث و مباحثہ ہوا جن پر "نگار" سے پہلے بحث و مباحثہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ اس روایت شکنی کی تہہ میں علم و فکر کے ساتھ گہرا شعور بھی شامل تھا۔ اسی لئے اس رسالے نے اس دور کی نئی نسل اور نئے ذہنوں کو شدت سے متاثر کیا اور آج جب کہ "نگار" نکلتا ہے اور علامہ نیاز فتحپوری ہمارے درمیان نہیں ہیں، ان کے افکار اور ان اثرات سے پیدا ہونے والے رجحانات و میلانات ہمارے مزاج میں پیوست ہو کر ہمارے خون میں گردش کر رہے ہیں۔ اثرات، لال دوا کے دانے کی طرح، اسی طرح آہستہ آہستہ رنگ بدل کر پوری نسل کے بطن میں بیٹھ جاتے ہیں اور ان اثرات کی مدد سے ہر نسل اپنے تنقیدی پیمانے اور اپنے معیار بناتی ہے۔ یہ کام "نگار" نے انجام دیا ہے۔ مثلاً خدا اور مذہب کے بارے میں فرسودہ رسم پرستانہ تصورات کی کینچلی "نگار" نے اتاری ہے۔ جدید علوم اور جدید معلومات سے "نگار" ہی نے اپنے پڑھنے والوں کو روشناس کرایا ہے۔ گیتانجلی کو اردو اسلوب میں سمونے اور اس سے ایک نیا رومانی اسلوب بنانے کا عمل بھی "نگار" ہی کا عطیہ ہے۔ اگر "نگار" یہ کام نہ کرتا تو اردو ادب کی ۱۹۳۶ء کی تحریک اسی جلدی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی تھی۔ جب ۱۹۳۶ء کی تحریک "نئے خیالات" کے ساتھ برصغیر میں داخل ہوئی اس وقت تک "نگار"... ایک نسل کو ذہنی طور پر نئے خیالات کو قبول کرنے کے لئے تیار کر چکا تھا۔ "نگار" نے اپنے صفحات پر چند نئے عنوانات کا اضافہ کیا۔ ادبی رسالوں میں باقاعدہ اداریہ نویسی کا آغاز بھی "نگار" ہی سے ہوا۔ "نگار" نے رسالہ "الناظر" کی روایت

کو آگے بڑھا کر اسے جدید دور کے تقاضوں سے پورے طور پر ہم آہنگ کر دیا۔ اسی طرح "استفسارات" کا عنوان قائم کیا گیا اور اس کے ذریعے دنیا بھر کی معلومات قارئینِ "نگار" کو بہم پہنچائیں۔ ادبی بحثوں کو "نگار" نے خاص اہمیت دی اور "مالہ و ما علیہ" کے تحت گُل افشانیِ گفتار سے قارئینِ "نگار" کے ذہن کو تازہ دم کیا۔ بہت سے نئے لکھنے والوں کو "نگار" میں شائع کر کے انہیں اُردو دُنیا سے روشناس کرایا۔ پھر اس بات کی ضرورت و اہمیت کو بھی واضح کیا کہ ایک رسالے کے "مدیر" کے لئے خود ادیب ہونا بھی ضروری ہے۔ جب تک رسالے کا مدیر صاحبِ قلم اور صاحبِ علم و فضل نہیں ہوگا، اس وقت تک وہ اپنے رسالے کے ذریعے ایک نسل کو متاثر نہیں کر سکتا۔ مولانا نیاز فتحپوری ان تمام خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ ادیب بھی تھے، صاحبِ علم بھی اور علمی و ادبی مسائل کو سمجھنے سمجھانے پر قدرت بھی رکھتے تھے، اسی لئے "نگار" کے ہر صفحہ پر مولانا کی شخصیت کی چھاپ ہوتی تھی اور اسی لئے "نگار" وہ بن گیا جو وہ ہے۔

ایک بات کی طرف میں آپ کی توجہ اور مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ ایڈیٹر اور محض جمع کرنے والے (COMPILER) میں فرق ہوتا ہے۔ ایڈیٹر وہ ہوتا ہے جیسے مولانا نیاز فتحپوری تھے۔ ایڈیٹر ادب کا اعلیٰ مذاق اور اپنا نقطۂ نظر رکھتا ہے اور اسی کے حوالے سے رسالے کا مزاج بناتا ہے۔ اس کی ہر سطر میں فکر و خیال اور نقطۂ نظر کو سمجھتا ہے۔ اس میں اپنے علم، خیال اور اسلوب سے نئی زندگی پھونکتا ہے۔ اپنے دور کی روح کو تخلیقی، تنقیدی و فکری سطح پر ابھارتا ہے اور اسے ایک ایسی شکل دیتا ہے جو پڑھنے والوں کے لئے قابلِ قبول ہو۔ وہ ایک طرف پڑھنے والوں کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے کر ان کی پسند و ناپسند کو سنوارتا ہے۔ ان کے مذاق کو بدلتا اور نکھارتا ہے اور آہستہ آہستہ ان کے ذہن کو اس سطح پر لے آتا ہے جہاں رسالے کا نقطۂ نظر اور قاری کا ذوقِ فکر و ادب بن جاتا ہے۔ برخلاف اس کے "محض جمع کرنے والا" وہ ہے جس کا اپنا کوئی نقطۂ نظر نہیں ہوتا۔ وہ مضامین موصولہ کو مختلف عنوانات کے تحت یکجا کر دیتا ہے اور تاشے باجے کے ساتھ بات لگا جاتا ہے۔ ایسے رسالے کے صفحے اگر آپ کسی دوسرے رسالے کے صفحات میں جوڑ دیں تو اس سے نہ کچھ فرق پڑے گا اور نہ پتا چلے گا۔ لیکن آپ نگار کے صفحات کسی رسالے میں جوڑ کر دیکھئے تو یہ صفحات پکار پکار کر فریاد کریں گے کہ ہمیں حبسِ دوام کی سزا غلط دی گئی ہے۔ ہم وہ نہیں ہیں جو ہمیں سمجھا گیا ہے۔ خدارا ہمیں آزاد کیجئے۔ آج کے بیشتر رسالے اپنے اپنے بے ذوق اور لاعلم مدیروں کے باعث صرف ایسے رسالے بن کر رہ گئے ہیں جن پر ان کے مدیر کی شخصیت اور ذہن کی کوئی چھاپ نظر نہیں آتی اسی لئے ادبی رسالوں کی نہ صرف مقبولیت کم ہو گئی ہے بلکہ ان کا وہ اثر بھی نہیں رہا جو "نگار" جیسے رسالے کا ہوتا تھا۔

"نگار" کی ایک اور خصوصیت یہ رہی ہے، جس سے آج کے بہت سے پرچے عاری ہیں کہ اس نے زبان و بیان اور اسلوب کو بھی موضوع کی طرح اہمیت دی۔ نیاز فتحپوری نے اپنے ہاں شائع ہونے والی ہر تحریر کو سطر بہ سطر پڑھا اور املا و زبان و بیان کی غلطیوں اور کمزوریوں کو دور کیا جو اس میں نظر آئیں۔ میں نے اکثر مدیروں کو یہ کہتے سنا ہے کہ صاحب وہ تو مشہور لکھنے والا ہے اگر وہ غلطی کرے گا تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہوگا۔ حالانکہ مدیر کا کام یہ ہے کہ زبان و بیان اور املا کی کسی غلطی کو رسالے میں نہ آنے دے تاکہ پڑھنے والا اس غلطی کو صحیح سمجھ کر قبول نہ کرے۔

فتح محمد ملک

نیا طرزِ احساس

جب ہماری قوم مغربی استعمار سے آزادی کی جنگ میں سرگرم تھی ہمارا ادیب پیرویٔ مغرب کی دُھن میں قوم کے اجتماعی خوابوں سے بے نیازی میں مگن تھا۔ اس زمانے میں مغرب کے دو عظیم مفکروں ــــ کارل مارکس اور سگمنڈ فرائیڈ کا طوطی بول رہا تھا اور ہمارے ہاں ۱۹۳۶ء کے آس پاس نمودار ہونے والی ادبی تحریکیں انہی دو مفکروں کی تعلیمات سے پھوٹی تھیں۔ ہمارے ادیب کا طرزِ احساس سراسر مغربی تھا مگر ہماری قوم کی آنکھوں میں اور طرح کے خواب تھے۔ یہ خواب اسلام پر سے عرب ملوکیت کی چھاپ اتار کر اسے روحِ عصر سے ہم آہنگ کرنے کی تمنا سے عبارت تھے چنانچہ ادیب قومی تمناؤں سے لاتعلق رہا۔ جب آزادی کی جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوئی اور پاکستان ناگزیر نظر آنے لگا تو ادیب نے بھی تحریکِ پاکستان کو سمجھنے کی کوشش کی مگر اپنے مخصوص طرزِ فکر و احساس کے ساتھ۔ محمد حسن عسکری نے مئی ۱۹۴۶ء میں لکھا۔

"چونکہ اس وقت مسلم لیگ ہر قسم کی استعماریت، استبداد اور سرمایہ داری کی مخالفت کر رہی ہے۔ چوں کہ مسلم لیگ چار سو فیصد عوامی اور جمہوری جماعت ہے چونکہ مسلم لیگ کا پاکستان براعظم ہندوستان میں سب سے پہلی عوامی اور اشتراکی ریاست ہوگا اور پاکستان کا قیام نہ صرف مسلمانوں کے لئے فائدہ مند ہوگا بلکہ خود ہندو عوام کے لئے بھی۔ چونکہ دنیا سے سرمایہ داری کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور مستقل امن و امان قائم کرنے میں پاکستان سے بہت مدد ملے گی اس لئے میں مسلم لیگ سے متعلق ہونا فخر کی بات سمجھتا ہوں[1]۔"

ٹھیک اسی وقت اور بالکل اسی استدلال کے ساتھ فیض احمد فیضؔ فوج کی ملازمت ترک اور پاکستان ٹائمز کی ادارت اختیار کرتے ہیں[2]۔ گویا عسکری ہوں یا فیض۔ ہر دو کے نزدیک اشتراکی ریاست کا قیام تحریکِ پاکستان کے ساتھ وابستگی کا جواز ہے۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کیونکہ ۱۹۳۶ء کی ادبی تحریکیں پیرویٔ مغربی کی آخری منزل ہیں اور ان کے سامنے

[1] جھلکیاں۔ مطبوعہ "ساقی" دہلی۔ [2] ہم کہ ٹھہرے اجنبی۔ صفحہ ۸۷

میں پرورش پانے والے ادیب کے شعور کی سمت یہی ہو سکتی تھی۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ قیام پاکستان کے ساتھ ہی عسکری، تاثیر اور شیریں پاکستان کے نام پر ترقی پسندوں کے خلاف ایک ادبی محاذ بنانے میں کوشاں ہو جاتے ہیں۔ عسکری کا تصور پاکستان تو اوپر کے اقتباس میں آپ نے دیکھ لیا ہے۔ تاثیر کا ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں شمار ہونا بھی ایک مسلمہ امر ہے رہ گئی ممتاز شیریں تو ان کا استدلال بھی ملاحظہ کر لیجئے۔

"چنگاری انہوں نے (انگریزوں نے) آہستہ سے رکھ دی تھی جو سلگتی گئی اور اب شعلے بھڑک اٹھے۔ ان کے آنے سے پہلے ہندو اور مسلمان ساتھ ساتھ محبت سے رہتے تھے۔ عوام آپس میں دوستی سے رہا کرتے تھے۔ یہ فتنہ نہیں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ انگریزوں نے جان بوجھ کر ان میں منافرت پیدا کی۔ ان سے پہلے ہندو مسلم فسادات ناپید تھے؟"

ہندو مسلم یگانگت کا یہ تصور سامراج نواز مورخوں کی ذہنی اختراع ہے اور ہمیشہ اسے جداگانہ مسلم قومیت کے تصور کو جھٹلانے کی خاطر ہوا دی جاتی ہے۔ اپنی مخصوص ذہنی ساخت اور مقلدانہ روش کے باعث یہ لوگ ہندوستانی زندگی کے حقائق کو سمجھنے اور ان ٹھوس حقائق کی روشنی میں جداگانہ مسلم قومیت کے تصور کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ ہندی مسلمانوں کی آنکھیں جن خوابوں سے منور تھیں یہ ان سے بیگانہ رہے۔ تحریک پاکستان سے ہمدردی نے بھی ان کے ادبی شعور اور تخلیقی ذہنیت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ یہ لوگ فقط سیاسی اور معاشی مطالبات کا دم بھرتے رہے مگر ان مطالبات کی جڑیں جن روحانی تصورات میں پیوست تھیں ان سے لاتعلقی کا شیوہ برقرار رہا۔ چنانچہ تحریک پاکستان کے اساسی محرکات و مقاصد سے ناآشنا ذہن قیام پاکستان سے برآمد ہونے والی نئی بصیرتوں کو اپنے تخلیقی شعور کا حصہ بنانے کی بجائے نیا ادبی محاذ بنانے کی خاطر سطحی نظریہ سازی میں مشغول ہو گیا۔

پاکستان کے وجود میں آتے ہی محمد حسن عسکری اور ڈاکٹر تاثیر نے بڑی دردمندی کے ساتھ نئے سوالات اٹھائے پاکستان تہذیبی زندگی کے جن نئے مطالبات اور تخلیقی زندگی کے جن نئے امکانات کا سرچشمہ بن کر طلوع ہوا تھا، عسکری اور تاثیر نے ادیبوں کو ان کی طرف متوجہ کرتے ہوئے پاکستانی ادب کی داغ بیل ڈالنے کا عزم باندھا مگر بہت جلد یہ اصولی اور نظریاتی بحث ذاتی تعصب اور بے بنیاد الزام تراشی کا رنگ اختیار کر گئی۔ سجاد ظہیر اور چند دیگر بھارتی ترقی پسندوں کے بیانات کی آڑ لے کر پاکستان کے ترقی پسند ادیبوں کو معتوب ٹھہرانے کی اس مہم کے جواب میں احمد ندیم قاسمی نے انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کی الگ حیثیت پر اصرار کرتے ہوئے لکھا:

"میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ مسلمان کہا ہے۔ میں کمیونسٹ بھی نہیں ہوں۔ کشمیر پر ہندوستانی فوجوں کی چڑھائی کو استبدادی اقدام سمجھتا ہوں۔ سجاد ظہیر انجمن ترقی پسند مصنفین میں ہر سیاسی خیال کے ادیب کی شمولیت کا ذکر کرتے ہوئے فیض احمد فیض کو اور مجھے لیگی قرار دے چکے ہیں۔ میں اپنے وطن کا وفادار ہوں۔ پاکستان

میری رگ جاں ہے مگر میں محمد حسن عسکری کے ادبی نظریات سے متفق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ وہ جس ادب کو رواج دینا چاہتے ہیں وہ پاکستانی عوام کے ارتقا کا قاتل ہے۔ ۔ ۔ مسلمان سے بڑا انسانیت پرست اور کون ہو گا ؟ انسانیت پرستی ہمیں یقیناً اپنے وطن سے غداری کرنا نہیں سکھاتی۔ دراصل جب بھی کوئی ادیب، طبقاتی تقسیم جاگیرداری، زمینداری اور سرمایہ داری کے خاتمے اور انسان پرستی کا ذکر کرتا ہے تو ہر وہ شخص جس کا مفاد ان اداروں سے وابستہ ہے چونک اٹھتا ہے اور اسے سچا مسلمان کہنے کی بجائے اشتراکی کی گالی داغ دیتا ہے انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کی جن سرگرمیوں سے آپ کو شکایت ہے ان کا علانیہ اظہار کیجئے۔ انجمن کی اصلاح کا بیڑہ اٹھائیے۔ قریب آیئے اور اس ترقی پسندی کو سہارا دیجئے جسے پاکستان کا استحکام چاہیئے۔ پاکستانی عوام کی فلاح چاہیئے، جمہوریت اور مساوات چاہیئے[1]۔

مگر پاکستانی ادب کے نظریہ ساز ترقی پسند ادیبوں سے قریب ہونے کی بجائے الٹا قوم کو ادب اور ادیبوں سے پانچویں کالم کی طرح نمٹنے کے مشورے دینے لگے۔ ترقی پسند ادیبوں کے احتساب کی زد میں آنے کے بعد بھی عسکری، تاثیر، منٹو اور شیریں ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد نہ بنا پائے۔ ایک آدھ منشور مرتب بھی ہوا مگر ادیبوں نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ ترقی پسندوں کے خلاف ادبی محاذ قائم کرنے میں ناکامی نے عجب گل کھلائے۔ پاکستانی ادب کے نظریہ سازوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی تاثیر نے عسکری کو پانچویں کالم میں گرفتار کرا دینے کی دھمکی دی تو عسکری نے "جھلکیاں" میں تاثیر کو بے نقاب کرتے ہوئے لکھا

"وزیروں اور سفیروں سے لے کر مجھ جیسے معمولی آدمیوں تک کسی کی بھی عزت تاثیر صاحب کے ہاتھوں محفوظ نہیں رہی ہے[2]"

تاثیر نے جیسے اس الزام کے مزید ثبوت فراہم کرنے کے لئے معرکۂ تاثیر و حسرت گرم کر ڈالا۔ اس دشنام طرازی کی ناگفتہ بہ تفصیلات "نقوش" کے ادبی معرکے نمبر جلد دوم کے صفحات ۳۲۲ تا ۳۴۲ پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اس بے ہودہ گوئی کا بیہودہ تر پہلو یہ ہے کہ اس سے ہماری ادبی دنیا میں پست نوعیت کی ذاتی رنجشوں اور رقابتوں کو پاکستان اور اسلام کے نام پر نمٹانے کی طرح پڑتی ہے۔ مولانا سالک کی مداخلت سے یہ جو تم پیزار بند ہوتی ہے تو تاثیر پاکستانی ادیبوں کی تنظیم قائم کرنے کیلئے شورش کاشمیری سے توقعات وابستہ کرتے ہیں[3]۔ یہ خاکبازئ امید بھی اسی طرح کارخانۂ طفلی ثابت ہوتی ہے جس طرح عسکری کی ایم۔ اسلم سے توقعات ہوئی تھیں۔ عسکری صاحب بہت جلد پاکستانی اور اسلامی ادب کی بحثوں سے اکتا جاتے ہیں اور اس معذرت کے ساتھ کہ میں نئے نئے احساس قومیت کی رو میں بہہ گیا تھا[4]، فرانسیسی ادب کی غواصی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ پاکستانی اور اسلامی ادب کے باب میں نظریہ سازی کے اس انجام پر مجھے انتظار حسین کی یہ پیش گوئی یاد آتی ہے کہ ا۔

---

[1] منٹو کے نام خط مورخہ ۱۵ ستمبر ۴۸ء، مطبوعہ "سنگ میل" پشاور شمارہ نمبر ۲۔ [2] جھلکیاں۔ ساقی کراچی، دسمبر ۴۸ء
[3] مقالات تاثیر، صفحہ ۲۹۷۔ مجلس ترقی ادب لاہور۔ [4] پاکستان میں ادب کا مستقبل۔ نیا دور ۷۵،

"اردو ادب میں ایک دور ختم ہو چکا ہے اور نیا دور شروع ہونے کے لئے کوئی موقع ٹٹول رہا ہے۔ ادب میں جب کوئی دور ختم ہونے کو ہوتا ہے تو تخلیقی قوتیں بالعموم بہت مضمحل ہو جاتی ہیں اور نئے دور کے شروع ہونے پر گزرے ہوئے دور کے ادیبوں کی قوتِ گویائی کچھ سلب سی ہو جاتی ہے ہمارے ادب میں جو نیا دور شروع ہونے والا ہے وہ ان ادیبوں کے ہاتھوں شروع ہوگا۔ جن کی ذہنیتیں ماقبل ۱۵ اگست عہد میں پختہ نہیں ہوئی تھیں۔ رہا ان ادیبوں کا معاملہ جن کی ذہنیتیں اس گزرے ہوئے دور میں پختہ ہو چکی ہیں سو انہیں یا تو اپنی ذہنیت میں لچک پیدا کرنی پڑے گی، اگر وہ کر سکتے ہیں، اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنا پڑے گا ورنہ پھر ان کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جائے گا جو ہر نئے عہد کے آغاز پر پرانے عہد کے ادیبوں کے ساتھ کیا جاتا ہے یعنی انہیں رجعت پسند اور زندگی کی رو سے بے گانہ ادیبوں کی صف میں دھکیل دیا جائے گا۔"[1]

ہوا یہ کہ سن تیس کی دہائی میں فروغ پانے والی ادبی تحریکوں کے سائے میں اپنے فنی سفر کا آغاز کرنے والے بیشتر ادیب تو اپنی تقلیدی ذہنیت اور اپنے مغربی طرزِ احساس میں تبدیلی پیدا کرنے کی بجائے نظریہ و منشور کی سیاسی مناظرہ بازی میں مشغول رہے مگر ادیبوں کی نئی پود نے خاموشی اور استقلال کے ساتھ عہد کی نئی صداقتوں کو اپنے تخلیقی شعور میں حل کرنے کا عمل جاری رکھا۔ تلاش و تجسس کے اس عمل کے زیرِ اثر ہمارے ادب میں آہستہ آہستہ ایک نئے طرزِ احساس کے خد و خال نکھرنے لگے۔ مغربی ادب کے عکس پر پاکستانی ادب کی تخلیق کا خواب دیکھنے والوں میں سے محمد حسن عسکری نے اول اول ناصر کاظمی اور انتظار حسین کے ہاں اس نئی تخلیقی جہت کا خیر مقدم کیا مگر جوں جوں یہ لوگ مغربی طرزِ احساس سے دور ہٹتے گئے عسکری صاحب بھی ان سے دور ہوتے گئے اور بہت جلد وہ وقت آ پہنچا جب عسکری صاحب ادب پر جمود کے تسلط سے شاکی رہنے لگے۔ ناصر کاظمی نے ادب میں جمود کی اس بحث کے دوران نئی نسل کے ظہور کا اعلان کر ڈالا۔

"ادب کی سست رفتار کو جمود کہنا صرف بیمار اور تھکے ہوئے ذہنوں کا عجز ہے۔ ایک نسل مر چکی ہے ایک نسل دم توڑ رہی ہے لیکن اس کے باوجود زندہ رہنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ ایک نسل پیدا ہو چکی ہے۔ ہمیں اس نسل کی حوصلہ افزائی کرنی ہے اور اس کے لئے سازگار فضا پیدا کرنی ہے اس چھوٹے سے دور میں آج کچھ لوگ ایسے بھی نظر آتے ہیں جو آگے چل کر نہ صرف ہمارے ادب کی عظیم الشان روایت میں برابر کے شریک ہوں گے بلکہ ایک نئی روایت کی بنیاد بھی رکھیں گے۔"[2]

ناصر کاظمی (جسے عسکری صاحب نے صرف چار برس پہلے سچ مچ کا پہلا پاکستانی شاعر قرار دیا تھا) کے اس اختلافی رویہ پر عسکری صاحب نے ادب کی موت کی منادی سنا دی اور ایک صوفیانہ بے نیازی کے ساتھ کرگے گوڈ اور رینے گینوں کے

[1] سیاسی بحران اور ہمارا ادب، مطبوعہ نقوش ۲ مئی ۱۹۴۸ء صفحہ ۱۹ [2] ادب میں جمود مطبوعہ ہمایوں لاہور بابت جنوری ۱۹۵۳ء

مطالعے میں ڈوب گئے۔ ہر چند عسکری صاحب بعد میں پاکستانی ادب کی ضرورت کے قائل نہ رہے تھے اور نئے نئے لمعاں قومیت کی رو میں بہہ کر" انہوں نے جو سوالات اٹھائے تھے ان کی اہمیت اور افادیت خود ان کی نظر میں مشکوک ہو کر رہ گئی تھی مگر انتظار حسین اور ناصر کاظمی نے ان سوالات پر سیاسی ہنگامہ آرائی کی روش اپنانے کی بجائے انہیں اپنے تخلیقی شعور میں جذب کیا۔ چنانچہ پاکستان ان کے ہاں ایک ایسا جذباتی اور روحانی تجربہ بن گیا "جو ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں ہجرت[1]" سے عبارت ہے۔ جس زمانے میں دوسرے لکھنے والے فسادات کے عوامل و محرکات پر غور و فکر میں مصروف تھے یہ لوگ ہجرت کو ایک معنی خیز تخلیقی مہم بنانے میں منہمک رہے۔ نتیجہ یہ کہ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ہمارے ہاں جن تہذیبی اور ادبی سانچوں کو جدیدیت کے شوق میں فراموش کیا گیا تھا ان کی بازیافت کا عمل اس شان سے شروع ہوا کہ جدیدیت کے نام پر فروغ پانے والی ادبی اصناف اور اقدار کچھ فرسودہ اور از کار رفتہ سی نظر آنے لگیں۔ غزل اور داستان سے آتشِ رفتہ کا سراغ بھی ملنے لگا اور کربِ حاضر و موجود کی ترجمانی بھی ہونے لگی۔ فکر و احساس کے ایسے نئے چلن عام ہوئے جن کے زیرِ اثر ماضی سے روشنی لینے اور اپنی ادبی اور تہذیبی روایات سے از سرِ نو رشتہ جوڑنے کی اہمیت اجاگر ہوئی۔ دیکھتے دیکھتے لاہور میں ادیبوں اور مصوروں کا ایک گروہ وجود میں آ گیا۔ ناصر کاظمی، انتظار حسین، حنیف رامے، شاکر علی، اور دوسرے بہت سے یاروں کی اس منڈلی نے خود کو کسی باقاعدہ تنظیمی جھنجھٹ میں الجھانے اور ادیبوں کے کسی دوسرے گروہ کے خلاف سیاسی محاذ آرائی کا ٹنٹا پالنے کی بجائے مل بیٹھ کر اپنے اپنے تخلیقی کرب پر بلند آواز میں سوچنا شروع کیا۔ ایک دوسرے کی تخلیقی مہم سے بصیرت اندوز ہونے کے جذبے سے ان لوگوں نے ماضی کی معنویت، روایت کے تصور اور فن اور فطرت کے ربطِ باہم پر خوب باتیں کیں۔

نئی نسل کے ان مکالمات سے سوچنے اور محسوس کرنے کا ایک نیا انداز پھوٹا۔ ماضی کی نئی معنویت نے ادب میں ہم عصریت کا مفہوم ہی بدل ڈالا۔ اب میرؔ اور نظیرؔ ان لوگوں کے ہم عصر ٹھہرے تو مغربی طرزِ احساس کے علمبردار ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے معاصرین اجنبی قرار پائے۔ روایت سے بغاوت کی بجائے روایت کو خون میں حل کرنے کا عمل شروع ہوا دینی تجربے و تفکر کی روایت اور ادبی روایت کے باہمی رشتے کی چھان پھٹک شروع ہوئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ روایت کا وہ ہمہ گیر تصور سامنے آیا جس کی بدولت مختلف اصنافِ ادب ہی نہیں بلکہ مختلف فنونِ لطیفہ کی سرحدیں ٹوٹنے لگیں۔ شاکر علی کی مصوری نے ناصر کاظمی اور صفدر میرؔ کی شاعری سے رشتہ جوڑا تو شاکر علی تجریدی مصوری نے ادب میں تجریدی اور علامتی انداز آزمانے کی فضا پیدا کی اور حنیف رامے نے تجریدی مصوری کو اپنے مذہبی اور ادبی تجربے کی روشنی میں خطاطی بنا دیا۔

ادھر تلاش کے اس عمل نے برگ و بار لانا شروع کیا اور ادھر پوری قوم ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی صد سالہ

[1] ہمارے عہد کا ادب، از انتظار حسین مطبوعہ سویرا۔ لاہور،

یادگار منانے کی تیاریاں کرنے لگی۔ احمد ندیم قاسمی کی ادارت میں "امروز" اور سبطِ حسن کی ادارت میں "لیل و نہار" کے جنگِ آزادی نمبر یادگاری دستاویزات ہیں۔ مگر ناصر کاظمی اور انتظار حسین کی ادارت میں خیال کا سن ستاون نمبر فکر و احساس کی ایک نئی نہج کا نمائندہ ہے۔ سیاست، تاریخ اور ادب کو یوں باہم شیر و شکر کیا گیا ہے۔

"سن ستاون ماضی کی خوشبو سے لدا پھندا چڑھا ہے۔ ہماری زندگی میں بہت دنوں بعد یہ وقت آیا ہے کہ ماضی یوں سیلاب کی طرح حاضر میں در آئے جب کوئی سیاست تاریخ بن جائے۔ اس کے ارد گرد کہانیوں اور گیتوں کا جال بن جانے اور پھر وہ کسی خاص مرحلہ پر پہنچ کر شدت سے پورے سماج کے دل و دماغ پر منڈلانے لگے تو ادیب اس سے کیسے آنکھ چرائے گا۔۔۔۔۔۔

مؤرخ اور ادیب میں یہی فرق ہے کہ وہ ماضی کو ماضی میں رکھ کر دیکھتا ہے اور ادیب اسے حاضر میں پیوست کر کے دیکھتا ہے۔ مؤرخ کے لئے واقعہ محض واقعہ ہے اس کے گرد منڈلاتی ہوئی کہانیاں اور توہمات اس کے لئے قابلِ قبول نہیں ہوتے۔ ادیب واقعہ کو واقعہ پر ختم نہیں سمجھتا۔ اس نے جو کہانیاں پیدا ہوئیں، جو قصے چلے، جن توہمات نے جنم لیا جو تاریخیں مبارک اور نحس بنیں، ان سب کو واقعہ کا حصہ سمجھتا ہے۔۔۔۔ ہم معرکۂ ستاون پر کیا غور کرتے ہیں۔ اپنی کھوئی ہوئی روح کو ٹٹولتے ہیں۔[1]"

اپنی تاریخ سے اس تخلیقی شغف نے نئے طرزِ احساس کو ایک نئی پہنائی بخشی۔ چنانچہ جنگِ آزادی کے موضوع پر انتظار حسین کی داستان "جل گرجے" اور صفدر میر کی تمثیل ماضی سے آگے میں ایک نیا تاریخی احساس جلوہ گر ہے۔ قومی و ملی تاریخ کے حوالے سے اپنی کھوئی ہوئی روح کو ڈھونڈنے اور اسے اپنے زمانے میں سرگرم عمل کرنے کے اس جذبے کو ۶ ستمبر کے معرکۂ لاہور نے آن کی آن میں عام کر دیا۔ حمد، نعت اور سلام کی سی متروک اصناف میں عصری شعور کی ترجمانی ہونے لگی۔ مصوری کی اقلیم میں خطاطی کا پرچم بلند ہوا اور فیض سے لے کر فراز تک کتنے ہی ترقی پسند شاعر اسلام کے انقلابی کردار سے اکتسابِ نور کرنے لگے۔ حنیف رامے کے لفظوں میں یوں محسوس ہوا کہ "اقبال ہمارے گرم لہو میں بول رہا ہے"۔ اقبال جس نے مسلمانوں کے کلچر پر اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے وحی، فطرت اور تاریخ کو انسانی علم کے تین سرچشمے قرار دیا تھا مگر جس کی فکر سے انحراف کرتے ہوئے ۱۹۳۶ء کی ادبی تحریکیں مارکس اور فرائیڈ کی تقلید پہ کمر بستہ ہوئی تھیں۔ گویا فکرِ اقبال کی نفی سے نئے ادب کا جو سفر شروع ہوا تھا وہ بالآخر فکرِ اقبال کے اثبات پر اتمام ہوا۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو مغربی طرزِ احساس کو رد کر کے اپنی کھوئی ہوئی روح کی جستجو اور اپنی آتشِ رفتہ کا سراغ پانے کی تڑپ کا نام نیا طرزِ احساس ہے۔ کسے خبر تھی کہ آج سے تیس برس پہلے لاہور کے چائے خانوں میں رتجگا کرنے والے چند نوجوانوں کی تخلیقی بے چینی سے پھوٹنے والا طرزِ احساس ایک روز ہمارے عہد کا غالب طرزِ احساس بن جائے گا؟

---

[1] خیال کا الاؤ۔ از۔ ناصر کاظمی، انتظار حسین۔ خیال لاہور، سن ستاون نمبر

ڈاکٹر سلیم اختر

اردو ادب میں نفسیاتی تنقید کی اولین مثال

"میرے اس خط اور دوسرے خطوں کا جو اس کے بعد لکھے جائیں گے۔ یہ منشا ہوگا کہ علمِ شعر کی ان خوبیوں کو جنہیں اردو زبان کی شاعری ڈھونڈ رہی ہے حتی الوسع بیان کروں مگر سخت مشکل یہ ہے کہ ان امور کو سمجھنے کے لئے جنہیں میں ذکر کیا چاہتا ہوں، مادی اور مسائل علم النفس سے واقف ہونا بہت ضروری ہے۔ اور اس علم کی کوئی کتاب بالفعل زبان اردو میں نہیں ہے۔ میں نے ایک رسالہ خاص اس علم میں تصنیف کیا ہے مگر وہ چھپا نہیں اور اگر چھپے بھی تو اصطلاحات علمی کی فہم سے اکثر اذہان قاصر رہیں۔"

کیا اس عبارت سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کا لکھنے والا امراؤ جان ادا ایسے ناول کا مصنف مرزا محمد ہادی رسوا ہے۔ اردو میں ہادی رسوا اپنے اس عہد آفرین ناول کی بنا پر شہرتِ دوام پا چکے ہیں لیکن یہ مرزا رسوا کی بے چین تجربہ پسند اور جدت کی رسیا شخصیت کے اظہار کا صرف ایک پہلو ہے۔ وہ مرزا رسوا جس نے کیمیاگری سے لے کر شارٹ ہینڈ کے اشارات اور اردو ٹائپ رائٹر کا KEY BOARD بنانے تک کیا کچھ نہیں کیا۔ مرزا رسوا فلسفیانہ ذہن رکھتے تھے بلکہ ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر امریکہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔

انہوں نے نفسیات کی جو کتابیں ترجمہ کی ہیں ان سے بھی ان کی نفسیات دانی اور مطالعہ کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اس مطالعہ نے انہیں وہ نفسیاتی سوچ عطا کی جس کی روشنی میں انہوں نے اردو شاعری سے وابستہ بعض مسائل کو علم النفس کی روشنی میں باندازِ نو تشریح و تفہیم کی سعی کی۔ مرزا رسوا نے رسالہ 'معیار' لکھنو کے لئے پانچ تنقیدی مضامین بطرز مراسلات قلم بند کئے جو بعد میں رسالہ 'زمانہ' کانپور میں بھی طبع ہوئے اور جنہیں ڈاکٹر محمد حسن نے مرتب کر کے کتابی صورت میں طبع کیا۔ ان تنقیدی مراسلات سے نہ صرف یہ کہ مرزا رسوا کی علمی شخصیت کا ایک نیا پہلو نمایاں ہوتا ہے بلکہ اردو تنقید میں نفسیات کے اثرات کی قدیم ترین مثال کا سراغ بھی مل جاتا ہے اور اسی بنا پر انہیں بلاشبہ اردو کا پہلا نفسیاتی

نقاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایسا نقاد جس نے اپنے دور کے محدود علم النفس اور ملک میں اس کے محدود تر مطالعہ کے باوجود اردو شاعری کی تنقید کی بعض اصولی بحثوں میں اسے کامیابی سے برتا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے بھی کتاب کے پیشِ لفظ میں یہی دعویٰ کیا ہے :"

مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات علم النفس کی جدید معلومات کی روشنی میں ادب اور اس کے اجزا کو سمجھنے کی پہلی کوشش کہے جا سکتے ہیں۔ ان میں بصیرت بھی ہے اور ندرت بھی۔ اس اعتبار سے مرزا رسوا اپنے اکثر معاصرین سے کہیں زیادہ جدید ہیں۔ ان کا زاویۂ نظر بعض حیثیتوں سے کہیں زیادہ جامع ہے[۱]۔

مرزا رسوا کی تنقید کے ضمن میں یہ امر واضح رہے کہ وہ حالی اور شبلی کے معاصرین میں سے تھے۔ اس لئے سرسید تحریک کے زیرِ اثر ملک میں انگریزی تعلیم اور اس کی وساطت سے افکارِ نو کے جو چراغ جل رہے تھے رسوا بھی ان سے بہرہ ور تھے۔ پھر وہ رشید احمد صدیقی کے بقول لکھنو کے تھے جو قدیم سے جدید کی طرف آنے پر سب سے کم تیار تھا۔۔۔۔ اس سے رسوا کی سال اندیشی اور وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے[۲]۔

مثلاً ڈاکٹر میمونہ انصاری نے رسوا پر لکھے گئے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے "مرزا محمد ہادی رسوا" میں بحیثیت ناقد رسوا کا خصوصی مطالعہ نہ کیا۔ حالانکہ مختلف ناولوں جیسے شریف زادہ، افشائے راز اور ذات شریف کے دیباچوں میں رسوا نے اپنے ناول یا ناول کی فنی حیثیت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ان سے تو باضابطہ طور پر مرزا رسوا کا نظریہ ناول نگاری مرتب کیا جا سکتا ہے۔ (مزید تفصیلات کے لئے راقم کا مقالہ "مرزا رسوا کا نظریہ ناول نگاری" "نگاہ اور نقطے" میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے) یہ تنقیدی مراسلات ان کی تنقیدی صلاحیتوں کا ایک روشن پہلو سامنے لاتے ہیں۔ ان کی اہمیت رشید احمد صدیقی نے ان الفاظ میں واضح کی ہے۔

"فن شاعری کے جو نکات رسوا نے بیان کئے ہیں وہ حالی کے یہاں بھی ملتے ہیں لیکن رسوا نے ان کی وضاحت جس طور پر کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ شاعری کے علاوہ دیگر علوم پر بھی ان کی گرفت کتنی مضبوط تھی[۳]۔"

اور کتاب کے مرتب ڈاکٹر محمد حسن کے الفاظ میں :۔

"مرزا نے نہ کوئی دیوان مرتب کیا نہ ان کی تنقید کی کوئی کتاب ہمارے پاس پہنچی تھی لیکن یہ چند مراسلات البتہ خاصے کی چیز ہیں۔ یہ تنقیدی مقالات اردو تنقید کی دنیا میں آج بھی ایک نئی آواز ہیں۔ یہ آواز آوازِ بازگشت نہیں۔ اس میں نئے دور کی بصیرت ہے۔۔۔۔ مرزا رسوا کے تنقیدی مقالات کا زاویۂ نظر جدا گانہ ہے۔ ہمارے عظیم تر نقادوں نے بھی ادبیات اور جمالیات کے بنیادی رشتوں پر غور کرنے کی زحمت بہت کم گوارا کی ہے۔ اس لحاظ سے ان کے اپنے میدان میں ان کی کوئی نظیر نہیں۔ وہ اس طرز کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی[۴]۔"

۱۔ مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات ص ۷ ۔ ۲۔ ایضاً ص الف ۔ ۳۔ مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات ۔ صفحہ ج ۔ ۴۔ ایضاً ص ۶-۷

"مرقع لیلیٰ مجنوں"[1] کے دیباچہ میں مرزا رسوا کی جن کتابوں کی فہرست درج ہے۔ اس میں ایک کتاب "اتشہاد فی توجیہ الاشعار" کا نام بھی ملتا ہے جو تنقید شعر پر ہے لیکن یہ کتاب دستیاب نہیں۔ مرزا رسوا کی ترجمہ کردہ نفسیاتی کتاب کی فہرست سے ان کی نفسیات دانی کا باآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور اس عہد کی ذہنی سطح کے لحاظ سے نفسیات کا یہ مطالعہ بے حد دقیع قرار پاتا ہے اس بنا پر اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ جب وہ اپنی تنقید میں نفسیات — جسے وہ علم النفس کہنا پسند کرتے ہیں کی بات کرتے ہیں تو یہ محض چند نئی اصطلاحات کو اپنی تنقید میں کلی پھندنوں کی طرح ٹانکنے والی بات نہیں بلکہ اس کے پیچھے باضابطہ مطالعہ کی آگاہی نظر آتی ہے جہاں تک مرزا رسوا کی نفسیات دانی کا تعلق ہے تو گو فرائیڈ یا اس کے لاشعور کا انہوں نے کہیں ذکر نہیں کیا لیکن بقول ڈاکٹر محمد حسن "توہمات" خواب فی النوم اور جنون انسانی ذہن کے ان چار غیر طبعی درجات کا ذکر مرزا نے کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا فن کو محض شعور کا کرشمہ ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس میں انسانی ذہن کے ان گوشوں کی کارفرمائی پر بھی نظر رکھنا چاہتے تھے جو شعور کی قلمرو سے باہر ہیں — مرزا نے کہیں لاشعور اور تحت الشعور کی اصطلاحیں استعمال نہیں کیں لیکن انسانی ذہن کے ان غیر طبعی درجات کا ذکر ماورا شعور سے ان کی دلچسپی کی غمازی کرتا ہے۔ مرزا رسوا نے ایک موقعہ پر ارتفاع الم کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔ ویسے ارتفاع کا یہ استعمال فرائیڈ میں نہیں ہے۔ اسی طرح انہوں نے تلازم خیالات سے گہری واقفیت کا ثبوت دیا ہے جسے وہ لزوم ذہنی کا قانون کہتے ہیں۔ اور اس کی روشنی میں انہوں نے احساس جسے "حاسہ" کہتے ہیں کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ بچوں کے کھیل اور تخلیق کی لطافت دونوں کے نفسی عوامل اور محرکات کی یکسانیت کو جدید نفسیاتی تحقیقات سے جس طرح اجاگر کیا ہے اب اس کی بطور خاص صراحت کی ضرورت نہیں ہے۔ مرزا رسوا بھی بچوں کے کھیل کی نفسیاتی اہمیت سے آگاہ تھے اس حد تک کہ فنون لطیفہ کو اس کے ارتقائی روپ میں دیکھتے ہیں چنانچہ ان کے بقول

"ممکن ہے کہ امر جمیل نافع بھی ہو تو یعنی کسی غرض ادنےٰ یا اعلےٰ سے اس کا حصول مطلوب ہو مگر جس حیثیت سے کہ وہ واسطہ کی غرض کا ہے۔ اس حد میں داخل نہیں۔ مرغوب لذات کی بہت عمدہ مثال بچوں کے کھیل سے مل سکتی ہے اس لئے کہ ان کی کوئی غرض نہیں ہوا کرتی۔ یہی کھیل کا شوق جو بچوں میں پایا جاتا ہے ترقی کرتے کرتے اس حد تک پہنچ گیا جس سے بت تراشی، مصوری، طراحی، موسیقی، شعر ایسے ایسے فنون لطیفہ نکل آئے ہیں بچوں کے کھیل اور کھلونے بہت ہی سیدھے سادے ہوتے ہیں اور بوڑھوں نے اپنے کھیلوں میں طرح طرح کی پیچیدگیاں اور لطافتیں پیدا کر لی ہیں چشم حقیقت بین کے نزدیک اصل دونوں کی ایک ہی ہے (ص ۴۸)

ہماری کلاسیکی شاعری میں صنعتوں کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہزاروں لوگ صرف اس کے سر پہ شاعر بن گئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ قدیم شاعری کی اساس علم بیان پر استوار تھی تو یہ ایسا کچھ غلط بھی نہ

---

[1] مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات ص ۲۱۶ [2] ایضاً ص ۹۱ [3] ایضاً ص ۴۳

ہوگا۔ مرزا رسوا نے پہلی مرتبہ صنائع بدائع اور علم بیان کا مطالعہ نفسیات کی روشنی میں کرتے ہوئے ان سے وابستہ فنی مباحث کو ایک نئی جہت سے ہم کنار کیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

استعارہ، مجاز مرسل، کنایہ، صنائع بدائع معنویہ و لفظیہ یہ سب کیوں باعثِ لذت ہوتے ہیں؟ اس مسئلہ کا جواب ہم کو علم النفس سے مل سکتا ہے (ص ۶۱)

مرزا رسوا کی دانست میں تنقید وغیرہ کی صورت میں سوچنے اور سمجھنے کے لئے ذہن جو قوت بروئے کار لاتا ہے وہی اخذِ لذت کا باعث بنتی ہے۔ سوان کے بقول — "ان امور میں صرفِ قوت باعثِ لذت ہے" اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

تشبیہات غریب و بعید کے سننے کے بعد سامع کو قوتِ فکر کے استعمال کا موقع ملتا ہے اور یہی موجبِ لذت ہوتا ہے۔ تشبیہ کی ندرت ایک استعجاب خاص کا باعث ہوتی ہے اور استعجاب خود ایک فضیلت دماغی کا نام ہے کیونکہ اس صورت میں دماغ کے ان مرکزوں تک اثر پہنچتا ہے جو ایک مدت سے بیکار پڑے تھے۔"

مرزا رسوا کے خیال میں نادر اور خوبصورت تشبیہوں کے برعکس تشبیہات غریب و مبتذل میں نہ استعمالِ قوت کا موقع ملتا ہے نہ ہی وہ باعثِ استعجاب ہیں اس لئے ان میں کسی قسم کی لذت نہیں ہے۔"

علم بیان کو جس طرح مرزا رسوا نے سمجھا ہے یہ بالکل ایک نئی بات ہے۔ مندرجہ بالا اقتباسات سے علم بیان کی روایتی بحثوں کا تضاد دور کرنے پر مرزا کی ژرف نگاہی واضح ہو جاتی ہے۔

تشبیہ وغیرہ کے ضمن میں ذہنی کارکردگی کو معیار بنانا علم بیان کے مباحث پر ایک نئے زاویئے سے روشنی ڈالنے کے مترادف ہے۔ ویسے ایک بات ہے کہ مرزا نے اعمال ذہنی کے اس تصور کو زیادہ پھیلانے کی کوشش نہ کی کیونکہ انہوں نے ان سے وابستہ اصلی توانائی کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ مرزا رسوا ذہن اور اعصاب کے تعلق سے آگاہ تھے، ان کے بقول:۔

علم نفس میں ثابت ہو چکا ہے کہ واقعی لذت اور الم سے جو اعصاب متاثر ہوتے ہیں وہی اعصاب ان کے تخیل سے بھی متاثر ہوتے ہیں اگرچہ واقعی تحریک، تحریکِ تخیلی سے باعتبار قوت کے بہت ہی ضعیف ہوتی ہے۔

مرزا رسوا نے قوت کی وضاحت نہیں کی ہے۔ شاید قوت سے ان کی مراد اعصابی توانائی ہی ہو گو انہوں نے اس کا بطور خاص تذکرہ نہ کیا لیکن اتنا ضرور کہتے ہیں۔

"دماغ کے پردے بہت ہی نازک ہیں ان کی لذت کے لئے نازک خیالوں کی ضرورت ہے — نازک خیالی اور دقتِ مضمون دو امر جدا گانہ ہیں۔ آنکھ کے دھوکے سے دوسرے کو اختیار کر لینا بڑی غلطی ہے۔

اس معیار پر غالب کے ابتدائی دور اور بعد کے کلام کو اگر پرکھا جائے تو نازک خیالی اور دقتِ مضمون کا

فرق واضح ہو سکتا ہے۔

محرومی یا کسی طرح کی خامی کے احساس سے جنم لینے والے خواب بیداری یا فینٹسی کا تخلیق سے جو گہرا تعلق ہے فرائڈ اور ایڈلر سے لے کر اب تک مختلف لکھنے والے اس کی اہمیت اجاگر کرتے چلے آئے ہیں۔ مرزا رسوا نے خواب بیداری یا فینٹسی جیسی تحلیل نفسی کی اصطلاحات تو استعمال کیں لیکن وہ تخلیقی زندگی میں بطور ایک قوی محرک ان کی آگہی رکھتے تھے چنانچہ والٹر اسکاٹ کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

ایسا شخص جس کے نفس پر ہول اور دہشت کا تصور ہوتا رہتا ہے اور وہ عالم خیال میں بسبب اپنی ذاتی شجاعت یا بسبب اس جوش کے جو شجاعانہ انداز کے تاریخی واقعات پر نظر کرنے اور ان مقامات کے دیکھنے سے جہاں جدال وقتال واقع ہوتے ہوں پیدا ہو جاتا ہے۔ مقابلہ کرتا رہتا ہے۔ اگر وہ شاعر ہے تو رزمیہ اشعار خوب کہے گا اور یہی حال اسکاٹ کا ہوا۔

اسی طرح فردوسی اور سعدی وغیرہ کے حالات کی روشنی میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا تعین کیا گیا ہے۔ مرزا رسوا شاعر کی ذاتی زندگی، تجربات اور اس کی تخلیقات میں گہرے رابطے کے قائل ہیں۔ گو وہ یہ کہتے ہیں۔ ذاتی تجربے کو اس ضمن میں بہت کچھ دخل ہے۔

لیکن انہوں نے بطور خاص اس کی نفسیاتی اہمیت اجاگر کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ مرزا رسوا کے یہ پانچ تنقیدی مراسلات محض اس بنا پر اہم نہیں کہ اس میں انہوں نے سب سے پہلے علم النفس کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ہو سکتا ہے کل کو کوئی ایسا مضمون دریافت ہو جائے جس میں ان سے بھی پہلے اور کسی نے یہ اصطلاح استعمال کی ہو رسوا کی اہمیت اس امر میں مضمر ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے نفسیاتی مباحث کی روشنی میں اردو شاعری اور اس سے مخصوص فنی مباحث کی تفہیم نو کی سعی کی۔ آج کے باضابطہ نفسیاتی علم کے مقابلے میں رسوا کے خیالات میں شاید اتنی گہرائی یا انوکھا پن نظر آئے۔ اسی طرح بعض اوقات یہ محض اشارات معلوم ہوتے ہیں لیکن ان سب کے باوجود یہ کیا کم ہے کہ امراؤ جان ادا لکھنے والا نفسیاتی شعور سے اپنی تنقید کا چراغ بھی ضرور فروزاں کر رہا تھا!

منصور قیصر

ادب کا سماجی عمل

میں پاسپورٹ بنوانے کے لئے گیا تو پیشے کے خانے میں رائٹر لکھا دیکھ کر متعلقہ افسر نے پاسپورٹ فارم لوٹاتے ہوئے مجھ سے کہا " اس خانے میں اپنا اصل پیشہ لکھئے ۔ رائٹری تو کوئی پروفیشن نہیں " میں نے عرض کیا " جناب میں قلم کے ذریعے ہی رزق حلال کماتا ہوں یہی میرا پروفیشن ہے "

متعلقہ افسر نے کچھ ناراض لہجے میں فرمایا " ہمارے پاس جو لسٹ ہے اس میں یہ پروفیشن کہیں درج نہیں ۔ اگر آپ واقعی پاسپورٹ بنوانا چاہتے ہیں تو پھر اپنا اصلی پیشہ لکھئے "

ان کی یہ بات سن کر میں نے جھنجلا کر جواب دیا " جی میں بالٹیوں کے پیندے لگاتا ہوں "

" یہ ہوئی ناکھندے کے پتھروں والی بات " موصوف گویا ہوئے اور مجھ سے فارم لے کر اس پر دینے ہاتھ سے " بکٹ سیکر " لکھ دیا پھر مجھے تلقین کرتے ہوئے فرمانے لگے " آپ شکل سے تو بھلے مانس نظر آتے ہیں آپ رائٹری وائٹری کے کس چکر میں پڑ گئے اس زمانے میں لٹریچر کو کون پوچھتا ہے آپ پاسپورٹ بنوایئے اور سیدھا دوبئی جایئے وہاں بالٹیوں کے پیندے لگانے والوں کی بڑی مانگ ہے ۔

اچانک میری نظر ان کی ٹیبل پر پڑی وہاں ایک ناول رکھا ہوا تھا میں نے جونہی پوچھا " یہ کس کے لئے ہے " موصوف نے ناول کو ٹیبل کی دراز میں رکھتے ہوئے کھسیانی ہنسی سے جواب دیا " ہماری بیٹی کے لئے ہے اسے سبق آموز ناول پڑھنے کا بہت شوق ہے "

" اسی لئے مجھے ایسے لوگ دوبئی نہیں جاتے اگر وہ چلے گئے تو پھر سبق آموز ناول کون لکھے گا " اور میں ان کا جواب سنے بغیر لوٹ آیا کیونکہ میں کسی ایسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا کہ سبق آموز سے موصوف کی مراد کیا ہے ۔

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ میرا ایک پرانا دوست جو ایک تعمیراتی کمپنی میں ایگزیکٹو انجینئر ہے کسی دفتری کام کے سلسلے میں اسلام آباد تو آیا تو ایک روز کے لئے میرے ہاں بھی ٹھہرا ۔ میں نے اسے اپنی لائبریری دکھائی تو اس نے جس ردعمل کا اظہار کیا وہ میرے لئے خاصا حوصلہ شکن تھا ۔ میں کھڑے کھڑے جو تقریر اس نے جھاڑی اس کا حاصل صرف یہ تھا کہ اگر کتابوں کی جگہ یہاں اینٹیں پڑی ہوتیں تو کم از کم ان سے غسل خانہ تو تعمیر ہو جاتا اور اگر ان کتابوں کی قیمت کے مساوی رقم کا سیمنٹ سریا خریدا ہوتا تو اس سے ڈرائنگ روم ضرور تیار ہو جاتا ۔

رات کو سونے سے پہلے میرے اسی دوست نے پوچھا "کوئی خواب آور گولیاں ہوں گی۔ مجھے ان کے بغیر نیند نہیں آتی۔"

میں نے اس کی صبح والی تقریر کا بدلہ لیتے ہوئے طنزاً کہا "بس تمہاری طرح شب و روز دولت کے بارے میں نہیں سوچتا اسی لئے اعصاب کشیدہ نہیں ہوں لہٰذا خواب آور دوائیوں سے محروم ہوں۔"

وہ کچھ دیر گومگو کی حالت میں رہا اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑ رہا تھا میں نے اس کی توجہ ہٹانے کے لئے چین کے پہلے جدید افسانہ نگار لوہون کے افسانوں کا ایک انتخاب اسے تھماتے ہوئے کہا "اسے پڑھو نیند خود بخود آجائے گی۔"

صبح ناشتے کے وقت میں اپنے دوست کی شکل دیکھ کر گھبرا گیا اس کی آنکھوں سے ویرانی کے سائے جھانک رہے تھے یوں لگتا تھا جیسے کسی پشیمانی کی ابابیلیں ساری رات اس کا منہ نوچتی رہی ہوں میں نے بے چینی کا سبب پوچھا تو وہ خوفزدہ لہجے میں بولا۔

"میں ابھی کراچی جا رہا ہوں بزنس جائے جہنم میں" میں نے سمجھا شاید مجھ سے کوئی گستاخی ہو گئی ہے میرے بولنے سے پہلے وہ گویا ہوا "تم نے جو کتاب دی تھی اس کی پہلی کہانی "دیوانے کی ڈائری" نے مجھے تلپٹ کر کے رکھ دیا میں ایک لمحہ نہیں سو سکا۔ یوں محسوس ہوتا رہا جیسے میرے جسم پر دو سوسوں کی چیونٹیاں رینگتی رہی ہوں میرے منہ کا ذائقہ یوں ہو گیا جیسے میں نے بھائی کا گوشت کھا لیا ہو میں تمہاری وہ کتاب ساتھ لئے جا رہا ہوں۔"

"دیوانے کی ڈائری" اصل میں لوہون کی ایک ایسی کہانی ہے جس میں ایک بیمار نوجوان کو دیوانہ سمجھ کر اہل خانہ نے اسے نظر انداز کیا ہوا ہے لوگوں کی لاتعلقی کے سبب اس نوجوان کو سب لوگ دنیاوی اغراض کے کیچڑ میں پھنسے ہوئے یوں نظر آتے ہیں جیسے سب کے سب آدم خور ہوں یہاں تک کہ اس کا سگا بھائی بھی اس کا گوشت کھانے کے درپے ہے۔

درحقیقت میرے اس دوست کو لوہون کے دیوانے کے روپ میں اپنا وہ چھوٹا بھائی یاد آ گیا جو دو سال سے ایک دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل ہے لیکن وہ خود اپنی کاروباری مصروفیت کے باعث ایک دن بھی اس کی عیادت نہیں کر سکا تھا۔

پاسپورٹ افسر ہو یا میرا مذکورہ دوست دونوں کے بنیادی سماجی رویے میں کوئی فرق نہیں اس لئے کہ وہ دونوں ایک ایسے سماج میں رہ رہے ہیں جہاں روپیہ ایک ایسی طاقت و قدر ہے جس نے دیگر انسانی قدروں کو پسپا کر رکھا ہے۔ یہ دونوں کردار اگرچہ ایک دوسرے سے یا کسی اور سے رسماً متعارف ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ ایسے سب لوگوں کی قدر مشترک یہ ہے کہ وہ انسان کی توقیر اس کے توکل اور نیکی سے نہیں بلکہ دنیاوی سٹیٹس کے حوالے سے کرتے ہیں۔ لیکن وہ چونکہ خود گوشت پوست کے بنے ہوئے ہیں اور موت کا بھی لاشعور میں ایک خوف ہے اس لئے ان کے دلوں کے نہاں خانوں میں ایسی چنگاریاں بھی موجود ہوتی ہیں جو جذبات اور تفکر کے معمولی جھونکوں سے بھی بھڑک اٹھتی ہیں کبھی بیٹی کے لئے سبق آموز ناول کی شکل میں اور کبھی لوہون کے دیوانے کے روپ میں

پس ادب کا سماجی عمل بھی یہی ہے کہ وہ تخلیقی سطح پر ایسی باد نسیم چلاتا رہے جس سے دنیا داری کی راکھ میں دبی ہوئی

صداقتوں، روحانی قدروں اور انسانی رشتوں کی چنگاریاں روشن ہو سکیں تاکہ سماج میں خیر اور شر کی تمیز پیدا ہو سکے ژاں پال سارتر نے کہا تھا کہ ادب کا بنیادی کام صرف یہ ہے کہ وہ انسانوں میں چھپی ہوئی ہر بات کو ظاہر میں لے آئے ایذرا پاؤنڈ نے ادب کے سماجی کردار کو اس حوالے سے دیکھا تھا کہ ادب کا کام ایک غیر محسوساتی عمل کو جاری رکھنا ہے کبھی ٹھوس صورتِ حال سے مابعد الطبیعات کی طرف اور کبھی مابعد الطبیعات سے ٹھوس صورتِ حال کی طرف۔

ژاں پال سارتر نے اور خالص ادب کی پرکھ کے لئے جو کسوٹی مقرر کرتا ہے وہ کچھ یوں ہے کہ "داخلیت جو ایک طرح کی خارجیت کی جلو میں آئے تقریر ایک ایسے انداز سے مرتب ہو کہ اس پر خاموشی کا گمان ہو خیال ایسا کہ اپنے آپ پر حیران ہو عقل ایسی کہ اس نے جنون کا لبادہ اوڑھ رکھا ہو ابد ایسا کہ تاریخ کا ایک لمحہ معلوم ہو اور تاریخ کا ایک لمحہ ایسا جو اپنی راہوں سے انسان کو ابد کی طرف موڑ دے"

جب یہ کہا جاتا ہے کہ تخلیقی ادب اپنا خام مواد ان تفاوات سے حاصل کرتا ہے جو سماج میں عمل پیرا ہوتے ہیں تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ادیب کا رویہ منفی ہوتا ہے یا وہ کسی نہ کسی شکل میں سماجی تفاوات کی حمایت کرکے ان سے تلذذ اخذ کرتا ہے۔ حقیقت میں ادیب تو اپنی اردگرد پھیلی ہوئی بدصورتیوں، منافقتوں، بے روح، قدروں اور بے حس رشتوں کے خلاف ردعمل کا اظہار کرتا ہے کیونکہ بنیادی طور پر وہ معاشرے میں حُسنِ خیر، انصاف اور صداقت کا متلاشی ہے وہ تو تضادات کا خاتمہ چاہتا ہے منیر نیازی کا ایک شعر ہے

ایک نگر کا نقش جلا دوں، ایک نگر ایجاد کروں
ایک طرف خاموش کر دوں، ایک طرف آباد کروں

پاکستانی قلم کار بھی یقیناً انہیں تفاوات میں جی رہا ہے جو اس کے سماج نے اسے ورثے میں دیئے ہیں لیکن وہ اس لحاظ سے دوسرے لوگوں سے مختلف ہے کہ وہ تفاوات کا پچنر بننے کے باوجود ایک مثالی روحانی معاشرے کے خواب دیکھتا ہے اور اس خواب کی تعبیر کے لئے عہد نامہ بھی لکھتا ہوں یوں وہ دوہری سطح پر اپنا کردار ادا کرتا ہے ایک تو سماج کے فرد کی حیثیت سے اور دوسرا ادیب یا شاعر کی حیثیت سے سماج کے ایک رکن کی حیثیت سے اس میں بھی انسانی کمزوریاں ہوتی ہیں اور وہ ان سے کبھی انکاری نہیں ہوتا۔

بعض حلقے ادیب کو کوئی مافوق الفطرت قسم کی مخلوق سمجھتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ ادیب کسی مصلح، کسی معالج یا کسی فرشتے کا کردار ادا کرے ایک بار تو ایک اخبار میں "ادب کے مقاصد" کے عنوان سے کسی بزرگ کا مضمون پڑھ کر میں تو خوفزدہ ہو گیا کیونکہ موصوف نے ادیب سے جو توقعات وابستہ کیں وہ کچھ اس قسم کی تھیں کہ ادیب گھوڑے پر بیٹھ کر ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں پبلک ایڈریس سسٹم تھامے سڑکوں پر نکل آئے اور برائیوں کو یوں مسمار کر دے جیسے طبقاتی اداروں نے تجاوزات مسمار کر دی ہیں یا پھر وہ اپنی تحریروں کو تعویذ کی طرح روح کیوڑہ میں گھول کر بیمار معاشرے کو پلائے اور معاشرہ چشم زدن میں بھلا چنگا ہو جائے۔

اسی طرح بعض با اختیار لوگوں کو بھی ادیبوں کو تلقین کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے کہ ادب ایسا پیدا کرو اور ویسا پیدا کرو

گزارش صرف اتنی ہے کہ پاکستانی ادیب بہت ہی باشعور اور حساس ہے وہ اپنی نظریاتی وجغرافیائی وفاداریوں اور قومی ذمہ داریوں سے بہت زیادہ آگاہ ہے وہ خلوصِ دل سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس قول سے روشنی حاصل کرتا ہے کہ "میں نے اس وقت اپنے فرائض انجام دیئے جب دوسرے اس راہ میں قدم اٹھانے کی جرأت نہیں رکھتے تھے میں اس وقت سر اٹھا کر سامنے آیا جب دوسرے گوشوں میں چھپے ہوئے تھے اس وقت زبان کھولی جب سب گنگ نظر آئے گو میری آواز سب سے دھیمی تھی مگر سبقت و پیش قدمی میں سب سے آگے۔" یہی سبقت و پیش قدمی کرنے والی دھیمی آوازیں سماجی تفاوات کی نشاندہی کرتی ہیں ان راہوں کی نشاندہی کرتی ہیں جو انسانی صداقتوں ابدی روحانی قدروں اور قومی شناخت کی طرف جاتی ہیں لفظوں کو برانہ کہو کہ لفظ تو بے غرضی کی گدڑی پہن کر گلی گلی، کوچہ کوچہ میں ہر ایک کی خیر مانگتے ہیں لفظ اس وقت چپ ہو جاتے ہیں جب انہیں مصلحتوں اور منافقتوں کے جنگل میں دھکیل دیا جائے۔

ادیب یا سماج اور ادیب ایک دوسرے کے لئے لازم وملزم ہیں کہ دونوں کا خمیر ایک ہی مٹی سے اٹھتا ہے اگر سماج ادیب کو اس کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے تو سماج کا بھی فرض ہے کہ وہ ادیب کے حقوق بھی پورے کرے تاکہ پھر کوئی سبق آموز ناول پڑھنے والی بیٹی کا باپ کسی ادیب کو بالیوں کے بندے لگانے کے لئے دوبئی جانے کا مشورہ نہ دے سکے



(ایک تقریب میں)
مجیب الرحمٰن، ابن الحسن، ضمیر جعفری، عطا حسین کلیم، پرتو روہیلہ، رشید قیصرانی
کرنل ... خان، جمیل یوسف، ... اختر، میجر جنرل محمود الحسن

قمر رعینی

اردو رباعی کے چند قابل ذکر شعرا

اس مضمون کی پہلی قسط نیرنگ خیال کے جوبلی نمبر حصہ دوم مطبوعہ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی تھی اس میں یہ وضاحت کر دی گئی تھی کہ اس عنوان سے سلسلہ مضامین کا مقصد محض یہ ہے کہ ایسے رباعی گو شعرا کا تذکرہ ضبط تحریر میں آجائے جن کی رباعیات کے مطبوعہ مجموعے موجود ہیں لیکن رباعی گو شعرا یعنی رباعی کے بارے میں شائع ہونے والی کتابوں میں ان کا تذکرہ نہیں اس کے ساتھ ہی ان شعرا کا بھی تذکرہ ہو جائے جن کی رباعیات کے مجموعے الگ سے شائع نہیں ہوئے لیکن ان کے یہاں کثیر تعداد میں رباعیاں موجود ہیں خواہ یہ رباعیاں ان کے کلیات میں ہوں یا مجموعہ کلام ہنوز تشنۂ طباعت ہو لیکن رسائل میں ان کا کلام اور رباعیات شائع ہوتی رہتی ہوں۔ اس طرح رباعی گو شعرا کا تذکرہ الگ سے تیار ہو جائے گا۔ اس مضمون کی پہلی قسط شائع ہونے کے بعد سے اس موضوع پر کبھی کبھار تلاش و تحریر کا سلسلہ جاری رہا لیکن یہ کام پوری یکسوئی اور بھرپور توجہ چاہتا ہے۔ جو فی الحال ممکن نہیں بہر حال جز وقتی محنت کا جو حاصل ہے وہ حاضر ہے۔ اس مضمون میں رباعی کے بعض ایسے مجموعوں کا تعارف بھی شامل ہے جو حال ہی میں شائع ہوئے۔

پہلی قسط میں جن شعرا کے نام گنوائے تھے کہ ان کا تذکرہ ضروری ہے ان میں سے کچھ کی رباعیات دستیاب ہو گئی ہیں اور کچھ کی کوشش کی جا رہی ہے۔ رباعیات کے سلسلے میں اگر کوئی صاحب میری مزید رہنمائی کر سکیں تو ممنون ہوں گا۔

(قمر رعینی)

جان نثار اختر

جدید شعرا میں جان نثار اختر ایک زندہ و پائندہ نام ہے۔ وہ کلاسیکل شاعری کے مشہور استاد اور نامور باپ حضرت مضطر خیر آبادی کے قابل فخر فرزند تھے۔ ان کی شاعری ان کے نظریے ادب برائے زندگی کی ترجمان ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی، قطعات بھی اور رباعیات بھی اور ہر جگہ انھوں نے اپنے نظریے کا پاس ملحوظ رکھا ان کی رباعیات میں ایسے انسان کے جذبات کی گونج سنائی دیتی ہے جو گوشت پوست کا بنا ہوا ہے صرف ماڈل نہیں ہے

اس کے سینے میں دل ہے جو دھڑکنا بھی ہے اور فطری جذبات و احساسات سے متاثر بھی ہوتا ہے۔
اردو شاعری میں مقامی فضا کو قائم رکھنے کا آغاز نظیر اکبر آبادی نے کیا تھا اور رباعیات میں آنجہانی فراق نے اس کو اپنایا لیکن ان کے یہاں اردو رسم الخط میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کی بھرمار ہے اس بوجھل پن اور ثقالت کی وجہ سے ان کی بہت سی رباعیوں میں وہ روانی اور لطف محسوس نہیں ہوتا جو رباعی کا طرۂ امتیاز ہے۔ البتہ ان کی بیشتر رباعیات ان کے جمالیاتی ذوق کی بہترین عکاس ہیں۔
جاں نثار اختر کی رباعیات ان کے ذوقِ جمال، احساسِ لطیف اور نازک ترین مشاہدات کی بہترین مثال ہیں۔ انھوں نے زندگی اور شریکِ زندگی کا کئی جہت سے مشاہدہ کیا اور انھیں مشاہدوں نے رباعیات کی شکل اختیار کی۔ "گھر آنگن" ان کی ۱۱۶ رباعیات کا مجموعہ ہے جس میں سے کچھ میں مطلع نہیں جنھیں بقول سلیمان ندوی رباعی نما قطعہ یا قطعہ نما رباعی کہہ سکتے ہیں ہر رباعی کا محور گھر آنگن یعنی گھریلو زندگی کے تجربے اور مشاہدے ہیں اور حکاکاتی انداز بیان ہے بعض رباعیوں کو پڑھ کر منظر سامنے آجاتا ہے اور بعض کا اندازِ بیان تیز نشتر کی طرح دل میں اتر جاتا ہے۔ میرے ناقص مطالعے کے مطابق اردو کے وہ پہلے شاعر ہیں جس نے ان جذبات کو شعر کا روپ دیا ہے، جن کا تعلق ہمارا روزمرہ زندگی سے ہے جنھیں ہم سب محسوس کرتے ہیں لیکن آج تک کسی نے بیان نہیں کیا ان کے اظہار میں سادگی بھی ہے اور بے ساختہ پن بھی۔ یہ رباعیاں زندگی کی ترجمان ہیں۔ زندگی آموز بھی اور زندگی افروز بھی۔

ہر حال میں گوری کی ادائیں گونٹیں اس طرح ہنسے انار جیسے چھوٹیں
آنکھیں جو اٹھائے تو کنول کھل جائے آنچل کو جو تانے تو کرنیں پھوٹیں

ہنس دے تو مہکتی ہوئی کیاری بن جائے لہرا کے چلے باد بہاری بن جائے
دیکھو تو لچکتی ہوئی ڈالی جیسے سینے سے لگا لو تو کٹاری بن جائے

ہر ایک گھڑی شاق گزرتی ہوگی سو طرح کے وہم کرکے مرتی ہوگی
گھر جانے کی جلدی تو نہیں ہے مجھ کو "وہ" چائے پہ انتظار کرتی ہوگی

میاں عبدالعزیز خالد

ڈھیر ساری کتابوں کے مصنف اور پاکستان کے نامور شاعر ہیں۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے اعتراف میں پاکستان کے بعض جرائد نے ضخیم صورت میں عبدالعزیز خالد نمبر بھی شائع کیے۔ جن میں ملک بھر کے چوٹی کے لکھنے والوں نے ان کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ سیارہ کے خالد نمبر میں بعض اصحاب نے ان کی شاعری پر اعتراض کرتے ہوئے ان کے یہاں دوراز کار تشبیہ و استعارات اور تلمیحات کے بے دریغ استعمال پر بے فکری۔ بعض مضامین کے لہجے سے تنقیص و انتقام کی بو محسوس ہوتی ہے اور بعض جگہ اعتراضات میں وزن

محسوس ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان کے یہاں تلمیحات کا استعمال حد سے زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن ہم اسے عالمانہ شاعری بھی تو کہہ سکتے ہیں اس لیے کہ ہر شخص اپنے مقام سے بولتا ہے۔ بعض مسلسل نظمیں اپنے تاریخی واقعات و پس منظر کے اعتبار سے ایسے ہی ہیں کہ ان میں متعلقہ تلمیحات کا استعمال ناگزیر ہے اور بعض جگہ ان کا تبحر علمی کارفرما ہے۔ بہر حال یہی چیز جسے آپ چاہیں تو خوبی کہہ لیں چاہیں تو نقص، ان کی رباعیات میں بھی بدرجہ اتم نمایاں ہے۔ "لحن مریر" ان کی تین سو تیرہ رباعیات پر مشتمل ہے اور چند ہی ایسی رباعیات ہیں جو صاف ستھری اردو میں ہیں اور جن میں عربیت اور تلمیحات کا استعمال نہیں ہے اور بعض جگہ ایسا ہے جیسا کہ میں نے کہا کہ آدمی تلمیح کے استعمال پر مجبور ہے۔ مثلاً درج ذیل رباعیات میں سے پہلی رباعی دیکھیے حضورؐ کے ارشاد کو بعینہٖ رباعی کا مصرع بنا دیا ہے۔ حضورؐ نے عربی میں فرمایا تھا کہ میرے بعد اگر کوئی نبی آتا تو عمرؓ ہوتے اس کے لیے عربی کے اصل الفاظ کو استعمال کیا گیا ہے جو لو کان بعدی تھا۔ رباعی کے بعض ایسے مصرعوں کا وزن میری سمجھ نہیں سکا جن میں عربیت کا بوجھ اور میری کم علمی کی وجہ سے ثقالت محسوس ہوئی ممکن ہے کہ یہ مصرعے وزن رباعی میں ہوں۔

بہر حال وہ ایک قادر الکلام اور زود گو شاعر ہیں ان کی چند رباعیاں بطور نمونہ حاضر ہیں۔

منظور و مراد حضرت پیغمبر		ہے اس کی زبان نطق خدائے اکبر
کہتا ہے وہی جو اس کا ہے مرتبہ دان		لو کان نبی بعدی کان عمرؓ

دیں اہل وطن کو درس حب الوطنی		در پردہ وطن کی جو کریں بیخ کنی
اخوان صفا کے محتسب اہل ریا		یہ پستی؟ یہ بلندی؟ اللہ غنی

سراج الدین ظفر

مشہور خاتون افسانہ نگار مسز عبدالقادر کے فرزند تھے ان کے والد کا نام عبدالقادر تھا جو ریلوے میں انجینئر تھے سراج الدین ظفر کا ایک مجموعہ کلام "زمزمہ حیات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس میں قابل ذکر تعداد میں رباعیاں بھی ہیں ان کی رباعیاں ان کی قادر الکلامی کی آئینہ دار ہیں۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر عبدالوحید مصنف تذکرہ شعرائے جدید لکھتے ہیں۔

قطعات اور رباعیوں میں جہاں کوئی ایک خاص بات یا خاص اشارہ کافی ہوتا ہے ظفر صاحب کامیاب ہیں اور ان کا وار ایسا بھرپور ہوتا ہے کہ پڑھنے یا سننے والا پھڑک اٹھتا ہے۔ ان کی رباعیوں میں حسن و عشق، رندی و سرمستی سے لے کر معرفت و عرفان تک کے تمام مضامین پائے جاتے ہیں اور ساتھ ہی اسلوب اتنا دلکش اور زبان برجستہ و ہموار ہے کہ ان کی رباعیوں میں ایک عام اپیل پیدا ہو گئی ہے۔ ص ۱۰۱		(اقتباس)

ان کی چند رباعیات یہ ہیں :-

زندہ ہوں طرب کی دلکشائی کے لیے ۔۔۔ سرسبز ہوں چراغِ پارسائی کے لیے
یہ میرا سبو بکف لرزتا ہوا ہاتھ ۔۔۔ کافی ہے مشیت کی کلائی کے لیے

غنچوں کے سبو تہی کیے جاتا ہوں ۔۔۔ پھولوں کی رگوں سے رس لیے جاتا ہوں
اے خالقِ حسن روک سکتا ہے تو روک ۔۔۔ بہکا کے بہار کو لیے جاتا ہوں

راغب مراد آبادی

اصغر حسین نام راغب تخلص وطن مراد آباد سن پیدائش ۱۹۲۱ء ہے ۱۹۳۲ء سے شعر کہتے ہیں۔ ہر صنف سخن اور مروجہ اور غیر مروجہ بحروں میں طبع آزمائی کی ہے لیکن رباعی سے خاص مناسبت ہے (انھیں کی تحریر سے اقتباس یشعرستان ص۱۵۔
راغب صاحب تقسیم کے بعد پاکستان آگئے اور کراچی میں قیام کیا۔ پاکستان کے مشہور شعرا بلکہ اساتذہ فن میں ان کا شمار ہے۔ ۱۹۴۹ء میں ان کی ایک کتاب "ہمارا کشمیر" شائع ہوا۔ جس میں سیاسی نظمیں اور رباعیات ہیں۔ میں نے یہ کتاب نہیں دیکھی (اور نہ ہی ان کی رباعیات کا کوئی مجموعہ نظر سے گزرا۔ لیکن وہ پاکستان میں غزل کے علاوہ رباعی گو کی حیثیت سے خاصی شہرت کے مالک ہیں اور ان کی رباعیات ملک کے معتدد رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ وہ قابل ذکر رباعی گو شاعر ہیں۔ ان کی رباعیات ۔ان کی کہنہ مشقی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

انساں کی معصوم شباہت پہ نہ جا ۔۔۔ الفاظ کی مرہوم لطافت پہ نہ جا
خوشبو ہے فقط پھولوں کا جوہر راغب ۔۔۔ رنگ اس کا نہ دیکھ اس کی نزاکت پہ نہ جا

کونین کی وسعت پہ نظر رکھتا ہوں ۔۔۔ اسرارِ دو عالم کی خبر رکھتا ہوں
خواہش نہیں کچھ ملک فریدوں کی مجھے ۔۔۔ میں سلطنتِ علم و ہنر رکھتا ہوں

اختر حیدر آبادی

وطن علی گڑھ اور پیدائش رام پور میں ۱۳۱۱ھ میں یہ ہجری سال ۱۵ جولائی ۱۸۹۳ء سے شروع ہو کر ۴ جولائی ۱۸۹۴ء پر ختم ہوا۔ چونکہ قمری مہینے کا نام اور تاریخ درج نہیں ہے اس لیے ٹھیک ٹھیک حساب مشکل ہے۔ آگرہ میں تعلیم پائی تیس برس سے زیادہ حیدر آباد دکن میں "انوار" اور "اسرار" کے نام سے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں (اقتباس شعرستان ص۵)
اس سے زیادہ حالات مجھے معلوم نہیں ہو سکے اور نہ یہ پتہ چل سکا کہ دونوں مجموعوں میں کتنی رباعیات ہیں۔ انھوں نے تذکرۂ شعرستان میں نمونہ کلام کے طور پر پانچ پانچ رباعیات دی ہیں جو سب کی سب قائد اعظم کو خراجِ عقیدت ہیں۔ ان رباعیات کے علاوہ غزل یا نظم کا کوئی شعر نہیں ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں رباعی سے خاص شغف ہے اور انھوں نے

قابلِ ذکر تعداد میں رباعیاں کہی ہوں گی۔ ان کی رباعیات فنی نقائص سے پاک ہیں۔

اس وقت (اگست ۱۹۸۹ء مطابق ۱۴۱۰ھ) اگر وہ بقیدِ حیات ہوں تو ان کی عمر قمری سال کے حساب سے ۹۱ سال بنتی ہے۔ رباعیات یہ ہیں:

پھر تازہ ہوئی قائدِ اعظم کی یاد روشن مری آنکھیں ہیں مرا دل ہے شاد
کس فخر سے کہتے ہیں مرے فکر و عمل کل تک تھے اسیر آج ہوئے ہم آزاد

ذرّوں سے بنا دیئے ستارے تو نے قطروں میں بسا دیئے شرارے تو نے
جو ڈھونڈ رہے تھے رازِ منزل سمجھے جو ڈوب رہے تھے پار اتارے تو نے

سید فیضی

سید فیض الحسن فیضی جالندھر کے رہنے والے ہیں۔ علامہ سیماب اکبر آبادی کے فارغ التحصیل تلامذہ میں ہیں تقسیم ملک کے بعد پاکستان میں اور سرکاری ملازمت سے ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔ ایک مدت سے راولپنڈی میں قیام ہے۔

فیضی صاحب ایک معروف شخصیت ہیں۔ ریڈیو اور ٹی۔وی پر بھی مشاعروں اور تقاریر میں شرکت کرتے رہتے ہیں زبان و بیان کے اعتبار سے وہ ایک پختہ کار شاعر ہیں انھیں اظہارِ مطالب پر مکمل قدرت ہے۔ فنی نقطہ نظر سے استاد ہیں غزل، نظم، قصیدہ، مرثیہ و سلام کے علاوہ رباعی بھی کہتے ہیں اور کوئی شک نہیں کہ خوب کہتے ہیں۔ ان کی نعتوں، منقبتوں اور سلام کا مجموعہ نورِ ظہور کے نام سے غالباً ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا جس میں سوا سو سے زائد رباعیات بھی ہیں اور یہ رباعیات ان کی مشاقی کی دلیل ہے۔ نمونہ رباعیات درج ذیل ہے:

گمراہی کے دور جب بھی سر پر آئے دنیا کی ہدایت کو پیمبر آئے
اس میں بھی تو کوئی مصلحت تھی پنہاں جو سب سے مقدم تھے مؤخر آئے

اللہ کے نبی سے جو شرف یاب ہوئے وہ زیب دہ منبر و محراب ہوئے
اک نور کے پیکر سے وہ کرنیں پھوٹیں ذرّے بھی جو چمکے تو جہاں تاب ہوئے

برج لال جگی رعنا

برج لال جگی رعنا راولپنڈی کے رہنے والے ہیں تقسیم ملک کے بعد وہ دہلی چلے گئے۔ ۱۹۵۱ء میں ان کا مجموعہ کلام "رعنائیاں" شائع ہوا جس کے کچھ حصے میں غزلیں اور نظمیں ہیں باقی قابلِ ذکر حصہ رباعیات پر مشتمل ہے۔ رباعیات کی تعداد ۲۳۲ ہے۔ رباعیات کا انداز بیان سادہ اور عام فہم ہے اور بقول مبصر (ماہنامہ ایوانِ دہلی) کوئی خاص فنی سقم نہیں

پایا جاتا۔ نمونہ رباعیات :

امید کی بھولی سی کہانی ہوں میں اک پیکر آشفتہ بیانی ہوں میں
محروم تمنا ہی رہا دنیا میں شاید کسی مفلس کی جوانی ہوں میں

جو شاخ ہے شمشیر نظر آتی ہے جو موج ہے زنجیر نظر آتی ہے
رعنا مجھے معمورۂ خشک وتر میں بیداد کی تصویر نظر آتی ہے

پروفیسر واقف دہلوی

ان کی طبع زاد رباعیاں نظر سے نہیں گزریں۔ انھوں نے عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ رباعی اور قطعات کی شکل میں کیا جس کی پہلی جلد ۱۹۶۰ء جنوری میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں خیام کی ۱۸۶ رباعیات کا اردو ترجمہ ہے۔ جس میں سے ۴۸ رباعیات ہیں اور باقی قطعات ہیں۔ اس کے بعد اگر دوسری اور تیسری جلد بھی شائع ہوئی ہے۔ تو وہ مجھے نہیں مل سکی۔ کتاب کے پیش لفظ میں واقف نے لکھا ہے کہ یہ پہلی جلد ہے اور آئندہ دو تین جلدوں میں بقیہ سرمایہ حاضر کیا جائے گا اس بیان کی روشنی میں گمان غالب ہے کہ شاید بقیہ جلدیں بھی شائع ہوئی ہوں۔ ان کے بیان کے مطابق انھوں نے تقریباً ساڑھے پانچ سو رباعیات خیام کا ترجمہ کیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ موصوف نے بلاتحقیق ترجمہ کیا ہے۔ اور اس ترجمے میں وہ رباعیات بھی شامل ہیں جو الحاقی ہیں اور نامعلوم وجوہ کی بنا پر خیام سے منسوب ہوگئیں۔ بہرحال یہ الگ بحث ہے جس کا ذکر کسی دوسرے باب میں کیا جارہا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی رباعی کا ہندی ترجمہ اور ساتھ ہی فٹزجیرالڈ کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا ہے۔ واقف کے ترجمے میں وہ بات نہیں ہے جو صفی لکھنوی یا شوکت بلگرامی کے ترجموں میں ہے۔ بالکل روکھا اور محض ترجمہ ہے (اس سلسلے میں میرا مضمون اردو رباعی عہد بہ عہد مطبوعہ فیض الاسلام ۱۹۶۷ء ملاحظہ کریں)۔

ان کی سوانح حیات اس کتاب میں موجود نہیں۔ صرف اتنا لکھا گیا ہے کہ وہ ۱۹۴۳ء میں فلمی دنیا بمبئی سے وابستہ ہوئے تھے اور ۱۹۶۰ء میں پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج دہلی میں ایم اے اردو فارسی کو پڑھاتے تھے۔

امروز کہ نوبت جوانی من است
خیام

ترجمہ
ہے جام سے وابستہ جوانی میری یہ مے ہے کلید کامرانی میری
تم تلخ بتاتے ہو تو کچھ عیب نہیں تلخی تو ہے عین زندگانی میری

خیام چوں لالہ بہ نوروز قدح گیر بدست
نوروز ہے پھولوں کی طرح جام سنبھال حاصل مے و شاہد ہے تو کچھ وقت نکال
کچھ عیش تو کر لے کہ نہیں کل کی خبر کیا ہے غم فردا سے بھٹی میں ڈال

قدسی

سلسلہ ریحانیہ کے ایک مشہور بزرگ جن کے دم قدم سے چکوال ضلع جہلم اور گرد و نواح میں علم و عرفان کی روشنی پھیلی ہے۔ اسم گرامی سید اسعد الرحمٰن اور تخلص قدسی ہے۔ ان کے کلام کے تین مجموعے ١٩١٢ تا ١٩٢٨ء میں شائع ہوئے۔ جنوری ١٩٦٨ء میں رباعیات قدسی کے نام سے کتاب شائع ہوئی جس میں ١٣٨ منتخب رباعیات ہیں اس میں ١٢ فارسی کی اور باقی اردو میں۔
جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے موصوف ایک روحانی سلسلے کے پیشوا تھے۔ چنانچہ ان کے کلام میں تصوف کا عنصر غالب ہے اس کے باوجود ان کے کلام میں لطف اور شاعرانہ چاشنی بھی موجود ہے۔ نمونہ یہ ہے :

کس منہ سے بیان ہو وصفِ شانِ معبود ممکن نہیں ہو سکے تجلی محدود
کیا جلوۂ حق ہے آشکارا قدسی جس سمت نظر اٹھا کے دیکھو موجود

حل جس کا نہیں کوئی وہ مشکل ہوں میں مضمونِ انا العبد کا حامل ہوں میں
ہر چیز مرے سامنے آئینہ ہے اپنا ہی تجلی کے مقابل ہوں میں

نامی نادری

اے بی نجمی نام اور نامی تخلص ہے۔ ان کی رباعیات کے مجموعے "باب السما" پر اظہار رائے کرتے ہوئے حضرت جوش ملسیانی نے لکھا :

"نامی صاحب کی کچھ رباعیات میری نظر سے گزریں۔ بیشتر رباعیات پاکیزہ مضامین کی حامل اور افادی حیثیت کی ہیں۔ ان میں معنی آفرینی بھی پائی جاتی ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ زبان بہت ہی سلیس اور عام فہم ہے"۔ (اقتباس)
اس کتاب میں حضرت ابر احسنی گنوری نے "نامی اور رباعی" کے عنوان سے نامی کی رباعیات اور انداز بیان پر گفتگو کی ہے لیکن کسی نے ان کے حالاتِ زندگی، مشاغل پر تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی حضرت ابر کے مضمون سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی کالج میں استاد ہیں اور اب (١٩٧١ء میں) معشوق حسین خشکو آبادی سے اصلاح لیتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ نادر مرحوم سے اصلاح لیتے تھے اور غالباً اس لیے نادری لکھتے ہیں :
انھوں نے کتاب کے نام "باب السما" کے نیچے عام روش سے ہٹ کر رباعیات کی بجائے "دوبیتیاں" لکھا ہے حالاں کہ دوبیتی سے مراد وہ رباعی نما قطعات ہیں۔ جن میں مطلع بھی ہو اور جنھیں مفاعیلن مفاعیلن، مفاعیل میں کہا گیا ہو جیسے علامہ اقبال کی دوبیتیاں جنھیں غلط طور پر رباعیات کہا جاتا ہے۔ حالاں کہ نہ وہ رباعیات ہیں اور نہ قطعات بلکہ دوبیتیاں ہیں۔ اس موضوع پر آغازِ کتاب میں مفصل گفتگو کی جا چکی ہے۔ نامی کا تعلق کسی طبقے سے ہے۔ چناں چہ چند رباعیاں حضرت مسیح کی شان میں بھی موجود ہیں۔ یہ مجموعہ تقریباً ڈیڑھ سو رباعیات پر مشتمل ہے اور انداز بالکل سادہ و عام فہم ہے :

دیکھیں گے خدا کس پہ خفا ہوتا ہے محشر میں کسے حکم سزا ہوتا ہے
دوزخ سے ڈراتا ہے ہمیں کیوں آنا اے شیخ وہاں دیکھنا کیا ہوتا ہے

دنیا میں غلط کام سے ڈرتا ہے کون اس دور میں انجام سے ڈرتا ہے کون
اب نام خدا ہے بس قسم کھانے کو اللہ کے اب نام سے ڈرتا ہے کون

صبا متھراوی

رفیع احمد نام صبا تخلص، رضی الدین خطیب شاہی عیدگاہ متھرا کے فرزند۔ سیماب صاحب سے ۱۹۴۵ میں تلمذ حاصل کیا۔ ۱۹۴۰ء میں فارغ الاصلاح ہوئے۔

کراچی میں قیام ہے اور تمام اصناف سخن پر مکمل قدرت حاصل ہے۔ مصدر الہام ان کے غیر منقوطہ کلام کا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا اس میں غیر منقوطہ رباعیات بھی شامل ہیں جن کی تعداد ۵۹ ہے۔ ان کے علاوہ ایک ہزار رباعیات پر مشتمل مجموعہ "واردات" کے نام سے تیار ہے ممکن ہے اس مضمون کی اشاعت کے وقت تک وہ بھی شائع ہو جائے۔

گلزار میں مدفون بہاروں کو بھی پڑھ ظلمات میں ڈوبے ہوئے تاروں کو بھی پڑھ
کتبے تو مزاروں کے سبھی پڑھتے ہیں تو غور سے ویران مزاروں کو بھی پڑھ

تو نے ابھی دیکھی نہیں تصویرِ حیات تو نے ابھی سمجھی نہیں تفسیرِ حیات
رونا ہی مقدر نہیں رونے والے تقدیر پہ ہنسنا بھی ہے تقدیرِ حیات

وحیدہ روشن پروین

ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ ان کی رباعیات کا مجموعہ "ارمغات" کے نام سے ۱۹۸۰ میں پاکستان میں شائع ہوا۔ ۹۳ صفحات کے اس مجموعے میں چند قطعات بھی شائع ہو گئے ہیں۔ ہر صفحے پر تین تین رباعیاں (یا قطعات) درج ہیں اور قطعات کو نکال کر تقریباً ۲۵۰ رباعیات بنتی ہیں۔

آغاز میں صرف حکیم نیر واسطی کے نام انتساب ہے اس کے علاوہ نہ مقدمہ، نہ پیش لفظ، نہ تعارف نہ فلیپ پر کسی قسم کی معلومات۔ فلیپ پر صرف یہ معلوم ہو سکا کہ

"ارمغات محترمہ موصوفہ کی رباعیات دل فریب کا مجموعہ ہے جس میں رفعتِ تخیل حکیمانہ توضیح اور شاعرانہ پیرایۂ بیان نہایت خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے۔"
م۔ ع۔ سلام

اس مجموعے میں شامل تمام رباعیات و قطعات کو عنوان کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ انداز بیان نہایت سادہ و صاف

ہے۔ کئی جگہ روزمرہ اور محاورات بھی استعمال کیے گئے ہیں اور ہر رباعی میں تخلص کا استعمال بھی پابندی سے کیا ہے۔ چند منتخب رباعیات یہ ہیں :

انوار میں ڈھل سکتی ہیں لاکھوں شمعیں ظلمت کو بدل سکتی ہیں لاکھوں شمعیں
ہے شرط کہ کچھ سوز ہو دل میں پرویں پھر ایک سے جل سکتی ہیں لاکھوں شمعیں

صادقین

مشہورِ زمانہ مصور جو اپنی منفرد خطاطی و مصوری کی بدولت انٹرنیشنل فیم کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ان کی طرح آپ کو بھی میری طرح یہ جان کر شاید حیرت ہو کہ وہ نہ صرف شاعر ہیں بلکہ رباعی بھی کثرت سے کہتے ہیں۔ ان کی ۲۰۵ سے زائد رباعیات کا مطبوعہ مجموعہ اس حیرت کو یقین میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جیب نے اجازت نہیں دی کہ ۲۵ روپے کا یہ مجموعہ خرید سکوں البتہ ایک دکان پر کھڑے کھڑے سرسری مطالعہ کیا۔ بعض رباعیات کے بعض مصرعوں کا وزن مشکوک ہے۔ اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بقول صادقین ایک رات میں رباعیاں تخلیق کر کے نظرِ ثانی کے بغیر ۸۵۱ ۲۱۵ چھپوا دی گئیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ میں نے جلدی کی وجہ سے غلط سمجھا ہو یا پھر ان کا صحیح وزن سمجھنے میں فن سے میری عدم واقفیت حائل ہو۔ یہ مجموعہ صادقین نے اپنے ہی قلم سے لکھ کر چھپوایا اور جیسا کہ میں نے اوپر کہا بعض مقامات کے علاوہ تمام رباعیات ٹھیک ٹھاک ہیں اور بعض بہت عمدہ بھی ہیں۔ بعض جگہ ان کی شگفتہ مزاجی ظریفانہ رنگ اختیار کر گئی ہے۔ چند رباعیات دیکھیے :

کب ہیں روشِ عام کے لکھنے والے حرفوں کو ہیں دل تمام کے لکھنے والے
تختی پہ شبانہ روز خونِ دل سے ہم تو ہیں ترے نام کے لکھنے والے

آیات کے طغرے بہت رسائل کے ٹائٹل اور بعض آیات کے ساتھ مثلاً سورہ رحمٰن کی خطاطی کے ساتھ پس منظر مصوری ان کی ذہانت و فطانت کی عکاس ہے۔

طفیل ہوشیارپوری

پیدائش ۱۹۱۴ء ہوشیارپور۔ ایک عرصہ سے ماہنامہ محفل لاہور کے مالک و مدیر کے فرائض انجام دے رہے ہیں غزل اور نظم خوب کہتے ہیں۔ کلام میں پختگی اور روایت پسندی کا عنصر غالب ہے۔ جام مہتاب ان کی رباعیات و قطعات کا مجموعہ ہے جو ۲۴۰ صفحات کو محیط ہے۔ اس میں ۲۵ سے ۱۲۸ تک ہر صفحے پر دو دو رباعیات ہیں اس طرح رباعیوں کی تعداد ۲۴۸ بنتی ہے۔

فنی نقائص سے مبرا یہ رباعیات ان کے نظریات و کہنہ مشقی کی آئینہ دار ہیں۔ مندرج ذیل رباعی حسن طلب اور اظہارِ عجز کا بہترین نمونہ ہے :

جاؤں تو کہاں جاؤں ترے در کے سوا تسکین کہاں پاؤں ترے در کے سوا
کونین پہ ہے تیرے کرم کا سایہ دامن کہاں پھیلاؤں ترے در کے سوا

جاوید اقبال ناصر

ادب اور پسینہ

ادب پر لیکچر دیتے ہوئے شنگھائی کے ایک پروفیسر کہتے ہیں کہ ادب کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے وہ انسانی فطرت کے ابدی خواص کا ترجمان ہو۔ انگلستان میں مثال کے طور پر شیکسپیئر یا ایک دو اور ادیبوں نے انسانی فطرت کے بارے لکھا، چنانچہ اسی لئے وہ آج بھی پڑھے جاتے ہیں۔ دوسرے ادیبوں نے ایسا نہیں کیا جس کے نتیجہ میں ان کی تخلیقات کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ یہ بات " جتنی زیادہ آپ کسی چیز کی وضاحت کریں گے وہ مبہم حیرانی بڑھاتی جائے گی" کی ایک عمدہ مثال ہے۔ میں مانتا ہوں کہ انگریزی کی بہت سی ابتدائی تخلیقات طاق نسیاں ہو گئی ہوں گی لیکن میں نے کبھی ان کی ناکامی کو انسانی فطرت کے اظہار میں ناکامی پر محمول نہیں کیا۔ اب جبکہ یہ حقیقت مجھ پر واضح ہو چکی ہے تو مجھے یہ سمجھنے میں دقت پیش آ رہی ہے کہ جب وہ تخلیقات ہی ختم ہو چکی تھیں۔ پروفیسر مذکور کو انہیں پڑھنے کا موقع کیسے ملا اور انہیں کس طرح یقین ہو گیا کہ ان تخلیقات میں انسانی فطرت کی ابدی خصوصیات کا ذکر موجود نہیں تھا

جو چیز محفوظ رہ جائے وہی معیاری ادب ہے اور جو باقی نہ رہے وہ غیر معیاری۔ جو کوئی " خدا کے نام " پر غضب کرے وہ بادشاہ، اور جو ایسا کرنے میں ناکام ہو جائے وہ محض ایک ڈاکو اور لٹیرا۔ آپ مجھے یہ نہ بتائیے کہ چینی نظریۂ تاریخ ادب کے چینی نظریہ پر لاگو آتا ہے۔

کیا واقعی انسان کی فطرت کبھی تبدیل نہیں ہوتی؟

ابتدائی بوزنا، بوزنما انسان، ابتدائی انسان، قدیم انسان، جدید انسان اور مستقبل کا انسان، کیا یہ مدارج انسانی فطرت کی تبدیلی اور ترقی کا نتیجہ نہیں ہیں۔ اگر زندہ مخلوق حقیقتاً فروغ پانا چاہتی ہے تو انسانی فطرت تبدیل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مجھے تو شبہ ہے کہ ہم ابتدائی انسان کے احساسات کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اسی طرح بوزنما انسانوں کے بارے میں بھی میری یہی رائے ہے بلکہ مستقبل کا انسان شاید ہمیں بھی سمجھ نہ سکے۔ چنانچہ انسانی فطرت کی ابدی خصوصیات

ے بارے میں خامہ فرسائی کرنا ایک نہایت کٹھن مرحلہ ہے ۔

مثال کے طور پر آپ پسینے کو ہی لیجئے۔ میں اپنے تصور کی آنکھ سے ماضی اور مستقبل کے انسان کو حال کے انسان کی طرح پسینے سے شرابور دیکھ رہا ہوں ۔

یہ چیز مقابلتاً ایک "ابدی" انسانی فطرت ہے۔ لیکن نوجوان اور خوبصورت بیگمات کا پسینہ اپنے اندر ایک خاص مہک رکھتا ہے ۔ جبکہ مزدوروں کا پسینہ کولہو کے بیل کے پسینے کی طرح گاڑھا ہوتا ہے۔ اگر کوئی ادیب بقائے دوام حاصل کرنے کی نیت رکھتا ہو تو اسے بہتے ہوئے پسینے کے بارے میں لکھنا چاہیئے۔ یا گاڑھے پسینے کو بنانا چاہیئے جس وقت تک یہ مسئلہ طے نہیں ہوجاتا ادیب کا مستقبل خطرے میں پڑا رہے گا۔

میں نے سنا ہے کہ انگلستان میں ابتدائی ناول بیگمات کے لکھے گئے چنانچہ ادب میں قدرتی طور پر ان دنوں بڑا خوشبودار پسینہ غالب رہا ۔ انیسویں صدی کے آخر میں روسی ادب کے زیر اثر گاڑھے پسینے سے متعلق تحقیقات کے انبار لگ گئے۔ پسینے کی کونسی قسم زندہ رہے گی اس کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے ۔

چین میں اس بات کے سننے سے آپ اپنے گوشت پوست کو سکڑتے ہوئے محسوس کریں گے کہ ماؤ کے مقلدین ماؤ کے اصولوں پر مکمل کاربند ہیں یا نقاد ادب کی بڑھ چڑھ کر تعریفیں کرتے ہیں۔ ان حالات میں کوئی پسینے کے بارے میں سوچنے کی جرأت کر سکتا ہے ۔ لیکن شاید پسینہ چینیوں کی ایک ابدی انسانی خصوصیت ہے۔

(ترجمہ)

ساقی فاروقی

نون میم راشد

آج ایک شخص کے خیال سے
اوس کی طرح
جسم کے سواد میں گری
نور کی پھوار
روح کے حصار تک

(انتظاریہ)

شاعری

فیض احمد فیض

نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نہیں وصال میسر تو آرزو ہی سہی

نہ تن میں خون فراہم نہ اشک آنکھوں میں
نمازِ شوق تو واجب ہے بے وضو ہی سہی

کسی طرح تو جمے بزمِ میکدے والو
نہیں جو بادہ و ساغر تو ہاؤ ہو ہی سہی

گر انتظار کٹھن ہے تو جب تلک اے دل
کسی کے وعدۂ فردا کی گفتگو ہی سہی

دیارِ غیر میں محرم اگر نہیں کوئی
تو فیض ذکرِ وطن اپنے روبرو ہی سہی

رئیس امروہوی

سوال یہ ہے کہ

شعور مہر بلب ہے قلم بریدہ زباں
سوال یہ ہے کہ اس مرحلے پہ کیا کہیے

سوادِ قتلِ سخن ہو تو مقتلِ فن میں
قلم کو آلۂ خونریزیٔ قضا کہیے

حیاتِ تازہ کی تہمت ہو جس سخن پہ لگے
نوشتۂ اجل و دفترِ فنا کہیے

اگر اجل کو اجل کہہ سکے نہ خامۂ زیست
فنائے محض کو سرمایۂ بقا کہیے

حدودِ فکر و نگارش جہاں ہوں تنگ وہاں
نہ شرح و بسط سے کہیے نہ برملا کہیے

بیانِ عظمتِ یزداں بجا سہی لیکن
نہ اہرمن کو ضلالت کا دیوتا کہیے

اگر ہو حضرتِ ہابیل کی صفت منظور
تو پہلے حضرتِ قابیل کی ثنا کہیے

رقم پذیر ہو گر قصۂ مسیح و صلیب
تو پہلے سطوتِ روما کا ماجرا کہیے

جو قتل نامۂ سقراط کی عبارت ہو
تو پہلے حکمتِ یوناں کو مرحبا کہیے

مصالحِ پسرِ سعد بھی رہیں ملحوظ
جو داستانِ شہیدانِ کربلا کہیے

ثنائے موجۂ صرصر کا بھی لحاظ رہے
اگر حکایتِ جاں بخشیٔ صبا کہیے

جہاں ہو مدحتِ خوبانِ روزگار وہیں
رقیبِ شمس کی تعریف جا بجا کہیے

لکھیں جو خلد نشینوں کے نام نامۂ شوق
تو اشقیائے جہنم کو بھی دعا کہیے

دروغ و صدق میں مشکل ہو امتیاز تو پھر
متاعِ کذب کو گنجینۂ صفا کہیے

مگس کی مدح جو منظور ہو تو بے وسواس
مگس کو پیشروِ لشکرِ ہما کہیے

کبھی قوی نظر آئے جو کوئی مردِ ضعیف
تو اس کو صرف خداوند کیا خدا کہیے

جو بے ضرر ہو تو پھر اژدہا بھی چیونٹی ہے
جو مصلحت ہو تو چیونٹی کو اژدہا کہیے

مرے قلم پہ مسلط تھا صورتِ عفریت
یہی سوال کہ اس مرحلے پہ کیا کہیے

ملا جواب کہ لکھنا اگر ضروری ہو
تو اختصار سے لکھنے کا مدعا کہیے

قلم جو دستِ ستمگار میں نہ ہو محفوظ
تو حرفِ صدق بہ انگشتِ لمسِ پا کہیے

قتیل شفائی

اس کا نام بھی آخر زندہ رہنا ہے
جس نے پتھر کھائے شیشہ پہنا ہے

آنے والے سُکھ سے ناتا ہے جس کا
وہ دُکھ تو اپنی پیڑھی کو سہنا ہے

پیا تجھے اپنا لیں گے پر یہ تو بتا
گوری تیرے تن پر کتنا گہنا ہے

پاپی جس کو دیکھیں میلی نظروں سے
وہ بھی کسی کی متیا، کسی کی بہنا ہے

ہم رہتے ہیں اس دنیا میں جہاں قتیلؔ
کپڑے پہن کے بھی انسان برہنہ ہے

گم تھی اپنے دھیان میں گوری کان میں ایسی جھنک پڑی
کھڑے کھڑے اس کے پیروں میں چھن چھن پایل چھنک پڑی

بند لبوں کو گیت ملے، سنگیت ملا سناٹوں کو
اس کی آنکھوں سے ٹکرا کر ساری بستی کھنک پڑی

ہر پل ایسا لگے کہ جیسے بھیگ چکا ہوں بارش میں
یارو! کتنی مہنگی مجھ کو اس چُنری کی دھنک پڑی

آگ لگا کرتی ہے من میں پچھلی رات کے جھونکوں سے
آج نہ جانے شام سے پہلے کیوں پروائی سنک پڑی

اس دنیا کی رونق اپنے حصّے میں تب آئی قتیلؔ
حوّا کے ہاتھوں سے جب آدم کے منہ میں کنک پڑی

قتیل شفائیؔ

لے دے کے اب یہی ہے تری بے بسی کا حل
ٹانگیں کٹا چکا ہے تو بیساکھیوں پہ چل

عالم پناہ بننے کا گر شوق ہے تجھے
بنوا کے اِک مزار سمجھ لے اُسے محل

دستار اپنے سر سے بڑی محتسب نہ باندھ
اس بوجھ سے ترا نہ کہیں جائے دم نکل

اچھا وہی ہے جس کا ہے رشتہ زمین سے
اوپر جو دیکھتا ہے وہ گرتا ہے منہ کے بل

رستم کہے گا کون تجھے بے مقابلہ
تو واقعی ہے مرد تو میدان میں نکل

ہرجائیوں میں نام ترا آئے بھی تو کیا
معشوق بن کے روز وفاداریاں بدل

گر ہو سکے تو اُن کو کھلی آنکھ سے بھی دیکھ
جو خواب ڈالتے ہیں تری نیند میں خلل

بہتر یہی ہے چھیڑ کوئی مرثیہ قتیلؔ
محفل ہو گر اُداس تو کس کام کی غزل

نہ کوئی خواب ہمارے ہیں نہ تعبیریں ہیں
ہم تو پانی پہ بنائی ہوئی تصویریں ہیں

کیا خبر کب کسی انسان پہ چھت آن گرے
قریۂ سنگ ہے اور کانچ کی تعمیریں ہیں

بٹ گئے مفت میں دونوں تری دولت مرا دل
اے سخی تیری مری ایک سی تقدیریں ہیں

کوئی افواہ گلا کاٹ نہ ڈالے اپنا
یہ زبانیں ہیں کہ چلتی ہوئی شمشیریں ہیں

اب کے عشّاق کی یہ زندہ دلی خوب رہی
ہجر کے دن ہیں مگر وصل کی تدبیریں ہیں

ہم جو ناخواندہ نہیں ہیں تو چلو آؤ پڑھیں
وہ جو دیوار پہ لکھی ہوئی تحریریں ہیں

ہو نہ ہو یہ کوئی سچ بولنے والا ہے قتیلؔ
جس کے ہاتھوں میں قلم پاؤں میں زنجیریں ہیں

دستک

قتیل شفائی

"کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ"
"کون ہو بھائی"
"پہلے دروازہ تو کھولو"
"اچھا ٹھہرو"
میں نے تھوڑا سا دروازہ کھول کے باہر جب دیکھا تو
میرے سامنے اک البیلا، نیا نویلا شعر کھڑا تھا
"اچھا تم ہو؟ اتنے دنوں سے کہاں تھے بھائی"
"میں تو یہیں تھا۔ یہیں تمہاری ہی چوکھٹ پر
تم نے خود ہی بند کئے رکھے تھے سب دروازے
میں پھر اندر کیسے آتا"
"اچھا یوں ہے تو پھر تم نے پہلے ہی دستک دی ہوتی"
"دستک؟" شعر نے اپنے زخمی ہاتھ دکھا کر کہا
"یہ دیکھو میں تو کتنے دنوں سے دروازوں کو پیٹ رہا ہوں
تم نہ سنو تو دوش ہے کس کا؟ میرا؟"
نئے نویلے شعر کی باتیں سن کر مجھ کو ہوئی ندامت
کیا میں اتنا ہی غافل تھا؟
کیا میں اتنا ہی بہرا ہوں
آج بھی میں نے اسکی دستک سنی نہ ہوتی
آج بھی میں گر کھویا رہتا اپنے اندر کی دنیا میں
جانے کیا کچھ ہو جاتا؟
ہوتا جو کچھ ہوتا لیکن اب جو ہوا ہے دیکھو
دستک دیتے دیتے تھک جانے والے
اک شعر کا طعنہ سن کر
باہر کی دنیا پر میں نے ہر دروازہ کھول دیا ہے
ذہن کا بھی
آنکھ کا بھی
جذبات کا بھی
اور اب میں سب کچھ سن سکتا ہوں
اب میں سب کچھ دیکھ سکوں گا

عارف عبدالمتین

چراغ ہوں میں کبھی طاق پر سجا مجھ کو
ہوا بجھائے تو دامن سے تو بچا مجھ کو

سفینہ ہوں تو رہوں ساحلوں سے کیوں منسوب
تو زندگی کے سمندر میں بھی بہا مجھ کو

میں شاخِ درد سے ٹوٹا ہوا ہوں اِک پتّہ
اڑائے پھرتی ہے شانوں پہ یہ ہوا مجھ کو

اُٹھا رہا ہوں میں دکھ اپنی پائمالی کا
بنا گئی مری رفتار نقشِ پا مجھ کو

میں جب بھی رکھنے لگوں وادیٔ فنا میں قدم
تو زندگی کی طلب بن کے دے صدا مجھ کو

میں جس کو سوچ کے اچھوتے جہاں کروں تخلیق
وہ اَن کہی سی کہانی کبھی سُنا مجھ کو

احمد فراز

واپسی

اس نے کہا سُن
عہد نبھانے کی خاطر مت آنا
عہد نبھانے والے اکثر
مجبوری یا مہجوری کی تھکن سے لوٹا کرتے ہیں
تم جاؤ
اور دریا دریا پیاس بجھاؤ
جن آنکھوں میں ڈوبو
جس دل میں بھی اُترو
میرے لب تجھ کو آواز نہ دیں گے
لیکن جب
میری خواہش اور میری چاہت
اتنی شدید اور ایسی ناممکن ہو جائے
جب دل رو دے
تب لوٹ آنا

شانُ الحق حقّی

ایما ہی روا دو کا فقط دل کے لئے تھا
قدموں کو تو ڈھالا ہی سلاسل کے لئے تھا

نغمہ ہو مگر حرف و معانی سے مبرّا !
گلشن میں یہی حکم عنادل کے لئے تھا

گم ہو گیا لے کر جسے ٹوٹا ہوا تارہ
شاید کوئی پیغام مرے دل کے لئے تھا

بسمل پہ تھی تعزیر جو قاتل کے لئے تھی
حق پر ہے وہ آوازہ جو باطل کے لئے تھا

دیکھو تو شبِ تار کا تعقّد پہ ہے شکوہ
کیوں اتنا اجالا مہِ کامل کے لئے تھا

خنجر تھا نہ شمشیر، فقط دستِ دعا تھا
اٹھا جو سرِ رزم مقابل کے لئے تھا

بسمل کی کہاں پیاس بجھا سکتا تھا پانی
دھونے کو فقط دامنِ قاتل کے لئے تھا

افسانے وفا کے ہوئے سب دل سے فراموش
کچھ ذکر یونہی گرمیٔ محفل کے لئے تھا

وہ نام ہے اب جلوۂ کُل کا مترادف
مخصوص جو پہلے تری منزل کے لئے تھا

معلوم ہے یہ جو غزل آرائی پہ حقّی !
مائل تھا تو کس شوخ شمائل کے لئے تھا

سلیم احمد

دلوں میں درد بھرتا آنکھ میں گوہر بناتا ہوں
جنہیں مائیں پہنتی ہیں میں وہ زیور بناتا ہوں

غنیمِ وقت کے حملے کا مجھ میں خوف رہتا ہے
میں کاغذ کے سپاہی کاٹ کر لشکر بناتا ہوں

پرانی کشتیاں ہیں میرے ملاحوں کی قسمت میں
میں ان کے بادباں سیتا ہوں اور لنگر بناتا ہوں

یہ سوچا ہے کہ اب خانہ بدوشی کر کے دیکھوں گا
کوئی آفت ہی آتی ہے اگر میں گھر بناتا ہوں

یہ دھرتی میری ماں ہے اس کی عزت مجھ کو پیاری ہے
میں اس کے ننگے سر کے واسطے چادر بناتا ہوں

حریفانِ فسوں گر کو مسلم ہے میری باتوں میں
یہی میرا عصا ہے اس کے میں اژدر بناتا ہوں

مجھے ان سیپیوں کو دیکھ کر یوں ہی خیال آیا
یہ پانی سے میں اپنے خون سے گوہر بناتا ہوں

اختر ہوشیار پوری

بہت آیئنے دیکھے زندگی میں
مگر وہ لوگ جو تھے اس گلی میں

مری آواز مجھ کو کھینچ لائی ـــــ
میں بیٹھا تھا حصارِ خامشی میں

سمٹ کر اب وہ صحرا بن گیا ہے
سمندر تھا کبھی دریا دلی میں!

پلٹ کر اپنے گھر میں آگیا ہوں
مجھے آواز دو اس کی گلی میں

سوادِ شام کا ہمزاد نکلا
جسے دیکھا تھا دن کی روشنی میں

مری تصویر بھی مجھ پر گراں تھی
کہ خامی ہے بڑی خاکہ کشی میں

دلوں کا کرب چہرے سے عیاں تھا
مگر وہ حسن جو تھا جانکنی میں

بہاروں میں درختوں کی قطاریں
سروں کی فصل جیسے چاندنی میں

خزاں، قوس و قزح، برسات اختر
کئی رنگ آملے ہیں آدمی میں!

ہاتھوں میں قلم نہیں! لہو ہے
لیکن مرا چہرہ رو بہ رو ہے

اس بوڑھے شجر کا دھیان رکھنا
سارے گاؤں کی آبرو ہے!

دیواریں تمام ڈھا چکا ہوں
اور اب مرے راستے میں تو ہے

ہر سمت پرندے اڑ رہے ہیں
پھیلا ہوا شہرِ آرزو ہے

تجھ کو تو تلاش کر چکا ہوں
اور اب مجھے اپنی جستجو ہے

آیا تھا گرفت میں جو لمحہ!
مٹھی سے نکل کے چار سو ہے

یہ چاک تو خود مری طلب تھی
پھر بھی مجھے خواہشِ رفو ہے

پلکوں پہ دیئے جلائے رکھنا
اس شہر کا طرزِ گفتگو ہے

کاغذ پہ لکیریں کھینچتا ہوں
شاید یہی صورتِ نمو ہے

جس سے دامن سنگ اٹھا تھا
اختر وہ شرارِ آرزو ہے

بلراج کومل

تقویم

ایک پرکمولتی، رقصِ آثار تقویم میں
روز و شب سے گزرتے ہوئے
مختلف اسمائے گام، طائر بدن نام
دل کے افق پر ابھرتے رہے
یہ سبھی لوگ

فصلِ رفاقت کی سرسبز، شاداب
محفل میں آباد تھے
قربتوں کی خطاکاریوں کے فسانے سناتے تھے
رنگوں کی، نغموں کی سرشاریوں کی فسوں کار
رنگین رسوا و بدنام
تانیں اڑاتے تھے
سب شادماں، کامراں، سب حسیں لوگ تھے
لوگ، سب لوگ، یہ سب حسیں لوگ تھے

رفتہ رفتہ
وہ تصویر کے تیوروں والے لوگ
ریگِ ضیا پر اترنے لگے
اور جسم و نگر میں بکھرنے لگے
اک ہجومِ فراواں، پریشاں
مرے چار سو موجزن ہو گیا
بے وزن ہو گیا

حادثہ یہ ہوا
ان میں ہر شخص تھا
دشمنِ جاں ستاروں کا، بہتی ہوئی روشنی کا
انہیں صرف تنظیم لازم تھی اپنی، لہو مانگتی
پھیلتی کوندتی صرف اپنی انا کی
یہ سب لوگ تقویم میں اپنی اپنی ضیافت کی
تنظیم کرتے رہے
برگ تصویر کے تیوروں والے یہ لوگ
ہر انجمن میں
حسیں جھوٹ تقسیم کرتے رہے
جو بھی پُر نور تھا، جو بھی شفاف تھا
اس کی ژولیدہ تفہیم کرتے رہے

محمد ابن الحسن

اب یہ سوچا ہے کہ اپنی ذات میں کھو جائیں گے
سر سے پاؤں تک ایک چادر ڈال کر سو جائیں گے
کوئی کچھ پوچھیگا ہنس کر ٹال دیں گے بات کو
منہ میں رکھتے ہیں زباں پر بے زباں ہو جائینگے
پھول پتے چاندنی معصومیت، مظلومیت
ان پہ ہم جاتے ہوئے دل کھول کر رو جائیں گے
داغ جو سینے پر ہیں اُن کا بھی اب کیا کام ہے
جاتے جاتے آنسوؤں سے اُن کو بھی دھو جائینگے
پھر جدا ہونا ہے تھوڑی دور تک تو ساتھ ہو
آئیں میرے ساتھ آئیں جو اُدھر کو جائیں گے
کچھ نہ کچھ دے جائیں گے ہم لوگ دنیا کو حسنؔ
راستے میں ہر قدم پر سروِ غم بو جائیں گے

نوشتۂ دیوار

میں ڈرتا ہوں
اس بات سے کہ
اچانک نہ آئے
کوئی صاعقہ، کوئی بھونچال ان کو
مرے دوست
دیوار سے لگ کے بیٹھے ہیں
پڑھتے ہیں اخبار
دیوار میں جو دراڑیں پڑی ہیں
وہ تحریر پڑھتے نہیں ہیں
مرے دوست
رسیا ہیں خبروں کے خبروں کی زد میں
یہ خبروں کے خالق نہیں ہیں
میں ڈرتا ہوں
اس بے بصر، بے خبر، بے حسی سے
یہ اخبار پڑھنے کی مہلت ہے کب تک

محمد ابن الحسن

کہیں تان جا کے اڑایئے کہیں رنگ جا کے اچھالیئے
پسِ نشستِ درد ہے جس جگہ وہیں لوٹ لوٹ کے آیئے

یہ جو زندگی ہے پہاڑ سی یہ جو روز و شب ہیں چٹان سے
انہیں لطفِ رم انہیں ضبطِ غم انہیں چشمِ نم سے تراشیئے

مرے سردِ سنگ ہمک اٹھیں ترے انگ انگ چھلک پڑیں
سرِ بیستوں کسی کوہ کن کسی زخمہ زن کو بلایئے ○

کئی آفتاب سحاب میں کئی ماہتاب حجاب میں
یہ جو تیرتے ہیں سراب میں انہیں ڈوبنے سے بچایئے

سرِ انتہائے کمال پر مری ابتدائے زوال ہے،
مجھے احتیاط محال ہے مجھے خود ہی آ کے سنبھالیئے

یہ اداس رات ہے بے وطن یہ حسین شہر ہے کم سخن،
کہیں قہقہوں سے پرے حسن کوئی خوابِ زار بسایئے

رستے میں شام آئی ہے اٹھنے لگا دھواں
لگتی ہیں دیکھنے میں بھلی دور بستیاں

منظر خیال و خواب کا آیا ہے سامنے
کھوئی ہیں اپنے رنگ میں رنگین تتلیاں

موجیں اچھل رہی ہیں دلِ مطمئن سے یوں
جیسے کہ مل گیا ہو سمندر سے آسماں،

ایک اپنی کائنات سی تعمیر کیجئے
سارے جہاں سے دور نہیں سب کے درمیاں

سجدہ ہر ایک گام پہ کرتا ہوں شکر کا
مجھ کو جبیں کے ساتھ میسر ہے آستاں

طوفانِ نوح آج بھی اترا نہیں کہیں
کشتی زمیں ہے آسماں اُس کا ہے بادباں

اترا ہے شاخسار پہ ایسا قفس کا رنگ
چبھتی ہیں ہر طرف سے نشیمن کی تیلیاں،

لفظوں کے درمیاں جو حقیقت بات رہ گئی
اس کا زبانِ حال سے کیا ہو سکے بیاں

شوکت واسطی

خلوص و مہر سے لبریز ہمدم اپنا تھا
کہ بیشتر وہ ہمارا تھا، کم کم اپنا تھا

کیا جو تجزیہ نکلا نہ جانے کس کس کا
ہمیشہ جس کو یہ سمجھا کیے، غم اپنا تھا

نہ تھا تمہاری محبت میں قاعدہ کوئی
نہ کاروبارِ وفا ہی منظم اپنا تھا

رسائی کیوں نہ ہوئی تا بکوئے یار، اگر
نیت بخیر، ارادہ مصمم اپنا تھا!

کسی کی ذات نہ گمراہ کر سکی ہم کو
کہ اپنی ذات پہ ایمان محکم اپنا تھا

خدا کو جانا ہے، انسان کو پہچانا
اگرچہ فرض یہی اک مقدم اپنا تھا

ہماری سلطنتِ عشق کی حدود نہ پوچھ
جو راست قد تھا کہ گیسوئے پُرخم اپنا تھا

کچھ اس طرح ہوئی تقسیم باغِ ہستی کی
تمہارا خندۂ گل اشکِ شبنم اپنا تھا

وہ شخص ہی مری پہچان بن گیا شوکت
کبھی جو دوست تھا اپنا نہ محرم اپنا تھا

محسن احسان

متفرقات

بستیٔ آزادگاں، حرص و ہوس کی غلام
حرفِ دعا، نارسا، نقشِ وفا ناتمام

جتنی بھی ہیں رونقیں اب وہ مزاروں پہ ہیں
کوئی تو زندوں میں ہو، جس کا ہو کچھ احترام

منزل کا نشاں کیسے ملے گا
سب لوگ سفر میں سو گئے ہیں

میں نے دیکھا وہ سلوکِ احباب
میرا دشمن مرا دشمن نہ رہا

مئے خوش رنگ سے ہونٹوں کو ذرا تر کر لوں
مجھ کو اک بوند جو مل جائے تو ساغر بھر لوں

اب حسرتِ جاہ بھی کسے ہے
وہ شوقِ کلاہ بھی کسے ہے

سیاہیوں کی تہوں میں اُتر نہیں سکتے
دمک رہے ہیں جو لمحے وہ مر نہیں سکتے

چراغ چہرہ کرن لڑتا رہا اندھیروں سے
تم اس کی لو کو کبھی قتل کر نہیں سکتے

جو احتسابِ الٰہی کا خوف رکھتے ہوں
وہ احتسابِ زمانہ سے ڈر نہیں سکتے

ہزار بادِ مخالف سہی، مگر کچھ لوگ
گلِ فسردہ کی صورت بکھر نہیں سکتے

زباں بند ہو گو نجار دل سے اٹھے گی
شکستِ ساز سے نغمات مر نہیں سکتے

شگافِ در سے کرن تیغ بن کے پھوٹے گی
تم آفتاب کو تاریک کر نہیں سکتے

شفیع منصور

(مصنف کے زیرِ ترتیب دیوان "جمِ شادماں" سے منقول)

①

کیفِ نظر سے ہے چمن، اب یہ چمن سے کیا کہوں
مشکِ خیال کی مہک مشکِ ختن سے کیا کہوں

ایک صدائے بے صدا، نغمہ سرا ہے جا بجا
شورِ جہاں کی بات کیا، شورشِ تن سے کیا کہوں

میری تڑپ ہے بے سبب، میرا سخن ہے زیرِ لب
ہائے یہ اپنا حال اب، اہلِ سخن سے کیا کہوں

میرا چمن ہے روئے دل، میری بہار بوئے دل
جانِ بہار کون ہے، سرو و سمن سے کیا کہوں

کس کی ادائے جانستاں، موت بھی زندگی بھی ہے
رازِ تجلئ نو بنو، چرخِ کہن سے کیا کہوں

دیکھی ہیں جس نے عظمتیں، بچھڑے ہوؤں کی وہ کہے
آج وطن میں کیا نہیں، اہلِ وطن سے کیا کہوں

شورِ سخن ہے کو بکو، دادِ سخن ہے بے نمو
نقد و نظر کی بات ہے، ناقدِ فن سے کیا کہوں

②

ابر و باراں میں گل و گلزار کی باتیں کرو
اس زمینِ دلکش و غم خوار کی باتیں کرو

خاک میں ایسی تڑپتی آرزو اظہار کی
اپنی اِس جوگن کی، اس کے پیار کی باتیں کرو

اِن بدلتے منظروں کو چھیڑتا رہتا ہے کون؟
اس ادا سے حرفِ پردہ دار کی باتیں کرو

حرف و صوت و رنگ سے آگے بھی کوئی بات ہے
دار ہی کے ہو لئے، اب پار کی باتیں کرو

کوئی کوئل سی کوک اُٹھے جب دردِ بے انجام سے
اس دہکتے بولتے کردار کی باتیں کرو

منبر و محراب کی باتوں کا یہ موسم نہیں
تم ذرا منصورؔ بہکو، دار کی باتیں کرو

(۳)

کوئی دیوانہ ہے جو کہتا ہے مجھ میں سارا جہان رہتا ہے
جتنے دریا ہیں دل میں گرتے ہیں دل میں بحرِ وصال بہتا ہے
کوئی جانے تو کس طرح جانے جانتا ہے وہی جو سہتا ہے
کون اس گھر کو گھر کہے جس میں کوئی تیرے بغیر رہتا ہے!
بات منصور کی سُنو لوگو
آپ سُنتا ہے آپ کہتا ہے

(۴)

غضب کی رُت ہے، سرِ رہگذار گزرے گی یہ شام اپنی بڑی یادگار گزرے گی
قرار ہے کہ سفر میں ہوں وسعتوں کے لئے بجا کہ عمرِ رواں بے قرار گزرے گی
چلو چمن میں، سُنا ہے نظر وروں کے لئے خزاں کے روپ میں فصلِ بہار گزرے گی
ستم یہی ہے، تڑپتا ہے رنگ و بُو کے لئے یہ عمرِ غم جو سرِ نوکِ خار گزرے گی
دیارِ دل سے گزرتی رہے گی حسرتِ دید یہ آشنا ہے مری بار بار گزرے گی
یہ زندگی ہے، کوئی کھیل تو نہیں منصور
کہیں نہیں، یہ سرِ کوئے یار گزرے گی

صمد انصاری

میرے موسم مرے منظر سے چلے آئے ہیں
رنگ تصویر کے پیکر سے چلے آئے ہیں!

کن زمینوں میں نئے شہر بسانے کے لئے
بام و در اٹھ کے مرے گھر سے چلے آئے ہیں

جمع ہوں لوگ نہ شاید مرے پرچم کے تلے
دائرے ٹوٹ کے محور سے چلے آئے ہیں

ہو گی کیسے مرے گم گشتہ جزیروں کی تلاش
اب تو ساحل بھی سمندر سے چلے آئے ہیں

کچھ تو جام نہیں گردشِ دوراں کے سوا
میکدے لوٹ کے ساغر سے چلے آئے ہیں

اپنے بجھتے ہوئے لفظوں کا اعادہ کرنے
ہم سخن حرفِ مکرر سے چلے آئے ہیں

گھر کے خاموش مکینوں کی خبر کیا جانیں
دے کے آواز جو باہر سے چلے آئے ہیں

جن پہ سوچا تھا بہت میرے دبستانوں نے
اب کے وہ لوگ بھی ازبر سے چلے آئے ہیں

کیوں چمکتے نہیں احساس کے شیشے میں صمدؔ
جو نشہ جسم کے پتھر سے چلے آئے ہیں!

صبحِ مقتل کا گماں ہے شام کے اخبار پر
دھار کیسی آگئی ہے وقت کی تلوار پر!

دشت و در پر کب سے آہٹ ہے سوادِ ابر کی
دھوپ بھی اتری نہیں اب تک مرے اشجار پر

جس کی مستی سے مرے ایام کے ساغر ڈھلے
کیف وہ اترا نہیں اب تک لبِ میخوار پر

دائرے کتنے بنے ہیں دائروں کے درمیاں
ایک ہی نقطہ ہے لیکن نقطۂ پرکار پر

ہے رعایت بھی عدو کی پرسشِ احوال میں
کچھ ستم کے بھی تقاضے ہیں مرے غمخوار پر

بانٹ دی سب میں نہ لی تنہا متاعِ خسروی!
کتنی حیرت ہے زمانے کو ترے انکار پر

وقف ہے کس کے لئے دن رات کی شہرت گری
ہر کسی کی لگ گئی ہے نام کے بازار پر

کتنے فنکاروں کو ستدرہ پذیرائی ہوئی
فن مگر ٹھہرا نہیں اب تک کسی شہکار پر

رفتہ رفتہ سج رہی ہے بام پر بوسیدگی
کس کا سایہ ہے صمدؔ گھر کی نئی دیوار پر

کاغذ کی ناؤ

قمر ہاشمی

میرا پائی کی مانند میں
اک جلا ٹکڑا رسی کا ہوں
جس کا خاکستری ہے وجود
بہت بودو نبوُد
میں وہ بدبخت فن کار ہوں
جس کی اس عہد میں کوئی قیمت نہ بھاؤ
قلزمِ زیست میں
اپنے پیروں پہ چلنے کی کوشش کروں تو ہوں
کاغذ کی ناؤ
میں جو لفظوں کے تعمیر کرتا ہوں اہرام
خونِ جگر سے بناتا ہوں شعروں کے تاج
سب مری حسرتوں کے مقابر میں
تبدیل ہو جاتے ہیں
وہ جنھوں نے محل سینۂ ارض پر چن دیئے
موت کو بھی تماشا بنا کر گئے

اور یہاں زندگی تک ہماری نہیں
لائقِ اعتنا
ربّنا
حرفِ تخریب سے حرفِ تعمیر ہے
حرفِ تکذیب ہے حرفِ تعقیر۔
میں نے جانا ال ہ سے تجھے
حرف سے لفظ بنتا ہے
لفظوں سے سطریں بنیں
سرمگیں احمریں دل نشیں
میرا فن میری مخلوق سطروں میں،
جس کی خوشبو ہے صحرا کا پھول
تو نے الفاظ کا رزق وافر دیا ہے
میرے رزاقِ شوق
اب مجھے بخش دے
میرے آفاقِ شوق

ممتاز میرزا

یہ کس نے کہا سارے زمانے کے لئے ہیں
اشعار مرے خود کو سنانے کے لئے ہیں

نشتر بھی کچھ تیز یہ پُروائی کے جھونکے
پھولوں کی طرح زخم کھلانے کے لئے ہیں

آشفتہ سری، جامہ دری، دشت نوردی
عنوان کئی میرے فسانے کے لئے ہیں

ان اشکوں سے محفل میں چراغاں نہیں ہوگا
یہ اشک تو پلکوں پہ سجانے کے لئے ہیں

تھک جاؤ گے تم، ہم نہ سنانے سے تھکیں گے
افسانے بہر حال سنانے کے لئے ہیں

زخموں کی نمائش نہیں منظور ہے ممتاز
جو زخم ہیں سینے میں چھپانے کے لئے ہیں

ربیعہ مخفی

کوئی خواہش نہیں حرفِ دعا کیا
اب ایسا بھی دلِ بے مدعا کیا

لہو کے چند دھبے ہیں سرِ دار
مری آوازِ پا کیا نقشِ پا کیا

منائیں خیر اپنی ناخدا اب
ہمارا تیرنا کیا ڈوبنا کیا

کوئی دے ساتھ کب تک کس کو معلوم
چڑھے دریا تو تنکا کیا خدا کیا

لہو بکھرا ہے تیرا ہو کہ میرا
لہو کا آشنا نا آشنا کیا

کوئی کیسے بتائے کل کا سورج
اُٹھے کس سمت سے کل کا پتہ کیا

اُٹھا کر ہاتھ پھر یوں سوچتی ہوں
اجابت کی گھڑی ہے اب دعا کیا

افتخار عارف

شکستہ پَر جنوں کو آزمائیں گے نہیں کیا
اُٹھانوں کے لئے پَر پھڑپھڑائیں گے نہیں کیا

ہوائیں مہرباں تھیں منتقم کیوں ہو گئی ہیں
نجمہ دارانِ ساحل کچھ بتائیں گے نہیں کیا

کوئی نبتا ہوا سورج پسِ دیوار تاریک
فروزاں ہو تو دیواریں گرائیں گے نہیں کیا

وہی پہلی سی ارزانی سرِ بازار پندار
نظر آئے تو ہم قیمت بڑھائیں گے نہیں کیا

سوادِ تشنگی کے پار اِک موآجِ دریا
غزل خواں ہو تو پھر تیشے اٹھائیں گے نہیں کیا

بدلتے موسموں کی دھول ہوتے راستوں کو
تھکے ہارے مسافر یاد آئیں گے نہیں کیا

ہم تو دیوانے ہیں رمزیں نہ کنایہ جانیں
جز غمِ عشق ہر اِک زخم کو مایا جانیں

کج کلاہی پہ نہ جائیں کہ یہ سب آپ کی نذر
شہِ خوباں ہمیں بس اپنی رعایا جانیں

آج کے بعد تو ہم پر بھی یہ لازم ہے کہ ہم
اپنی بوئی ہوئی فصلوں کو پرایا جانیں

ہم سے کیا کون سا سورج ہے سرِ بام بلند
ہم تو وہ لوگ ہیں ہر دھوپ کو سایہ جانیں

بات کہنے کی نہیں ہے مگر اے کاش کہ لوگ
زیست کو وحشتِ ہستی کا کرایہ جانیں

خیمۂ صبر سے ٹکرا کے پلٹنے لگے تیر
اب انہیں سینۂ قاتل میں در آیا جانیں

جمیل یوسف

وہ ایک لمحہ

گرچہ اب تجھ سے ملاقات کا امکان نہیں
پھر بھی میں سوچتا ہوں
کیا عجب تو جو سرِ راہ کہیں مل جائے
کیا خبر وقت ہمیں پھر وہی لمحہ دے دے
تیرے دیدار کا روشن لمحہ
وہی لمحہ
جو ترے لمس کی خوشبو سے کبھی مہکا تھا
رنگ بن کر لب و عارض پہ ترے دہکا تھا
شام گلنار ہوئی جاتی تھی
میری آغوش شفق زار ہوئی جاتی تھی
اک ترا لمس حقیقت تھا
اور ہر شے کا وجود
وہم و گماں تھا گویا
از افق تا بہ افق
کوئی دستک تھی نہ کوئی آواز
اک ترے لمس کا لمحہ ہے کہ جو زندہ ہے
یہ حسیں لمحہ نہیں مر سکتا
گرچہ اب تجھ سے ملاقات کا امکان نہیں
پھر بھی میں سوچتا ہوں
کیا عجب تو جو سرِ راہ کہیں مل جائے

اک دعویٰ سونے چاندی کا اک جھگڑا دانے پانی کا
سوچو تو ہے بس عنوان یہی دنیا کی رام کہانی کا

طاقت کا نشہ فضول میاں دھن دولت پریت بھول میاں
یاں پھول کی طرح بکھر جاتا ہے ہر طرّہ سلطانی کا

بچپن کی سہانی یادیں ہیں اور ڈھلتی عمر کا سایہ ہے
اور ان دونوں کے بیچ کہیں دیکھا تھا خواب جوانی کا

یاد آتی ہے وہ نار بہت، تھے اس میں چھپے اسرار بہت
کیا اس کے حسن کی بات کروں اک عالم ہے حیرانی کا

دو دن کے لئے جب مل بیٹھے گلشن دیکھے جنگل دیکھے
ہے جس پہ درد جدائی ہے پھر اگلا موڑ کہانی کا

مطلب کے سوا سنتا ہی نہیں بے غرض کوئی ملتا ہی نہیں
اے دلِ ناداں کیا مان کریں اس دنیا آنی جانی کا

جہاں حسن کا منظر مل جائے واں دل کچھ دیر بہل جائے
ہے روزِ ازل سے شغل یہی اس دنیا کے زندانی کا

حسن اختر جلیل

اب کس سے بیاں کیجیے خاطر کی پریشانی
چہروں کے خرابوں پر مرقوم ہے ویرانی

آئی ہیں سفر کر کے کس منزلِ وحشت کا
گلشن نے بہاروں کی صورت نہیں پہچانی

طوفاں کے تھپیڑوں کی کیا ہم کو خبر ہوتی
ساحل سے کیا ہم نے اندازۂ طغیانی

سینے میں یہ ہلچل ہے کس حسنِ تعلق کی
چہرہ تو ہے ان دیکھا صورت تو ہے انجانی

المیہ ہے انساں کا جوہر کا نہاں رہنا
بلبل کو رُلاتی ہے نغمات کی ارزانی

بے تابئ انساں کو تسکین تو کیا دیتا
کرتا ہے طلب دونی یہ عصرِ فراوانی

ہم چاکِ گریباں ہی گلشن میں چلے آئے
صحرا میں بھلا بیٹھے اطوارِ گلستانی

شب کس کے تصور میں یاروں کا سفینہ تھا
دھندلا گئی تاروں کو احساس کی تابانی

اے دل تری آرزوئے سادہ
لے آئے گی اس کو بے ارادہ

روشن جو نہیں چراغِ جادہ
آنکھوں میں چمک ہے کچھ زیادہ

لوٹ آئے سمندروں سے مانجھی
طوفان کا بھانپ کر ارادہ

ق

سینوں میں ضمیر سو رہے ہیں
اوڑھے ہوئے حرص کا لبادہ

دل تنگ مثالِ گورِ غدّار
مانندِ سگاں دہن کشادہ

سرسبز ہے اب بھی درد کی شاخ
اے دل تری زندگی زیادہ

دستورِ بساط اب یہی ہے
شاہوں سے خراج لے پیادہ

مجبور ہے کج روی پہ انساں
پُر پیچ ہے زندگی کا جادہ

اس عہد میں کون کس کا ساتھی
پڑھتا ہوں نمازِ دل فرادیٰ

حسن اختر جلیل

ظہورِ یوسفِ جاں کی نشانیاں ہیں کئی
زبانِ خلق پہ اُڑتی کہانیاں ہیں کئی

ابھی شگفتہ ہے سینے میں آرزو کا چمن
ترے ستم سے ابھی خوش گمانیاں ہیں کئی

اس ایک جور سے دل کس طرح ہو آزردہ
ابھی تو یاد تری مہربانیاں ہیں کئی

جھکی نظر میں ہے نادیدہ جنتوں کی نوید
جواں لبوں پہ مچلتی کہانیاں ہیں کئی

ہوئی شباب میں بس ایک ہی خطا ہم سے
سمجھ لیا تھا کہ ایسی جوانیاں ہیں کئی

گزر تو لے یہ شبِ ہجر ایک بار اے دل
ترے نصیب میں راتیں سہانیاں ہیں کئی

داغِ تذلیل جبینوں سے مٹانے والا
منتظر لوگ ہیں کب آئے گا آنے والا

وقت ٹھہرا گیا جامد ہوئی رفتارِ حیات
جیسے یہ درد کا موسم نہیں جانے والا

موج در موج ہیں گرداب بلا کے حلقے
ہے یہاں کوئی سفینے کو بچانے والا

منقلب ہو گئے اس دور میں سب پیمانے
کھونے والے سے زیاں کار ہے پانے والا

زندگی ہے ستم و جور کی چڑھتی ہوئی دھوپ
آدمی خون پسینے میں نہانے والا

ان اندھیروں میں فروزاں ہے اگر شمعِ یقیں
کون ہے اس کی تب و تاب بڑھانے والا

اپنے پھیلے ہوئے سایوں کو سمیٹ اے شبِ ہجر
اب وہ خورشیدِ جہانگیر ہے آنے والا

مجھ کو یوں درد ملے اہلِ زمانہ سے جلیل
جس طرح خار چُنے پھول اُگانے والا

خاقان خاور

خواہشوں کے گلاب ہر جانب
زندگی کے سراب ہر جانب

کون اترے دلوں کے دریا میں
دام ہیں زیرِ آب ہر جانب

ننگے جسموں سے ٹوٹی قبروں تک
زندگی بے نقاب ہر جانب

آنکھ ہے ریت تو زباں کانٹے
تشنگی کے عذاب ہر جانب

کوئی پتہ کہیں کہیں خاور
ٹہنیاں بے حساب ہر جانب

پتہ پتہ سکوت بکھرا ہے
شام جیسے خزاں کا جھونکا ہے
ایک تنکے کی طرح بے بس ہوں
درد کی لہر ہے کہ دریا ہے
خواہشیں گرد گرد اڑتی ہیں
زندگی جیسے کوئی صحرا ہے
وہ سرِ شاخ جو کھلا ہے پھول
جتنا اونچا ہے اتنا تنہا ہے
اگلے پل کا بھی اعتبار نہیں
جسم و جاں کا بھی کوئی رشتہ ہے
اس کو پانے کی آرزو ہے مجھے
میری سوچوں سے بھی جو اونچا ہے

پروین شاکر

فبایّ آلاءِ ربکما تکذبٰن

دلآزاری بھی اِک فن ہے
اور کچھ لوگ تو
ساری زندگی اسی کی روٹی کھاتے ہیں
چاہے ان کا بُرج کوئی ہو
عقرب ہی لگتے ہیں
تیسرے درجے کے پیلے اخباروں پر یہ
اپنی یرقانی سوچوں سے
اور بھی زردی ملتے رہتے ہیں
مالا باری کیبن ہو یا پانچ ستارہ ہوٹل
کہیں بھی قے کرنے سے باز نہیں آتے
اوپر سے اس عمل کو
فقرے بازی کہتے ہیں
جس کا پہلا نشانہ عموماً
بل کو ادا کرنے والا ساتھی ہوتا ہے
اپنے اپنے کنوئیں کو بحرِ اعظم کہنے اور سمجھنے والے
یہ ننھے مینڈک
ہر ہاتھی کو دیکھ کے پھولنے لگتے ہیں
اور جب پھٹنے والے ہوں تو
ہاتھی کی آنکھوں پر پھبتی کسنے لگتے ہیں
کوّے بھی انڈے کھانے کے شوق کو اپنے
فاختہ کے گھر جا کر پورا کرتے ہیں
لیکن یہ وہ سانپ ہیں کہ جو
اپنے بچے
خود ہی چٹ کر جاتے ہیں
کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ
سانپوں کی یہ خصلت
مالکِ جن و انس کی
انسانوں کے حق میں
کیسی بے پایاں رحمت ہے!

بشارت علی سید

زندگی کے تار کو چھیڑا نہ کر۔؟
مجھ سے میرا حالِ دل پوچھا نہ کر

پہریداروں سے بچالے زندگی
بے خبر تو رات کو سویا نہ کر—

سوچ پر پہرے لگے ہیں آج کل
چشمِ گُل کی بات کر سوچا نہ کر

ناخدا جب تیرے قسمت ساز ہیں
تو لکیریں ہاتھ کی دیکھا نہ کر

وقت سے بہتر کوئی منصف نہیں
انصافوں کے داغ پر رویا نہ کر

اس زمیں پر کچھ نہیں اُگنے لگا
پھر یہاں پر چاہتیں بویا نہ کر

جمال نقوی

دنیا میں جتنے چہروں کو دیکھا قریب سے
جو دوست تھے وہ سب نظر آئے رقیب سے

اِک عمر تک اسیرِ بلا رہ چکے ہیں ہم
اب کیا ڈریں گے طوق و رسن سے صلیب سے

گہرے سمندروں میں ہمیں کچھ نہ مل سکا
ملتے ہیں سیپیوں میں بھی موتی نصیب سے

عیش و طرب کہ رنج و مصائب ہے زندگی؟
اس کا جواب چاہو تو پوچھو غریب سے

کل تک میں جن کے ساتھ رہا رات دن جمالؔ
کیوں آج لگ رہے ہیں وہ چہرے عجیب سے

آفتاب احمد شاہ

مجھ کو منظر کے صلے میں وہ صدا بھیجتا ہے
خوب وہ قرض مرا کر کے ادا بھیجتا ہے

سرپرستی بھی وہ کرتا ہے زبردستی سے
درد کرتا ہے عطا اور دوا بھیجتا ہے

میرے دشمن کی ہے تلوار مری گردن پر
اور تو ہے کہ مجھے حرفِ دعا بھیجتا ہے

سانپ جب جھوٹ کے دنیا میں بہت ہو جائیں
دستِ موسیٰ میں خدا سچ کا عصا بھیجتا ہے

آفتاب اُس نے پرکھنا ہو کسی کو تو اگر
وہ غنی کرتا ہے اور در پہ گدا بھیجتا ہے

انعام الرحمٰن سحری

تیرے بدن کا سفر طے کیا معیت سے
نواز اب تو مجھے چاہتوں کی خلعت سے

میں ناؤ کاغذی لے کر تیرے دلاسے کی
سمندروں میں اُترتا گیا عقیدت سے

تم اپنی ذات کے غاروں سے جھانک کر دیکھو
عذاب آئے گا اب آسمان کی چھت سے

کچھ اشتہار سے بانٹے گئے تھے لوگوں میں
پھر آ گئے مجھے پتھر بلا کی شدت سے

ہماری نسل میں انعام سچ و تابش ہو
بس ایک نقطہ تو لکھ دے اگر صداقت سے

ڈوبنے سے قبل اس کا استعارہ اور تھا
پانیوں کو پُر سکوں رکھنے کا چارہ اور تھا

ہر کسی میں رینگ کر زیرِ زمیں جانے کی دھن
شہر میں سورج اترنے کا نظارہ اور تھا

ایک کم فہمی محلے بھر میں ننگا کر گئی
چاندنی میں چھت پہ آنے کا اشارہ اور تھا

روشنی سر پہ اٹھائے تھا مگر رہبر نہ تھا
پانیوں میں ڈوبنے والا منارہ اور تھا

چاٹتے رہتے تھے جلد اپنی پسینے سے بھری
سوچ کے صحرا میں اپنا آب پارہ اور تھا

حسن عباس رضا

آوارگی میں حد سے گزر جانا چاہیئے
لیکن کبھی کبھار تو گھر جانا چاہیئے

اس بت سے عشق کیجیے لیکن کچھ اس طرح
پوچھے کوئی تو صاف مکر جانا چاہیئے

مجھ سے بچھڑ کے ان دنوں کس رنگ میں ہے وہ
یہ دیکھنے رقیب کے گھر جانا چاہیئے

جس شام شاہزادی فقیروں کے گھر میں آئے
اس شام وقت کو بھی ٹھہر جانا چاہیئے

رتِ وصال، وصل کا موسم بھی آ چکا
اب تو مرا نصیب سنور جانا چاہیئے

سیلابِ غم کی نذر سبھی خواہشیں ہوئیں
اب درد کا یہ دریا اتر جانا چاہیئے

جب ڈوبنا ہی ٹھہرا تو پھر ساحلوں پہ کیوں
اس کے لئے تو بیچ بھنور جانا چاہیئے

جن ساعتوں میں بے ہنری ہو عیارِ عقل
ان ساعتوں کا سونے کے ڈھ جانا چاہیئے

بیٹھے رہو گے دشت میں کب تک حسن رضا
پاؤں میں جاگ اٹھا ہے سفر جانا چاہیئے

شہناز نازلی

ملے بھی بچھڑے بھی برعکس موسموں کی طرح
عداوتیں بھی اگر کیں تو دوستوں کی طرح

تقاضے عشق کے تو مجھ سے بر ملامت مانگ
دلوں میں یہ رہے گویا خوشیوں کی طرح

کرو نہ سعی پکڑنے کی، ہم فضاؤں میں
نکل گئے ہیں بہت دور تتلیوں کی طرح

ابھر نہ سینے میں شدت سے اس قدر اے درد
امڈ پڑیں گی یہ جھیلیں سمندروں کی طرح

ملے تھے لہر کی مانند آ کے ساحل سے
بچھڑ کے جاتے ہیں اب اس سے کشتیوں کی طرح

کبھی کبھی تو کوئی والہانہ پیار کے ساتھ
بکھرنا چاہے ہے بانہوں پہ گیسوؤں کی طرح

کسی کے اشکِ ندامت لپیٹ کر اب تو
سمیٹتی ہوں اس آنچل میں موتیوں کی طرح

جب اس سے ٹوٹ کے ہر روز پھول پھینکتے ہیں
نظر میں چبھتا ہے گلدان کرچیوں کی طرح

ذرا سی دیر جو بیٹھا تھا نازلی نزدیک
میں اس کو ڈھونڈتی پھرتی ہوں پاگلوں کی طرح

سلطان رشک

پھر انقلاب قریۂ ماتم میں آئے گا
سُنتے ہیں وہ بہار کے موسم میں آئے گا

صدیوں سے منتظر ہوں مگر ایک شخص کا
وہ شخص جانے کون سے عالم میں آئے گا

میں ہوں برہنہ حرف، خداؤں کے سامنے
جاں نذر دے گا جو مرے پرچم میں آئے گا

وہ مجھ کو، اور میں خود کو نہ پہچان پاؤں گا
یہ موڑ بھی تعلق باہم میں آئے گا

سلطان رشک عہدِ محبت کہیں جسے
شاید وہ عہد خواب کے عالم میں آئے گا

دھوپ کی شدت میں ننگے پاؤں ننگے سر ن
اے دلِ سادہ سوادِ جبر سے باہر ن

کل کا سورج شادکامی کی خبر دے یا نہ د
چھوڑ اندیشے، حصارِ ذات سے باہر ن

میں کئی صدیوں سے گم ہوں خواب کے سکرات
آفتابِ صبح بیداری مرے سر پہ ن

عہدِ دار و گیر ہے، اپنا تشخص گم نہ کر
سوچ کی ساری فصیلیں توڑ کر باہر ن

ساحلوں پر تیرے استقبال کو آیا ہے ک
ڈوبنے والے ابھر، پھر سطحِ دریا پر ن

تیری دنیا منوّر ہو مرے افکار سے
پھر آزادی، مرے احساس کے اندر ا

اپنے خط و خال دیکھوں میں بھی اے سلطان ر
میری آنکھوں سے مگر اے خواب کے منتظ

افسانے

شفیق الرحمٰن

غارِ کا بُت

بچپن میں گرمیوں کی تعطیلات کا سال بھر انتظار رہتا۔ سکول تین مہینے کے لئے بند ہوتا تو والدین کے پاس جا ملتا۔ والد صاحب وسطِ ہند کے علاقے میں تعینات تھے۔ چنانچہ پنجاب سے کئی سو میل کا سفر طے کر کے میں والدی پہنچتا۔ سی۔ پی کا وہ علاقہ نہایت خوش نما تھا۔ جگہ جگہ شور مچاتی ہوئی ندیاں، پھلدار درخت، طرح طرح کے پھول پودے اور چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی۔

رنگ برنگے پرندوں، قسم قسم کے جانوروں اور جھینگروں کے شور سے جنگل ہر وقت گونجتے رہتے۔ ان گھرے اونچے اونچے درخت تھے، ان کے نیچے چھوٹے درخت، پھر نیچے جھاڑیاں ـــ اور ان سب پر گھنی بیلیں چڑھی ہوئیں ـــ کہ وہاں سے گزرنا محال تھا۔

رِم جھم رِم جھم بارش ہوتی تو کئی کئی روز نہ تھمتی۔ ہوا کا ہر جھونکا اپنے ساتھ ایک نئی خوشبو لاتا اور رات کو ا چمکتے کہ لالٹین کی ضرورت نہ پڑتی لیکن جہاں اتنی خوبصورتی تھی وہاں خطرہ بھی تھا۔ ہری بھری پھولدار جھاڑیوں میں زہر کھوڑے تھے۔ اونچی قدِ آدم گھاس میں سانپ، بچھو، کن کھجورے اور درختوں پر بڑی بڑی زہریلی مکڑیاں۔

گھنے جنگل میں جتنے سائے متحرک ہوتے ان میں شیروں، چیتوں اور ہاتھیوں کی پرچھائیاں بھی ہوتیں۔ اکثر سننے صبح جو ڈاک کا ہرکارہ ندی کے پل پر ملا تھا دوپہر کو اُسے تیندوے نے مار ڈالا۔ یا یہ کہ مکھیا جی (نمبردار) کسی معاملے جا رہے تھے کہ راستے میں درندے نے انہیں زخمی کر دیا۔ سانپ تو تقریباً ہر جگہ تھے ـــ گھاس میں، پانی میں، صاف میں، پگڈنڈی پر، مکان میں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات جب تیز ہوا چلتی تو کسی درخت سے سانپ گرتا۔

میں چھوٹا تھا، اس لئے میرا خاص خیال رکھا جاتا۔ باہر نکلتا تو گھٹنے تک اُونچے ربڑ کے جوتے پہنا کر کسی کے مغرب کے بعد گھر سے باہر جانے کی ممانعت تھی۔

زیادہ وقت ننھی بہن کے ساتھ گھر کے باغیچے میں گزرتا۔ ہم دن بھر تتلیاں پکڑتے، گلدستے بناتے، پھل توڑتے، نہ سکول کی حاضری تھی نہ استادوں کا ڈر۔

چھٹیاں تیزی سے گزر جاتیں۔ پھر والدین سے سال بھر کے لئے جدا ہو کر طویل سفر طے کرنا پڑتا۔

محکمہ انہار میں ہونے کی وجہ سے والد صاحب کو قصبوں، شہروں سے دور جنگلوں، کیمپوں میں رہنا پڑتا، لیکن انہیں ایسی زندگی پسند تھی۔ ورزش، فوٹو گرافی اور خطرناک جانوروں کا شکار ــــ ان کے محبوب مشغلے تھے اور کھلی جگہیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ اپنی بڑی ساری موٹر سائیکل پر وہ گھوڑے کی سواری کو ترجیح دیتے۔ محکمہ جنگلات کے افسروں اور اپنے انجنیئر ساتھیوں کے ساتھ وہ اکثر درندوں کے شکار کو جاتے اور کبھی کبھی شیروں، چیتوں کی کھالیں دوستوں کو بھیجی جاتیں۔

بعض اوقات جب وہ رات کے دو یا تین بجے واپس آتے تو ہم منتظر ہوتے کہ مزید کسی خطرناک واقعے کا ذکر سنائیں گے لیکن وہ خاموش رہتے۔

ہم حیوانوں کے متعلق پوچھتے تو وہ ہمیشہ ایک فقرے سے ٹال دیتے۔ جب تک انسان جانوروں کو تنگ نہ کرتے وہ خود پہل نہیں کرتے اور یہ کہ ہتھیار صرف آدم خور درندوں پر استعمال کرنے چاہئیں۔

مقامی باشندے دُبلے پتلے اور امن پسند تھے۔ ہر جگہ غربت تھی لیکن چوری کی وارداتیں بہت کم ہوتیں۔ شام کو تھکے ہارے لوگ روشنی کر کے گاتے ناچتے تو سماں بندھ جاتا۔

شاید ان کے بھولپن نے انہیں بے حد وہمی بنا دیا تھا۔ بھوتوں، چڑیلوں، ارواحِ خبیثہ اور کالے جادو پر اعتقاد رکھتے تھے اور ان سے اتنا ہی ڈرتے ہیں جتنا کہ جنگلی درندوں سے جو ہر وقت ان کے ارد گرد منڈلاتے رہتے، وباؤں، بیماریوں اور حادثوں کو وہ دیوی دیوتاؤں کی خفگی سے منسوب کرتے اور باقاعدہ علاج کرانے کی بجائے مورتیوں کے سامنے چڑھاوے پیش کرتے۔

ہمارے گھوڑے کا سائیس سناتا کہ ایک دفعہ کسی نوجوان نے شمشان میں کوڑا کرکٹ ڈال دیا۔ وہ بمشکل وہاں سے باہر نکلا ہو گا کہ کسی اَن دیکھی ہستی نے اُسے بھسم کر کے رکھ دیا۔

چپڑاسی کا قصہ بتایا کہ ایک عورت نے دیوی کے سامنے درخواست کرتے ہوئے منت مانی، لیکن مراد بر آنے پر اسے اپنا وعدہ یاد نہ رہا۔ دیوی نے سب کے سامنے اُسے مفلوج کر دیا۔

منشی جی سناتے کہ وہ اتفاق سے یونہی مذاق مذاق میں کسی دیوتا کی شان میں گستاخانہ جملے کہہ بیٹھے۔ اسی رات جب وہ دوسرے گاؤں جا رہے تھے تو ان کے پیچھے بلائیں لگ گئیں۔ خوش قسمتی سے ان کے ہاتھ میں جانوروں کو ڈرانے کے لئے مشعل تھی چونکہ بھوت پریت بھی آگ سے ڈرتے ہیں۔ اس لئے بلائیں انہیں ضرر نہ پہنچا سکیں۔ انہوں نے ہمت کر کے کن انکھیوں

سے جھانکا ـــــ تین کالی کلوٹی بھیانک شبیہیں ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں اور یہ تعاقب دیر تک جاری رہا۔ ایک جگہ تو مشعل بجھنے لگی تھی لیکن انہوں نے جلدی سے ایک موٹی سی ٹہنی مشعل سے جلالی۔ آخر صبح کا اجالا پھیلا تو بلائیں غائب ہوئیں اس پر انہوں نے توبہ کی کہ آئندہ ایسی گستاخی کبھی نہیں کریں گے۔

اس قسم کی کہانیاں سُن سُن کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہاں کا چپہ چپہ آسیب زدہ ہے اور بھوت پریت انسانوں پر کڑی نگرانی رکھتے ہیں۔ جو کچھ بھی کہا جائے یا کیا جائے وہ فوراً ان تک پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر میں خاموش رہتا۔ کیا ہوا جو کبھی کبھار والد صاحب سے کچھ پوچھ لیا لیکن انہیں خوف و ہراس سے نفرت تھی اور پھر سائنس کی تعلیم نے انہیں واہمے اور قیاس آرائیوں سے دور کر دیا تھا۔

ان کا سمجھانے کا طریقہ بھی مختلف تھا۔ نہ وہ کسی خاص سبق پر زور ڈالتے، نہ طویل لیکچر دیتے، بس باتوں باتوں میں ریاضی اور سائنس کی مفید باتیں ذہن نشین کرا دیتے۔

شیشے کے گلاس کو نصف پانی سے بھر کر اس میں پنسل ڈبوئی۔ پنسل ٹوٹی ہوئی دکھائی دینے لگی تو بتایا ـــــ "آنکھوں کو جو کچھ نظر آتا ہے وہ اکثر صحیح ہوتا ہے لیکن ہمیشہ نہیں ـــــ"

سلیٹ پر دو لمبی متوازی لکیریں کھینچ کر ان پر ترچھے رُخ میں چھوٹی چھوٹی لائنیں ڈالیں تو وہ لمبی لکیریں بھی ترچھی معلوم ہونے لگیں۔

"یہ نظر کا دھوکہ ہے" وہ بتاتے اور جب چھوٹی ترچھی لائنیں مٹا دیتے تو لمبی سطریں دوبارہ متوازی ہو جاتیں۔ پھر درمیانی لمبی انگلی شہادت کی انگلی پر کھینچ کر ان دونوں کے بیچ میں کنکری رکھ دیتے بالکل یوں لگتا جیسے ایک کی بجائے دو کنکریاں چھو رہا ہوں۔

"کنکری ایک ہے لیکن ان دونوں انگلیوں کی نسیں مختلف ہیں" وہ سمجھاتے۔ دور ندی کے کنارے دھوبی کپڑے دھوتا پہلے کپڑا پتھر پہ لگتا ہوا نظر آتا۔ اس کے بعد دھماکہ بعد میں سنائی دیتا۔

"قصور نہ آنکھوں کا ہے نہ کانوں کا۔ روشنی کی رفتار اور آواز کی رفتار میں فرق ہے۔ تبھی مغالطہ ہوتا ہے بڑے ہو گے تو ایسی ایسی بے شمار باتیں سائنس کی کتابوں میں پڑھو گے"

ایک روز انہوں نے تھرمامیٹر دکھایا۔ نارمل ڈگری کی طرف اشارہ کر کے اسے ذرا سا گرم کیا تو پارہ ایک سو پانچ تک جا پہنچا۔

اب اسے کسی بالکل تندرست آدمی کے منہ میں ایک منٹ رکھ کر اسے ایک سو پانچ ڈگری دکھا دی۔ ذرا سی دیر میں وہ ہاتھ پاؤں میں اینٹھن سی محسوس کرنے لگے گا۔ پھر ماتھا گرم ہو گا اور پھر سچ مچ بخار چڑھ جائے گا لیکن یہ بخار خوف سے چڑھے گا۔ خوف انسان کا دشمن ہے جو اس کے سوچنے، محسوس کرنے، دیکھنے سننے پر اس طرح مسلط ہو جاتا ہے کہ مجبوری

سمجھ بوجھ میں توازن نہیں رہتا۔ لہٰذا خلافِ معمول واقعات پر ڈرنے یا پریشان ہونے کی بجائے انہیں اطمینان سے جان کر سائنٹیفک حل معلوم کرنا چاہیئے کیونکہ ہر غیر معمولی بات کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوا کرتی ہے ۔

جب میں سائیں، چپراسی اور منشی جی کی سنائی ہوئی کہانیوں کا ذکر کرتا تو وہ بتاتے کہ اس علاقے میں جو اموات بھوتوں یا دیوتاؤں سے منسوب کی جاتی ہیں ان میں سے بیشتر ایسی بیماریوں سے ہوتی ہیں جنہیں مقامی لوگ نہ پہچانتے ہیں نہ ان کا علاج کراتے ہیں۔ گرمیوں میں اکثر سننے میں آتا ہے کہ فلاں شخص کو نہ جانے کیا دکھائی دے گیا کہ وہ لمحوں میں ختم ہو گیا ـــــ دراصل ایسی موت یہاں SUN STROKE سے ہوتی ہے۔ یہ سیدھے سادے ان پڑھ لوگ چیچک جیسی مہلک چیز کو دیوی سمجھ کر پوجتے ہیں اور خوشامداً اسے ماتا کہتے ہیں ۔

سکول بند ہونے میں چند ہفتے باقی تھے کہ والد صاحب کا خط ملا جس میں ان کے تبادلے کی خبر تھی۔ نئی جگہ پہلے کیمپ سے دور تھی۔ خط میں ٹرینوں کے اوقات درج تھے اور ان سٹیشنوں کے نام بھی جہاں گاڑیاں تبدیل کرنا تھیں ۔

میں خوش ہوا کہ ایک نیا علاقہ دیکھوں گا جہاں طرح طرح کے نظارے ہوں گے۔ شاید وہاں کی تتلیاں اور پرندے اور قسم کے ہوں۔ پھل پھول بھی مختلف ہوں ۔

چھٹیاں شروع ہوئیں اور میں روانہ ہوا۔ آخری سٹیشن پر والد صاحب ملے۔ تیس پینتیس میل کا سفر موٹر سے طے کیا جسے یک ہٹا کٹا مضبوط شخص چلا رہا تھا وہ ہم سے پنجابی میں باتیں کرتا رہا ۔

نئی جگہ پہلے مقام سے بالکل مختلف تھی۔ ویران سے کیمپ کی بجائے یہ ایک آباد گاؤں تھا جس میں جگہ جگہ پرانی شاندار رات کے کھنڈر تھے اور کئی سہ منزلہ عمارتیں، جو شکستہ حالت میں تھیں ایک طرف بڑا سا پختہ تالاب تھا اور ساتھ ایک پہاڑی پر ٹوٹا پھوٹا سا قلعہ جہاں سنگِ سرخ کی سلوں کے بڑے بڑے ڈھیر تھے ۔

گاؤں سے فرلانگ کے فاصلے پر ہمارا کشادہ اور اونچا مکان تھا جو کسی زمانے میں بہت نفیس ہو گا لیکن اب اس کی لت خستہ سی تھی۔ والد صاحب کے آنے پر مکان کی مرمت ہو رہی تھی۔ مزدور سفیدی کرتے کرتے ٹکوں سے دیواروں کو ٹھتے گونج سی پیدا ہوتی تو وہ بتاتے کہ کمروں کی دیواریں کھوکھلی ہیں اور ان کے اندر راستے بنے ہوئے ہیں۔ ایک معمار ے سارے پتھر کو ہلانے کی کوشش کرتا رہا۔ پتھر تھوڑا سا سرکتا لیکن پھر واپس آجاتا۔ اس نے سب کو اکٹھا کیا اور بتانے کہ اس پتھر کو ہلانے سے کوئی خفیہ دروازہ ضرور کھلتا ہو گا اور یہ کہ یہاں جگہ جگہ دروازے پوشیدہ ہیں جن کے نیچے سیڑھیاں رتہہ خانے ہیں۔ یہاں سے ایک سرنگ پرانے قلعے تک جاتی ہے اس جگہ دفینے بھی ضرور ہوں گے کیونکہ یہ کبھی پنڈاروں ویلی تھی۔ پنڈاروں کا نام میں نے پہلی دفعہ سنا تھا اس لئے کئی سوال پوچھے۔ انہوں نے بتایا کہ تقریباً سو سال پہلے پنڈاروں نے اس علاقے میں تباہی مچا رکھی تھی۔ یہ چوروں، ٹھگوں اور ڈاکوؤں کا ایک منظم گروہ تھا جو عوام کی جان و مال کا دشمن تھا

دولت کے لالچ میں وہ کبھی معصوم ہمسفروں کا گلا گھونٹتے تو کبھی کسی گاؤں پر باقاعدہ ڈاکہ ڈالتے اور مال وصول کرنے کے لئے طرح طرح کی ایذائیں پہنچاتے۔ یہ مکان کسی زمانے میں ان کا اڈہ رہ چکا تھا —— یہیں لوٹ مار کے پروگرام بنتے، یہیں قیدیوں پر تشدد ہوتا اور اسی جگہ راگ رنگ کی محفلیں جمتیں۔ تبھی یہاں سے اب تک پُراسرار آوازیں آتی ہیں خصوصاً اندھیری راتوں میں جب ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے ہوں۔ چمگادڑیں اڑ رہی ہوں، الّو بول رہا ہو تو کبھی آہیں اور سسکیاں سُنائی دیتی ہیں۔ کبھی لوگوں کے آپس میں لڑنے جھگڑنے کی آوازیں آتی ہیں اور تلواریں ٹکراتی ہیں۔ کبھی کبھی سازوں کی جھنکار اور نغمے سنائی دیتے ہیں۔ پھر جیسے بہت سے آدمی سیڑھیوں پر چڑھتے اور اُترتے ہیں۔

انہوں نے مجھے تسلی دی: "یہاں عجیب عجیب باتیں ہوا کریں گی۔ اگر اوپر کی منزل میں آگ کے شعلے نظر آئیں تو ڈرنا مت۔ اندھیرے میں کبھی دھماکے سُنائی دیں اور کبھی دبی دبی چیخیں تو گھبرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہر چھٹی ساتویں رات یہاں کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ تم بھی عادی ہو جاؤ گے۔

اس روز میں بہت ڈرا اور اپنے کھٹولے کو کھینچ کر والد صاحب کے پلنگ کے پاس لے آیا۔ امّی کو یہ جگہ پسند نہیں تھی۔ جب سے وہاں تبادلہ ہوا چھوٹی بہن لگاتار بیمار رہنے لگی۔ امی کو پریشان کن خواب نظر آیا کرتے۔

پھر ایک کمرے میں آیا کو کسی نامعلوم شے نے ایسا دھکا دیا کہ وہ منہ کے بل گری۔ حالانکہ نہ صرف وہ کمرہ خالی تھا بلکہ آس پاس کے کمروں میں بھی کوئی نہیں تھا۔ مالن نے قسم کھا کر بتایا کہ گذشتہ رات اس نے تالاب میں ایک تھالی تیرتی دیکھی۔ تھالی میں چراغ جل رہا تھا، پاس کٹا ہوا ناریل رکھا تھا اور ایک چمکیلی لمبی چھری۔ - - - یہ کالا جادو تھا۔ کوئی کسی کی جان کے درپے تھا۔ پھر پڑوس کے باغ میں دن دہاڑے ایک چیتا دیکھا تھا۔ موسلادھار بارش ہوئی تو یکایک باورچی خانے کی دیوار دھڑام سے گری اور ساتھ ہی تانبے کی بڑی ساری دیگ، جس کا ڈھکنا کھلتے ہی چاروں طرف سفید اور زرد رنگ کے سکّے اور چند زیور بکھر گئے۔

امی نے کہا کہ یہ چیزیں منحوس ہیں اس لئے اسی وقت گاؤں کے مُکھیا کو بھجوا دیں۔ بعد میں منشی جی نے بتایا کہ انہوں نے زیورات میں چند انگوٹھیاں ایسی دیکھی تھیں جو سوکھی ہوئی انگلیوں میں تھیں۔

والد صاحب دورے سے واپس آئے تو انہوں نے کسی قسم کے تعجب کا اظہار نہیں کیا۔ البتہ یہ کہا کہ پرانے سکّے اور زیور مکھیا کو بھیجنے کی بجائے کسی میوزیم کے لئے بھیجے جاتے تو بہتر ہوتا۔

جب میں نے معماروں سے سُنی ہوئی باتیں بتائیں تو انہوں نے برسات کے موسم اور ہوا میں نمی کا ذکر کیا کہ گیلی نمناک فضا میں آواز کی گونج بڑھ جاتی ہے لہٰذا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ آواز کتنی دور سے آ رہی ہے جس روز بارش ہوتی ہے دور دور کی صدائیں یوں صاف سنائی دیتی ہیں جیسے بالکل قریب سے آ رہی ہوں اور پھر ہمارے مکان سے گاؤں صرف ایک فرلانگ ہی تو ہے۔ رات کو وہاں سے گانے بجانے کی صدائیں بھی آسکتی ہیں۔ بچوں کے رونے

جانوروں کے ڈکرانے اور لوگوں کے جھگڑنے کا شور بھی سُنائی دے سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بارش کی رات کو یہ آوازیں دھوکہ دے سکتی ہیں۔

پھر وہ واقعہ پیش آیا۔۔۔۔۔۔

اس علاقے میں جگہ جگہ ہفتہ وار ہاٹ (بازار) لگتے تھے۔ اس روز آس پاس کے چیزیں فروخت کرنے والے ایک مقررہ جگہ اکٹھے ہو جاتے، جن سے گاؤں والے ہفتے بھر کا راشن خرید لیتے۔

ہمارے دونوں ملازموں کو سیر سپاٹے کا بڑا شوق تھا تبھی وہ ہمیشہ کسی دور کے ہاٹ کو پہنچتے تاکہ سارا دن باہر گزار سکیں۔ والد صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ باہر شکار پر گئے ہوئے تھے مجھے امی سے ہاٹ پر جانے کی اجازت اس شرط پر ملی کہ سہ پہر سے پہلے واپس آ جاؤں گا۔ فاصلہ صرف چند میل کا تھا جو کچھ لینا تھا دوپہر تک خرید لیا پھر مداری کا تماشا دیکھتے رہے جوگیوں کا گانا سنا۔ ایک باغ سے آم اور جامنیں کھائیں۔ حتیٰ کہ شام ہو گئی۔

میں نے انہیں کئی مرتبہ یاد دلایا کہ امی میرا انتظار کر رہی ہوں گی لیکن وہ کسی نہ کسی طرح ٹال دیتے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خاص پروگرام ہے جس کے انتظار میں وہ جان بوجھ کر وقت ضائع کر رہے ہیں۔

میرے اصرار پر انہوں نے بتایا کہ اندھیرا ہو چکنے کے بعد یہاں سے قریب ہی ایک رسم ادا کی جائے گی جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس علاقے میں بہت ہی کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے اس کا مشاہدہ کیا ہوگا، کیونکہ اس قسم کے واقعات کبھی کبھار ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ تماشہ دیکھے بغیر نہیں جانا چاہیئے۔ پھر ہم عشاء تک گھر پہنچ جائیں گے اور بہانہ بنا دیں گے کہ بارش کی وجہ سے ندیاں چڑھ آئی تھیں۔

میں نے پوچھا کہ وہاں کیا ہوگا۔ وہ کہنے لگے کہ پہلے سنا دیا تو سارا لطف جاتا رہے گا۔ خود دیکھ لینا۔ مغرب کے بعد ہم روانہ ہوئے اور ایک بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلتے چلتے پہاڑی کے دامن میں رُک گئے۔ "وہ جگہ ہے" انہوں نے چند درختوں کی طرف اشارہ کیا جو دو پہاڑیوں کے بیچ میں تھے۔ چاروں طرف تاریکی تھی۔ سوائے ان درختوں میں جہاں ایک لالٹین جل رہی تھی جس کے گرد بیس بائیس دیہاتی چپ چاپ بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ ہم جھاڑیوں کی اوٹ میں آگے بڑھے اور اوپر کے پتھروں پہ بیٹھ گئے۔

لگاتار خاموشی اور اندھیرے سے وحشت سی ہونے لگی۔ ملازموں نے سرگوشی کی ۔۔۔ بس اب ذرا سی دیر ہے جہاں ہم بیٹھے ہیں اس کے نیچے ایک غار کا منہ ہے جس کے اندر ایک بہت بڑا بت ہے۔ یہ کالی دیوی کا ہے جس سے سب خوف کھاتے ہیں۔ یہ لوگ جو سامنے بیٹھے ہیں پڑوس کے گاؤں سے آئے ہیں۔ ابھی ایک مجرم یہاں لایا جائے گا جس پر یہ شبہ ہے کہ اس نے اپنے ساتھیوں سے غداری کی ہے۔ اسے ایک چراغ دیں گے جس میں اتنا تیل ہوگا جو آدھی رات

یمک جل سکے۔ اُسے غار کے اندر اکیلے جانا ہو گا اور دیوی کے سامنے آدھی رات تک رہنا ہو گا۔ اگر وہ معصوم ہوا تو دیوی اسے کچھ نہیں کہے گی۔ سب لوگ اسے معاف کر دیں گے لیکن اگر قصور دار ہوا تو جرم کی سزا پائے گا اور دیوی اسے تہس نہس کر دے گی۔

کچھ دیر کے بعد آہٹ سی ہوئی۔ دو آدمی ایک نوجوان کو گھسیٹتے ہوئے لا رہے تھے۔ غار کے سامنے اس کے ہاتھوں سے بندھی ہوئی رسی کھول دی گئی۔ چراغ روشن کیا گیا اور اس کے ہاتھ میں تھما کر اُسے غار میں دھکیل دیا گیا۔ غار کا منہ کشادہ نہیں تھا، اسے جھک کر داخل ہونا پڑا۔

میں نے پوچھا کہ کیا غار اتنا ہی تنگ ہے لیکن ملازموں نے مجھے خاموش کرا دیا اور کان میں بولے کہ ایک دفعہ اندر پہنچ جاؤ تو غار میں کافی جگہ ہے۔ دیوی کا بت ہاتھی جتنا بڑا ہے۔

ہم کافی اونچی جگہ پر تھے اور بالکل چھپے بیٹھے تھے۔ غار کا منہ ہم سے قریب تھا۔ ہر طرف سکوت طاری تھا۔ ایک منٹ گزرا۔ دوسرا۔ تیسرا۔ چوتھا۔ پانچواں ۔ غار کے اندر خاموشی تھی۔

"تو اندر پہنچ چکا ہے؟" دفعتاً باہر والوں میں سے ایک آدمی چلّایا۔

"ہاں ۔ غار میں سے آواز آئی۔"

"چراغ جل رہا ہے؟"

"ہاں ۔۔۔"

"دیوی نظر آ رہی ہے؟"

"ہاں ۔"

"اچھا۔ تو ہم غار کا منہ بند کرنے لگے ہیں۔"

وہ دو بڑی ٹہنیاں گھسیٹ کر لایا اور غار کا راستہ روک دیا۔

ایک اور شخص نے آگے بڑھ کر نعرہ لگایا ۔۔۔ ہمیں یقین ہے کہ تو دیوی کی طرف پیٹھ کئے ایک کونے میں چھپا ہوا ہے۔ بزدل کہیں کا۔ ہمت ہے تو دیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے سامنے جا ۔۔۔" اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔

"اگر تو دیوی کے پاس نہیں گیا تو وہ خود تیرے پاس آ جائے گی۔"

کچھ دیر کے بعد اندر سے آواز آئی ۔۔۔ "اس کی لال لال زبان ابھی ہلی ہے۔ وہ مجھے گھور رہی ہے۔"

غار میں سے آواز کبھی گونجدار سی آتی اور کبھی مدھم سی۔ کوئی فقرہ سمجھ میں آتا، کوئی نہیں۔

"آگے بڑھ کر بتا کہ تو نے کچھ نہیں کیا"۔ باہر کا آدمی چلّایا۔

"ابھی ابھی اس کی آنکھیں جھپکی ہیں۔ اس کے بازو بھی ہلے ہیں۔ یہ پتھر کی نہیں، اس میں تو جان ہے۔"

"اس سے کہہ کہ تو بے قصور ہے ــــ"

"مجھ سے کیسی بھی قسم لے لو ــــ میں نے کچھ نہیں کیا ــــ مجھے باہر نکال کر جو بھی سزا چاہو دے دینا لیکن یہاں بند نہ رکھو ــــ"

"تجھے آدھی رات تک اندر رہنا ہوگا ــــ"

"عمر بھر تمہارا غلام بن کر رہوں گا ــــ جو حکم دو گے مانوں گا ــــ بس یہاں سے نکال لو ــــ میں ابھی زندہ ہوں ــــ وہ میری طرف آ رہی ہے ــــ" دہشت زدہ آواز میں وہ التجا کر رہا تھا۔

میں نے ملازموں سے کہا کہ اس بے چارے کی مدد کرنی چاہیئے۔ وہ چپکے سے بولے کہ ہم مجبور ہیں۔ اگر ہم نے ذرا بھی کوشش کی تو یہ سایا اگر وہ ہمارے پیچھے لگ جائے گا۔

غار کے قیدی پر ہذیان کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔

"تم سب میرے بزرگ ہو ــــ میرے عزیز ہو ــــ مجھے باہر نکال کر زہر دے دینا ــــ بھوکا رکھ کر مار دینا ــــ اس کے بازو میری طرف بڑھ رہے ہیں ــــ وہ میری طرف آ رہی ہے ــــ"

اور میں نے ملازموں سے کہہ دیا کہ اگر انہوں نے فوراً ہی کچھ نہ کیا تو گھر پہنچ کر یہ سب کچھ بتا دوں گا۔

"لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

فوراً مجھے پہلوان کا خیال آ گیا۔ "اسی وقت جا کر پہلوان کو لے آؤ۔" شام کو ہم پہلوان سے ہاٹ میں ملے تھے۔ یہ وہی ڈرائیور تھا جو والد صاحب کو اور مجھے سٹیشن سے لایا تھا۔ بڑا طاقت ور اور دلیر آدمی تھا۔ پہلوانی کے علاوہ اسے لاٹھی چلانے میں بھی مہارت تھی۔ بڑا منہ زور اور اکھڑ تھا۔ والد صاحب سے ملنے اکثر آیا کرتا۔ وہاں سب اس سے ڈرتے تھے۔

"پہلوان مٹھائی والے کی دکان پر ہوگا۔ اگر دوڑتے ہوئے گئے تو مل جائے گا۔" میں نے اصرار کیا۔ ملازم جو سہمے ہوئے تھے ہچکچانے لگے۔ میں نے دوبارہ دھمکی دی کہ والد صاحب کو بتا دوں گا۔ آخر ان میں سے ایک اٹھا اور چپکے سے نکل گیا۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین سا ہو گیا تھا کہ اگر پہلوان آ گیا تو سب کچھ درست ہو جائے گا۔

غار سے مدھم سی آواز آئی ــــ "میرے پاؤں زمین میں دھنس گئے ہیں۔ میں ہل نہیں سکتا۔ کچھ مدد کر سکتے ہو تو کر لو ــــ" اس کے بعد کوئی صدا سنائی نہیں دی۔

چاروں طرف مکمل خاموشی تھی۔ درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ ہوا ساکن تھی۔ جھینگر تک خاموش تھے۔ ایک ایک لمحہ طویل ہوتا گیا۔ سکوت اور گہرا ہو گیا حتیٰ کہ سب چیزیں بے جان معلوم ہونے لگیں اور وہ سارا منظر جیسے ایک بھیانک

خواب میں تبدیل ہو گیا۔ جیسے صدیاں گزر گئیں اور پتہ تک نہ ہلا۔

آخر ایک سمت میں کھڑکا ہوا۔ ٹارچ کی روشنی اور بھاری قدموں کی آہٹ سے معلوم ہوا کہ کوئی آ رہا ہے پہلوان پہنچ گیا تھا۔ وہ ہمارے قریب سے گذرا۔ اس کے ہاتھ میں لٹھ تھا اور چہرے پر غصّے کے آثار۔ وہ ان سب کو بے تحاشا گالیاں دے رہا تھا۔ سیدھا ان کی طرف لپکا اور اُن پر لاٹھی، ٹکوں اور ٹھوکروں سے پل پڑا۔

"پہلوان آگیا ـــــ دوڑو یہاں سے ـــ" نعرہ لگا اور بھاگڑ پڑ گئی۔ اس نے غار کے منہ سے ٹہنیاں کھینچیں اور اندر چلا گیا ـــــ غار سے بے ہوش قیدی کو کندھے پر لاد کر تاریکی میں غائب ہو گیا۔

گھر پہنچ کر میں نے موسلا دھار بارش اور چڑھی ہوئی ندیوں کا بہانہ کر دیا اور کچھ نہ بتایا۔ اگلے دن ملازموں سے معلوم ہوا کہ پہلوان اس غریب کو کندھے پر اٹھا کر گاؤں لے گیا۔ پھر موٹر میں لٹا کر قصبے کے ہسپتال میں پہنچا۔ جہاں ڈاکٹر نے یقین دلایا ہے کہ وہ بچ جائے گا۔ پہلوان نے پولیس کو بھی رپورٹ کر دی ہے۔

والد صاحب کو شاید پہلوان نے بتا دیا ہو، اگرچہ انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا لیکن اس کے بعد جب کبھی دورے یا شکار پر جاتے تو مجھے ساتھ لے جاتے۔

ایک روز ہم اسی غار کے قریب سے گزرے۔ میں ٹکٹکی باندھے غار کے منہ کو دیکھ رہا تھا وہ بھانپ گئے اور کہنے لگے کہ "یہ اور ایسے ہی کئی اور بتوں والے غار اس علاقے میں ہیں۔ مختلف مذہبی طبقوں کے لوگ طرح طرح کی مورتیوں کو پوجتے ہیں، منتیں مانتے ہیں، چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ ان میں ہی کچھ ایسے غار بھی ہیں جن میں پنڈاروں کی دیوی کے بت ہیں ـــــ پنڈاروں نے وسط ہند کے سارے علاقے میں طوفان بپا کیا ہوا تھا۔ مغلوں کے زوال کے بعد افراتفری کے زمانے میں جتنے چور، اُچکے، ڈاکو اور ٹھگ آئے اُن میں سب سے ظالم اور سنگدل پنڈارے تھے۔ جو کالی دیوی کے نام پر معصوم لوگوں کو لوٹنے کے لئے قتل کیا کرتے۔ ان دنوں ہر راجہ اور نواب کی اپنی ذاتی فوج ہوا کرتی۔ چنانچہ جس شخص کا جی چاہتا اپنی پسند کی وردی پہن لیتا۔ یہ پتہ چلانا مشکل ہو جاتا کہ وہ واقعی سپاہی ہے یا نہیں۔ کبھی پنڈارے اپنے آپ کو سپاہی ظاہر کرنے کیلئے وردی پہن لیتے۔ کبھی سیدھے سادے راہگیروں کا بہروپ بھرتے اور کبھی مالدار مہاجن بن جاتے۔ مقصد صرف ایک ہوتا کہ کسی طرح معصوم مسافروں سے واقفیت کر کے ان کے ساتھ ہو لیں۔ پھر ایک منظم سازش کے تحت موقعہ پاتے ہی درختوں کے جھنڈ میں یا کسی ندی کے کنارے جہاں قبریں پہلے سے کھود دی جاتی تھیں، وہاں آناً فاناً اپنے ساتھی مسافروں کا گلا گھونٹ ڈالتے۔ ان کا ہتھیار معمولی سا رومال ہوتا جس کے ایک کونے پر سکہ باندھتے۔ اپنے شکار کی پشت سے رومال کو اس استادی سے گھماتے کہ سکہ والا کونہ گردن کو لپیٹتا ہوا گھوم کر واپس آ جاتا اور رومال کے دونوں کونے کھینچ کر گلا دبا دیا جاتا۔ یہ کارروائی چشم زدن میں ختم ہو جاتی۔ یا پھر پنڈارے اپنے کسی سردار کی کمان میں گاؤں یا قصبے پر باقاعدہ حملے کرتے۔ محاصرے کے

بعد ایک ایک کو پکڑ لیا جاتا اور ایذائیں دے کر ان کی ساری پونجی وصول کی جاتی۔ ان دنوں سفر کرنا بھی خطرناک تھا اور اس علاقے میں کہیں رہنا بھی مشکل تھا۔ آخر پچھلی صدی میں انگریزوں نے ان کے خلاف مہم شروع کی اور انہیں بالکل ختم کر دیا۔ تب کہیں لوگوں کو نجات ملی۔ پنڈارے جا چکے ہیں لیکن ان کی نشانیاں باقی ہیں ـــ کالی کے بُت۔ عجیب عجیب رسمیں اور وہ گروہ جو ایسی رسموں پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ غالباً اس غار میں بھی کالی کی مورتی ہوگی۔ صدیوں سے انسان بتوں کو پوجتا چلا آیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ پرستش فقط ایک ہستی کے لئے روا ہے ـــ اور وہ ہے اس خالق کی ذات۔ باقی سب وہم ہے۔ انسان کے ذہنی انتشار نے لاتعداد ہیولے بنا کر کھڑے کر دیئے اور انہیں صرف وہ لوگ مانتے ہیں جو اس قسم کی چیزوں کے ماننے کے خواہشمند ہوں۔ پنڈاروں نے کالی کو اس لئے چُنا کہ وہ ان کے مقصد کے لئے موزوں ترین تھی۔ اگر وہ کالی کو نہ بھی مانتے تب بھی اتنے ہی ظالم رہتے ـــ"

امّی برابر اصرار کر رہی تھیں کہ اس منحوس مکان کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ ایک رات آیا نے دو تاریک سائے دیکھے جو ایک اور سائے کو کندھے پر اٹھائے چل رہے تھے۔ اُسے کئی روز تیز بخار رہا۔

گودام کی صفائی کراتے وقت دو چھوٹی چھوٹی ڈراؤنی سی مورتیاں ملیں۔ امی کے کہنے پر انہیں زمین میں دبوا دیا گیا۔ پھر اوپر کی منزل میں آگ لگ گئی جسے مشکل سے بجھایا گیا۔ آگ لگنے کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔ نہ آس پاس کوئی آدمی تھا اور اس وقت تیز بارش بھی ہو رہی تھی۔

آخر والد صاحب نے وہ مکان چھوڑ دیا اور ہم کیمپ میں چلے گئے۔ چلتے وقت مکھیا کی بیوی ملنے آئی اور امی کو بتایا کہ ہم سے پہلے جو کنبہ اس مکان میں رہتا تھا ان کا اکلوتا بچہ ان چھوٹی چھوٹی مورتیوں سے کھیلا کرتا۔ ایک روز نہ جانے اس سے کیا غلطی ہوئی کہ کسی نامعلوم چیز نے اسے لہولہان کر دیا۔ "مجھے خوشی ہے کہ آپ اپنے بچے صحیح سلامت لے کر جا رہی ہیں۔" وہ بولی۔

والد صاحب پنجاب کے تبادلے کے لئے دیر سے کوشش کر رہے تھے۔ آخر وسطِ ہند کی سترہ سالہ ملازمت کے بعد وہ پنجاب میں آ گئے۔ عرصے تک وہ علاقہ اور وہاں کی باتیں ہمیں یاد رہیں پھر آہستہ آہستہ یادیں دھندلی پڑنے لگیں۔

ڈاکٹری کی تعلیم نے سی۔ پی کے بھوت پریت بھلا دیئے لیکن غار کا واقعہ یاد رہا۔ خاص طور پر کسی چاروں طرف سے گھری ہوئی بند جگہ میں تو اکثر یاد آ جاتا۔ پڑھائی کے سلسلے میں سکاٹ لینڈ گیا تو کوئلے کی کانوں میں جانا پڑا۔ نیچے اترتے ہی غار کا خیال آ گیا اور میں بہانہ کر کے باہر نکل آیا۔

اسی طرح سمندری جہاز کا چھوٹا کیبن، کسی مکان کا تہہ خانہ، چھوٹے ہوائی جہاز کا سفر ـــ اس قسم کی گھٹی ہوئی جگہیں وہ سانحہ یاد دلا دیتیں۔ قاہرہ میں اہرام دیکھتے ہوئے جب جھک کر اس تنگ سرنگ میں داخل ہوا اور فرعون کے مدفن کی چھوٹی سی کوٹھڑی میں پہنچا تو فوراً غار کے قیدی کی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔

پھر اتفاق سے ایک کورس پر سی۔ پی جانے کا موقعہ ملا۔ اس غار کو دیکھنے کا تجسس مجھے اسی گاؤں کی طرف کھینچ یا تھا جو ٹریننگ سنٹر سے دور نہیں تھا۔ اپنے ساتھیوں سے پرانے واقعات کا ذکر کیا تو وہ خوب ہنسے، خصوصاً انجینئر جو ملٹری میں ڈیزائن کرتا تھا اور رسالے کا ایک تجربہ کار افسر جو حال ہی میں برما کے محاذ سے لوٹا تھا اور وہاں لاتعداد ڈراؤنی مورتیاں دیکھ چکا تھا، ان دونوں نے تو خوب مذاق اڑایا۔

آخر میں نے ان دونوں کو مجبور کر دیا کہ بطور پک نک چلے چلیں۔ اتوار کے ساتھ سنیچر کی آدھی چھٹی ملا کر ہم روانہ ہوئے یہاں پہنچ کر دیکھا کہ ہمارا سہ منزلہ مکان کبھی کا گر چکا تھا۔ گاؤں میں پرانے ملازموں کو تلاش کیا کسی کا پتہ نہ چل سکا۔ کھمیا کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے لڑکے کو غار کے متعلق علم نہیں تھا، لیکن وہ ہمارے ساتھ ہو لیا۔

ہم بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی سے ان جانی پہچانی پہاڑیوں میں جا پہنچے۔ انجینئر نے چراغ جلا کر ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہم اندھیرے غار کے منہ میں جھک کر داخل ہوئے۔ دس پندرہ قدم چلنے کے بعد غار کی چھت اونچی ہوتی گئی اندر مکمل تاریکی تھی اور سوائے اس راستے کے جس سے ہم آئے تھے کوئی روزن نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ اندھیرا کم ہونے لگا اور آنکھوں کو صاف دکھائی دینے لگا۔ ہاتھی جتنا بُت ہمارے سامنے تھا۔ اس کی اُبلتی ہوئی سرخ آنکھیں ہمیں گھور رہی تھیں۔ لال زبان جبڑوں سے باہر لٹک رہی تھی اور طویل بازو یوں پھیلے ہوئے تھے جیسے ابھی کسی کو دبوچ لیں گے۔

اور میں سوچ رہا تھا کہ جو کچھ بچپن میں یہاں سُنا تھا۔ وہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس سے پہلے اور غالباً اس کے بعد بھی کیسوں کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے اس غار میں لایا گیا ہو گا۔

اس گیلے گیلے بند اور تاریک مقام میں کئی گھنٹے تنہا ٹھہرنا پڑے تو بُت کے خوف کے علاوہ شاید دیگر عناصر بھی اثر ڈالیں۔ تازہ ہوا کی کمی ـــ جلتے ہوئے چراغ کا جمع ہوتا ہوا دھواں ـــ کاربن ڈائی آکسائیڈ جیسی گیسیں ـــ ناکردہ اور کردہ خطاؤں کا احساس ـــ اور انجانے نتائج کا خوف ـــ ان کے علاوہ فوق الفطرت قوتوں کا وہم ـــ یہ سب حواس پر اثر ڈالتے ہوں گے۔

یکایک انجینئر نے خوشی کا نعرہ لگایا ـــ "وہ دیکھو، اس کی آنکھیں حرکت کر رہی ہیں۔" اس نے چراغ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور بائیں طرف ہٹنے کو کہا۔ جب میں بائیں رخ چلا تو دیوی کی آنکھیں واقعی دو مرتبہ جھپکیں۔ "آنکھوں کو کسی خاص پتھر سے بنایا گیا ہے اور کاریگروں نے انہیں ایسی مہارت سے تراشا ہے کہ اگر روشنی کے منبع کو ادھر سے ادھر ہلایا جائے تو منعکس ہوتے ہوئے روشنی چھپنے لگتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آنکھیں جھپک رہی ہوں۔ یہ نظر کا دھوکہ ہے اور بڑی استادی سے ساخت کیا گیا ہے۔" انجینئر نے میرے ہاتھ سے چراغ لے لیا، چند قدم آگے بڑھ کر پیچھے ہٹا، پھر ترچھے رُخ میں یہی عمل دہرایا۔

"یہ دیکھا ـــ؟ یہاں چراغ لئے کھڑے رہو تو بُت کے نچلے دو بازو نظر آتے ہیں۔ اس طرف ہٹو تو روشنی فقط اوپر کے بازوؤں سے منعکس ہوتی ہے۔ اس طرف جاؤ تو صرف درمیان کے بازو چمکتے ہیں ـــ یعنی ہر جگہ سے بازوؤں کی ایک

جوڑی نظر آسکتی ہے لیکن چراغ کو ذرا ہٹائیں تو فوراً اس کی جگہ دوسری جوڑی سامنے آجائے گی۔ پھر تیسری۔ غار میں جنبش کرنے والا معاملہ نہ ہو تو یہی سمجھے گا کہ بازو ہل رہے ہیں ـــ کاریگری کا کمال ہے۔" باری باری ہم چراغ لے کر ادھر ادھر گئے۔ انجینئر کا کہنا بالکل صحیح نکلا۔

چراغ کا دھواں اکٹھا ہو رہا تھا۔ VENTILATION نہ ہونے کی وجہ سے غار کی ہوا بوجھل ہوتی جا رہی تھی اور ہم چاروں چپ چاپ کھڑے تھے ـــ رسالے کا جہاندیدہ افسر جو ذرا دیر پہلے قہقہے لگا رہا تھا۔ انجینئر جس نے ابھی ابھی سائنٹیفک دلائل پیش کئے تھے۔ سکھیا کا لڑکا جو شاید یہاں دوبارہ آئے گا ـــ اور میں جس کا تجسس جنون کا روپ تھا۔ ہم یوں خاموش اور مودبانہ کھڑے تھے جیسے کسی نامعلوم طاقت نے ہمیں باندھ کر رکھ دیا ہو۔

وقت گزرتا گیا۔ آہستہ آہستہ یوں لگا جیسے وہی بت پہلے سے دگنا ہو گیا ہو، پھر تگنا۔ اس کی سرخ آنکھیں باہر نکل آئیں۔ اس کے بازو ہماری طرف بڑھنے لگے۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے سانس گھٹ رہا ہو۔ آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی۔ جنبش کرنی چاہی تو جیسے قدم زمین میں دھنسے ہوئے تھے۔

دفعتاً یوں لگا کہ ہم میں سے کوئی بھی ہل نہیں سکتا۔ پھر کچھ گھٹی ہوئی آواز آئی ـــ "خدا کے لئے مجھے باہر نکالو۔"

(اسے وی آنا (آسٹریا) سے چھپنے والے بین الاقوامی مجموعے "دنیا کی بہترین پُراسرار کہانیاں" میں شامل کیا گیا تھا)

ناقابلِ یقین

دو مسافر ایک ٹرین میں سفر کر رہے تھے

ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

"کیا آپ جن، بھوت پر یقین رکھتے ہیں؟"

دوسرے نے جواب دیا

"نہیں" ـــ اور غائب ہو گیا۔

حجاب امتیاز علی

شب گزیدہ

مجھے دریائے شون کے ساحل پر آئے تیسرا ہی دن تھا کہ یہ واقعہ پیش آیا۔
کئی مہینوں سے ڈاکٹر گار کسی طبی تحقیق کے سلسلے میں یہاں مقیم تھا۔ اسی کے اصرار پر میں اپنی سہیلی خوشتوی کے ساتھ برائے چندے یہاں آئی تھی کہ یہ واقعہ گزرا۔

پچھلے تین دن بڑے لطف میں کٹے۔ سال بھر کی شہد کی مکھی کی معروفیت سے زیادہ معروف زندگی کے بعد یہ چند دن مجھے اور خوشتوی کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہو رہے تھے۔ میں کتابیں لکھا کرتی تھی اور وہ فلسفہ پڑھتے پڑھاتے تھک جایا کرتی تھی۔ لہذا ہماری زندگی یکا گانا من کرر تھی۔ اب فرصت کے چند دن نصیب ہوئے تو ہم زندگی کو کچے گانے کی بجائے ہلکی خوشگوار موسیقی بنانے پر تل گئی تھیں۔

چنانچہ میں اور خوشتوی سمندر کے رخ کھلنے والے لمبے دریچوں میں بیٹھی بیت بازی کیا کرتیں۔ کبھی غزلیں گانے لگ جاتیں۔ کبھی شطرنج کھیلنے بیٹھ جاتیں مگر میں اپنی طبیعت کی فطری بے چینی کی وجہ سے ڈیڑھ دو گھنٹے جم کر بیٹھ نہیں سکتی تھی۔ لہذا شطرنج کی بازی نامکمل چھوڑ کر اٹھ جاتی۔ پھر ہم دونوں ایک باندھ کر باورچی خانے میں چلی جاتیں۔ اور اپنی تازہ حاصل کی ہوئی تراکیب کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش پر چولہے کے آگے جا کھڑی ہوتیں۔ وہاں بھی مسلسل ہا تھ ملتے ہی ملتے رہ جاتیں۔

غروب آفتاب کے بعد ڈاکٹر گار کی معروفیت ختم ہو جاتی۔ ہم تینوں فراغت کے ایک خوشگوار احساس کے ساتھ اکٹھے بیٹھ جاتے۔ آپ کو معلوم ہے ڈاکٹر گار کتنا اچھا داستان گو ہے۔ لطیفے۔ حیرت انگیز طبی واقعات، عجیب تجربات، اس پر سونے پر سہاگہ اس کے عالمانہ بیانات پر مضحکہ خیز تبصرے۔ غرض تمام شام یہ باتیں سن کر میں اور خوشتوی ہنستے ہنستے لوٹ جاتیں۔ لیکن تیسرے دن یہ واقعہ پیش آیا۔ جو ابھی آپ کو سناتی ہوں۔

اس دن ہم نے سر شام ہی کھانا کھا لیا تھا۔ کیونکہ ایک تو خوشتوی نے اس شام ایک نئی ترکیب سے سمندری مچھلی لیمو کے رس سے تلی تھی۔ دوسری بات ڈاکٹر گار ایک بالکل نئی دلچسپ اور زندہ کہانی سنانے والا تھا۔ اور ہم دونوں بے چین ہو رہی تھیں کہ اسے سنیں۔ مگر یوں نہ ہو سکا۔!

میں ہمیشہ لمبے دریچوں سے باہر جھانک جھانک کر موسم کی جدید تبدیلیوں سے آگاہ رہنے کی عادی ہوں۔ جس وقت میں عادتاً باہر جھانک رہی تھی تو خوشتوی منہ ہی منہ میں کوئی سریلا نغمہ گنگنا رہی تھی۔ اور ڈاکٹر گار خوشتوی کی تلی ہوئی لذیذ مچھلی سے لطف اندوز ہونے کے بعد ایک موضوع پر خیال کر رہا تھا۔

صوفی چیخ پڑی۔ "ہیں ہیں ہیں۔ کیا کر رہی ہو؟ باہر سمندر میں جاگر و گی رودی۔ اتنا جھک کر نہ جھانکا کرو۔"!!

اس کے ٹوکنے پر میں کچھ سنبھلی لیکن مسلسل باہر جھانکتے ہوئے بولی۔ "آسمان کے نیچے اور سمندر کے اوپر ایک عجیب قسم کی دھند سی چھا رہی ہے"!!

شوشو ہنس پڑی " تم ہمیشہ موسم کے متعلق غلط اور الٹی پیش گوئیاں کرتی رہتی ہو روحی۔ دریچے کا پٹ بند کرکے ادھر آ بیٹھو۔ ڈاکٹر نگار آج ایک بڑی دلچسپ کہانی سنانے والے ہیں۔"

میں ذرا تشویش کے لہجے میں بولی " جانتی ہوں۔ لیکن وہ بولی " ڈاکٹر نگار نے اب سگار سلگاتے ہوئے کہنے لگا " زندگی کے بارہ ماسے کی ہوئی کہانی روحیا۔ بدلی کو گولی مارو اور تم یہاں آ بیٹھو۔"

میں نے دریچہ بند کرنے سے پہلے مناسب سمجھا کہ ایک آخری تکمیلی نظر زمین و آسمان اور سمندر پر ڈال لوں۔ چنانچہ میں پھر جھک کر جھانکنے لگی۔ شوشو خوف زدہ ہو کر چلا اٹھی " ہائے ہائے ہائے۔ لگتا ہے آج جھانکتے جھانکتے سمندر میں جا گرو گی۔"

میں نے سر اندر کر لیا " نہیں شو۔ اب نہیں جھانکوں گی۔ لیکن جو بدلی اٹھ رہی ہے وہ مجھے کچھ غیر معمولی سی لگ رہی ہے۔ اور وہ طوفان بھی برپا کر سکتی ہے۔"

" تمہیں کیا معلوم؟" شوشو نے چڑ کر کہا۔

ڈاکٹر نگار ہنس پڑا " روحیا پیاری۔ تمہیں مصنف ہونے کی بجائے محکمہ موسمیات کا افسر اعلیٰ ہونا چاہیئے تھا۔"

شوشو اکتا کر بولی " اور مجھے اس محکمے پر ذرا بھی اعتبار نہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ غلط پیش گوئیاں کرتے رہتے ہیں۔"

ڈاکٹر نگار ہنس کر بولا " یہی تو ہماری خوش قسمتی ہے۔ روحیا اب کھڑکی بند کرکے یہاں آ بیٹھو۔ کہانی شروع کرنے والا ہوں۔ دونوں بیٹھ جاؤ۔ نہ ہاں کرو نہ ناں ــــ اور سنو کہ مجھ پر ایک دفعہ کیا گزری۔

" کیا گزری؟" ـــــ شوشو نے ہمہ تن گوش ہو کر پوچھا۔ میں بولی " اب دیر نہ لگایئے ڈاکٹر۔ سگار رکھ دیجئے داکھ دان میں۔ اور یہاں ملاحتی زبان نہ ہو۔ جو انسانی مصائب کو جانوروں کے خونخوار پنجوں کا سہارا لے کر ظاہر کرتی ہے۔" مانی خالص کہانی ہی اور کلاسیکی انداز میں سنایئے

ڈاکٹر نگار نے سگار انگلیوں میں پکڑ لیا اور بولا۔ میں بزدل تھوڑا ہی ہوں جو اپنے جذبات کو سہاروں کی مدد سے ظاہر کروں۔ اچھا اب سنو کہ ایک دفعہ مجھ پر کیا گزری۔"

وہ کہانی کا آغاز کر ہی رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

نہ نہ ـــ" شوشو چیخ پڑی " اسے نہ اٹھایئے ـــ کہانی رہ جائے گی۔"

" کسی مریض کا ٹیلیفون نہ ہو۔" ڈاکٹر نگار نے قدرے متفکر ہو کر کہا۔ پھر ریسیور اٹھا لیا۔ پوچھنے لگا " ڈاکٹر نگار بول رہا ہوں۔ ابھی صرف علامات ہیں یا دورہ تیز ہو چکا ہے؟ ـــ پھر تو میں ابھی آیا۔"

وہ کچھ کہے سنے بغیر بڑی تیزی سے صدر دروازے کی طرف گیا۔ کھونٹی پر سے اپنا لمبا کوٹ اتار کر پہننے لگا پھر بولا " پیارو۔ مجھے گھنٹہ بھر لگ جائے گا۔ اس شخص کو دل کا دورہ پڑا ہے! پھر جھک کر اپنا طبی بیگ اٹھا لیا۔

ہم دونوں سخت مایوس ہوئیں ـ

شوشو نے افسردہ ہو کر کہا " لیکن اس موسم میں آپ کیسے جائیں گے؟"

" کیوں؟" ڈاکٹر نگار نے حیران ہو کر پوچھا " موسم کو کیا ہو گیا؟ بالکل ٹھیک ہے۔"

"رودی کہتی تھیں طوفان آئے گا" خوشبو نے کہا۔

وہ رودی کا ذہنی طوفان ہے جو اکثر آتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر گار نے میری طرف آتے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا حرج ہے ہم دونوں آپ کے ساتھ چلیں۔۔؟" میں نے خود ہی پیش کیا۔

کچھ بعد ڈاکٹر گار بڑی تیزی سے کار چلا رہا تھا اور ہم دونوں چپ چاپ اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔

موسم کے متعلق اکثر انسانی پیش گوئیاں سراسر غلط ثابت ہوتی رہتی ہیں مگر اس رات ! !

ہم شہر سے باہر نکل آئے۔ سڑک کی روشنیاں بھی ہم سے فاصلے پر رہ گئی تھیں اور ہم بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑاتے مریض کا گھر ڈھونڈ رہے تھے۔ ڈاکٹر گار کبھی دائیں کو موڑتا کبھی بائیں کو۔ اسے مریض کے ہاں فوراً پہنچنا تھا اور اس تگ و دو میں نصف گھنٹہ گزر چکا تھا۔ اسی کشمکش و پیچ میں اس کی نظر ایک پٹرول پمپ پر پڑی گئی۔ کہنے لگا: "اس ویرانے میں پٹرول پمپ ایک نعمت ہے۔ یہیں سے مریض کے گھر کا پتہ اور مریض کی حالت کے متعلق ٹیلیفون کر کے معلوم کر لیتا ہوں۔"

وہ فون کر کے فوراً واپس آ گیا۔ کار پہ چڑھتے چڑھتے کہنے لگا: "مریض ختم ہو چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے دل کا دورہ شدید تھا۔ اب واپس چلو۔"

اسی دوران طوفان شروع ہو گیا۔ جس بڑھیا کو میں نے پائیں باغ کے دریچے سے جھانک کر دیکھا تھا اور کہا تھا کہ یہ طوفان بھی بپا کر سکتی ہے۔ اب وہ بپا کرنے لگی تھی ——— میں ذرا شرمندہ اور گھبرائی ہوئی بیٹھی تھی کہ ڈاکٹر گار اور خوشبو کہیں یہ نہ سمجھیں کہ میں نے اس کے خلاف بدلی سے کوئی سازش کی تھی ———

تیز و تند ہوائیں۔ گہری تاریکی۔ بجلی کی چمک، بادلوں کی کڑک، نامعلوم اور ناہموار راستہ، ستم بالائے ستم، بارش کے قطروں کے ساتھ ژالہ باری بھی شروع ہو گئی تھی۔ جس سے اندیشہ تھا کہ کار کے شیشے نہ متاثر ہوں۔

میں اپنے آپ کو خواہ مخواہ ناکردہ گناہ مجرم محسوس کر رہی تھی۔ کیونکہ سمندری دریچے سے بار بار باہر جھانک کر میں نے ہی طوفان کی پیش گوئی کی تھی۔

پھر جب ایک بڑا سا اولا کار کے شیشے پر آ گرا تو میں نے کہا: "کچھ دیر کے لئے کار یہیں کھڑی کر دیجئے ڈاکٹر۔"

"بہک کر نا پڑے گا۔ ڈاکٹر نے کہا پھر ادھر اُدھر دیکھ کر بولا "مگر کہاں؟ راستہ نظر نہیں آتا۔ آبادی کا نام و نشان نہیں۔ ہم شہر سے بہت دور نکل آئے ہیں۔"

اتنے میں خوشبو نے کہا: "رودی سچ کہتی تھی کہ طوفان آئے گا۔"

میں اپنا نام سن کر کچھ گھبرا سی گئی۔

کچھ دیر بعد ژالہ باری ختم ہو گئی۔ مگر طوفان کا زور بڑھ گیا۔ ہم منزل کی تلاش میں بھٹکنے لگے۔ وہ ہوا جو کلاسیکی داستانوں میں ہوتا آیا ہے۔ ہم منزل کی طوفانی رات میں دور سے کسی عمارت کی روشنی نظر آئی۔

اس روشنی کو دیکھ کر ڈاکٹر گار کہنے لگا: "اس ویرانے میں یہ عمارت کہاں سے آ گئی؟ میں دراصل ان شہروں کے لئے اجنبی ہوں۔ یہاں کے [illegible] سے ابھی اچھی واقفیت نہیں ہوئی۔"

جب کار بھکولے کھاتی ہوئی عمارت کے آگے جا کھڑی ہوئی تو شیشوں میں سے نظر آیا کہ اندر بہت کچھ ہو رہا ہے۔
"معلوم ہوتا ہے یہاں کوئی تقریب منعقد ہو رہی ہے۔" شوشو نے کہا۔ "یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" ڈاکٹر گار نے کار کی چابی جیب میں رکھتے ہوئے متوحش ہو کر کہا۔

"مگر یہاں باہر مہمانوں کی سواریاں نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "اندر لوگ تو بہت ہیں ان کی سواریاں کہاں ہیں؟"

"شاید سب سائیکلوں پر چڑھ کے آئے ہوں اور طوفان کی وجہ سے اندر لے گئے ہوں۔" شوشو نے کہا۔

میں ہنس پڑی۔ "سائیکلوں پر؟ کیسے ممکن ہے شو۔ تمہاری بھی عجیب باتیں ہوتی ہیں"۔

اتنی دیر ڈاکٹر گار اندر جھانکتا رہا۔ پھر بولا "تقریب بڑی معلوم ہوتی ہے۔ اور ہمارے پاس دعوتی بلاوا نہیں ہے ——— اندر کیسے جائیں؟ ———"

شوشو کہنے لگی "اس بھیڑ میں ہمیں کون پہچانے گا کہ ہم مہمان ہیں کہ میزبان ———"

تھوڑی دیر کی تشویش کے بعد آخر ڈاکٹر گار نے صدر دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ فوراً کھل گیا اور ایک خاتون نے آگے بڑھ کر کہا "آئیے آئیے۔ کب آئے؟"۔

"ابھی ابھی ———" ہم ہی سے کسی نے کہا۔

خاتون کہنے لگیں "ابھی ——— ؟ طاعون آیا ہوا تھا کہ شاید نا مُٹ؟"

ڈاکٹر گار کچھ نہ سمجھ سکا پوچھنے لگا "کیسے؟"

خاتون کہنے لگیں "مجھے طاعون ہو گیا تھا۔ توبہ توبہ۔ بڑی اذیت اٹھائی۔ بخار۔ بیہوشی۔ گلٹی۔!"

جی ہاں یہی ہوتا ہے طاعون میں ——— ڈاکٹر گار نے جواباً کہا۔

پھر وہ خاتون اچانک مہمانوں میں جا ملیں۔

لمحہ بھر بعد شوشو کہنے لگی "یہ عورت مجھے پاگل معلوم ہوتی تھی"۔

"معلوم ہوتی تھی کیا ——— بالکل پاگل ہے"۔ ڈاکٹر نے کہا۔

"شکر ہے چلی گئی۔ مجھے پاگلوں سے ہمدردی تو ہے مگر بڑا ہی ڈر لگتا ہے ———" میں نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

ہم تینوں پناہ گزین ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دوسرے کمرے میں جا نکلے۔ وہاں کا ماحول بتا رہا تھا کہ یہاں کسی کی شادی ہو رہی ہے۔ ایک چوکی پر مسند بچھی ہوئی تھی۔ اور دو لہا دلہن زرق برق لباس پہنے گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے سرنگوں بیٹھے ہوئے تھے۔

"یہ تو شادی کا جشن منایا جا رہا ہے ———" ڈاکٹر گار نے کہا۔

یہ سن کر میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا "تو کیا ہمیں کچھ روپے سلامی دینے پڑیں گے؟"

"یقیناً ———" شوشو نے کہا۔

"پھر تم دونوں جاؤ —— مجھے اس قسم کی رسومات سے کوئی دلچسپی نہیں"۔ ڈاکٹر گار نے کہا"۔

میں نے اپنا دستی بٹوہ کھولا۔ سو روپے کا ایک نوٹ سلامی میں دینے کے لئے نکالا۔ اور آگے بڑھی۔ اور نہایت انکساری سے نوٹ دولہا دلہن کے آگے رکھ دیا۔ اور شرمیلے لہجے میں بولی "آپ کی سلامی"

دولہا نے نظر اٹھا کر مجھے اور شوشو کو دیکھا۔ پوچھنے لگا۔ آپ کب آئیں؟"

"ابھی —— میں نے جواباً کہا۔

ابھی آئیں؟ —— آسمانی بجلی گری تھی؟"

نہیں تو —— کس پر"؟ ... میں پریشان ہو کر پوچھنے لگی"۔

دولہا کہنے لگا "طوفانوں میں آسمانی بجلی گرا کرتی ہے اور بھسم کر دیتی ہے"۔

میں حیران ہو کر بولی "یہ واقعہ کس پر گذرا؟ ابھی تک تو کوئی بجلی نہیں گری —— ہاں باہر طوفان چل رہا ہے"۔

ڈاکٹر گار قریب آگیا۔ مسکرا کر بولا "دراصل اسی طوفان نے ہمیں یہاں پہنچایا ہے"۔

یہ سن کر دلہن بول پڑی "پھر تو ضرور بجلی گری ہوگی اور سب بھسم ہو گئے ہوں گے"۔

ڈاکٹر گار حیران ہو کر بولا "نہیں صاحب۔ نہ بجلی گری نہ کوئی بھسم ہوا۔ یہ واقع کس پر گذرا؟"

دولہا کہنے لگا "وہ جو دروازہ آپ کے پیچھے ہے۔ وہاں ہم دونوں کھڑے تھے۔ اچانک بجلی کوندی اور بڑے زور سے گر پڑی"۔

"اس وقت ہماری شادی ہو رہی تھی"۔ دلہن نے کہا"۔

ڈاکٹر گار پریشان سا ہو گیا۔ پوچھنے لگا "کب کا واقعہ ہے؟"

دولہا کہنے لگا۔ پچاس سال ہو گئے"۔

یہ سن کر ہمارے ہوش اڑ گئے"۔

شوشو نے سرگوشی کی "یقیناً جانو یہ پاگل خانہ ہے"۔

میرا یہ حال تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔

ڈاکٹر گار کہنے لگا "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں صاحب۔ پچاس سال؟ —— آپ دونوں کی عمریں بیس سال سے زیادہ کی نہیں لگتیں"۔

ہم تینوں اپنے میزبانوں کی اوٹ پٹانگ باتوں سے حواس باختہ ہو رہے تھے کہ ایک نوجوان قریب آگیا اور شوشو سے پوچھنے لگا "آپ بھی سمندر میں غرق ہوئی تھیں؟"

شمیم کر کھڑی ہو گئی جھلا کر بولی "یہ ضرور پکا پاگل خانہ ہے۔ باہر نکل چلو ورنہ ہم بھی پاگل ہو جائیں گے"۔

وہ نوجوان ساکت کھڑا رہا۔ پھر لمحہ بعد اپنا سوال دہرایا۔ "یہاں آنے سے پہلے سمندر میں غرق ہوئی تھیں؟"
شوشو ناراض ہو کر بولی۔ "کیا مطلب؟ —— اس وقت میں یہاں کھڑی ہوں۔ سمندر میں غرق ہوتی تو یہاں کھڑی ہوتی؟"
نوجوان سپاٹ لہجے میں کہنے لگا: "سمندر میں غرق ہونے کے بعد ہی تم یہاں پہنچ سکتی تھیں۔"
"تم سب مجھے خطرناک پاگل لگ رہے ہو۔ یہاں سمندر کا کیا ذکر ہے؟ اس میں کون غرق ہوا تھا؟" شوشو ناگواری کے لہجے پلو پوچھنے لگی۔

نوجوان نے کہا "چھٹی کا دن تھا۔ میں سمندر میں تیر رہا تھا۔"

"تو کیا ہوا تھا؟" شوشو نے جل کر پوچھا۔

"غرق ہو گیا تھا ——" یہ کہہ کر نوجوان مہمانوں کی بھیڑ میں جا ملا۔

شوشو سخت متوحش ہو گئی۔ ڈاکٹر گار بھی ان کی بے ربط گفتگو سن کر سخت پریشان نظر آ رہا تھا۔

میں بولی۔ "سارے کے سارے مشکوک لوگ ہیں۔"

ڈاکٹر گار کہنے لگا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کیا ہیں؟ —— دیوانے۔ لٹیرے۔ چور۔ ڈاکو یا اسمگلر۔"

"یا کسی قسم کی زہریلی شراب پی گئے ہیں؟ کوئی بھی اپنے ہوش میں نہیں لگتا ——" شوشو نے کہا۔

"اب ان باتوں میں وقت ضائع کرنے کا فائدہ؟ ——" میں اکتا کر بولی۔ "جس رستے سے آئے ہو اسی سے واپس چلو۔"

ہم صدر دروازے کی طرف چلے جہاں سے اندر داخل ہوئے تھے۔ مگر ہماری جدوجہد رائیگاں گئی۔ یا تو وہ دروازہ ہی غائب تھا یا ہم سمت بھول گئے تھے۔ باوجود کوشش کے ہم صدر دروازے تک نہ پہنچ پائے۔ مایوس ہو کر لوٹ رہے تھے کہ ایک شخص سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

"جناب صدر دروازہ کدھر ہے جس سے ہم اندر آئے تھے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

معزز آدمی کھڑا ہو گیا۔ ہم تینوں پر نظر ڈالی پھر بولا۔ "بیک وقت آپ تین؟"

ڈاکٹر گار معذرت کے لہجے میں مسکرا کر بولا۔ "باہر طوفان چل رہا تھا۔

جناب، میں مجبوراً یہاں آنا پڑا۔"

"کار کا حادثہ ہو گیا تھا ——؟" معزز آدمی نے سوال کیا۔

"جی نہیں ——" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"تو پھر ——؟ کسی حادثے کے بغیر یہاں آ گئے؟"

"یہاں آنے کے لئے حادثہ ضروری ہے؟" ڈاکٹر گار نے پوچھا۔

جواب ملا "تین مہینے ہوئے میں شہر کی طرف جا رہا تھا کہ میری کار ایک پیڑ سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئی۔ ساتھ ہی

نا بھی !"———

ہم تینوں نے حیران ہو کر ان حضرت پر ایک نظر ڈالی۔ ڈاکٹر گار کہنے لگا: "مگر اس وقت تو آپ بھی سالم ہیں"۔

"ہاں ——— میرا خیال تھا کار کے حادثے نے آپ تینوں کو یہاں پہنچا دیا ہے"۔ یہ کہہ کر وہ بھی ہجوم میں جا ملے۔ اس گفتگو کے بعد اس معزز ہستی کے پاگل ہونے میں بھی کوئی شبہ نہ رہا۔

شدید تشویش کے عالم میں ہم تینوں صدر دروازے کی تلاش میں پھر سے نکل پڑے۔ ایک طرف کو جا رہے تھے کہ ایک ایوان پر نظر پڑی جہاں بے شمار میزیں لگی ہوئی تھیں اور لگتا تھا کہ ان پر کسی ضیافت کا کھانا چنا ہوا ہے۔ کیونکہ چاندی کے ظروف اور مشروب پینے کے گلاس لگے ہوئے تھے۔ پریشانی کے عالم میں ڈاکٹر گار کو ہمیشہ بھوک لگا کرتی ہے۔ یہ دیکھ کر کہنے لگا "پیارو۔ ٹھہر جاؤ۔ جانے سے پہلے ذرا تازہ دم ہو جائیں۔ پاگلوں کی صحبت نے نیم مردہ کر دیا ہے۔ آؤ کچھ کھا پی لیں"۔

ہم ایوان طعام میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر گار نے فوراً ایک رکابی اٹھائی اور چمچہ لے کر ایک کٹورے سے بریانی لی جس میں سے بھاپ نکل رہی تھی پھر چیخ پڑا: "ارے دیکھو ——— یہ کیا؟ صرف بھاپ ہی بھاپ ہے۔ ظروف خالی پڑے ہیں"۔

اس واقعہ کے بعد ہم وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ مان لیا کہ یہ سارے لوگ مشکوک تھے۔ مگر اب ہمارے سامنے سوال یہ تھا کہ دسترخوان پر لگے ہوئے کھانے کہاں گئے اور اس میں سے اٹھتی ہوئی یہ بھاپ کیا شے تھی؟ کسی جن کی کارستانی تھی یا سائنس کا کرشمہ

ایٹمی واجوان؟ ———

بہ ہزار دقت ہم اس عمارت سے باہر نکل ہی آئے اور کار میں جا بیٹھے۔ ہماری زبانیں گنگ تھیں۔ ہم ان عجیب و غریب واقعات پر تبصرہ نہیں کر سکتے تھے۔ دماغ سن تھا اور زبان بند ——— بس تینوں لاشیں کار میں چلی جا رہی تھیں۔

اسی تگ و دو میں آسمان پر صبح کی روشنی پھیلنے لگی۔

ایک گھنٹے کے بعد جب کار شہر پہنچ گئی تو ڈاکٹر گار نے کہا: "میں تھانے میں رپورٹ لکھوانا چاہتا ہوں۔ جو کچھ ہم پر گزری اور ہم نے رات وہاں دیکھا اس سے پولیس کو باخبر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے"۔

لیکن جس کسی سے بھی ہم نے اس عمارت کا ذکر کیا حیران ہو کر ہمیں دیکھنے لگا اور کہا کہ وہاں اس قسم کی عمارت کوئی نہیں۔ جس سے بھی ہم نے رات کے واقعات کا ذکر کیا وہ مشکوک نظروں سے ہمیں دیکھنے لگا یا مسکرا کر کسی اور طرف کو چل دیا۔

شب گزشتہ کے ناقابل یقین واقعات نے ہمارے ذہنوں کو تلپٹ کر رکھا تھا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ ہم اپنا دکھ کسی سے بیان نہیں کر سکتے تھے۔ صحیح معنوں میں ہم شب گزیدہ تھے!"

آمنہ ابوالحسن

دریچہ

دریچہ کھلتے ہی وہ ہوا اور رُوشنی کے سامنے تھی ہوا نے اس کے وجود کو اشتیاق سے چوما اور اسے جگمگا دیا۔ اس نے انگلیوں سے اپنے مچل جانے والے بال سنوارے اور روشنی کو ایک گھونٹ کی طرح پی کر ایک لمبی مطمئن سانس لی۔ اُسے لگا اس کے اندر کے سارے اندھیرے جانے کہاں غائب ہو گئے۔ تقویت کے اس احساس سے لپٹے رہنے کو اس نے ایک کرسی کھینچ کر دریچے کے آگے رکھی اور اس پر ٹک گئی۔ کھلے دریچے سے اس نے دیکھا دور دور تک ہرے بھرے کھیت پھیلے ہوئے تھے اور دھان کی بالیاں یوں لہرا رہی تھیں جیسے اردگرد کی ہر چیز کو اپنی آغوش میں سمیٹ لینا چاہتی ہوں۔ اس سے آگے۔ کافی آگے کپاس کے جھنڈ تھے جن کے بند شگوفے ابھی کھلے نہ تھے، مگر پودوں کے سروں پر جابجا قمقموں کی طرح ٹنگے ہوئے تھے۔

اگر یہ سلگ کر روشنی دینے لگیں تو۔۔؟ نشا نے سوچا اور اسے اپنے اس خیال پر خود ہی ہنسی آگئی وہ اکثر ایسی ہی بے مطلب باتیں کیوں سوچا کرتی ہے حالانکہ مطلب کی بات تو یہ ہے کہ . . . . .

دفعتہً اس کا خیال بھٹک گیا کیوں کہ ایک ننھا سا بچہ اپنی صحت مند مگر لڑکھڑاتی ٹانگوں پر سنبھلتا گرتا اور اٹھ اٹھ کر چلتا کھیت کے بازو والی پگڈنڈی طے کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بچہ بالکل ننگ دھڑنگ تھا اور اس کی موٹی سی کمر میں ایک کالی ڈور بندھی ہوئی تھی جس کے ساتھ ایک سرے پر دو تین گھنگھروؤں کی آواز اگرچہ بہت مدھم سی نشا کے کانوں میں پہنچ رہی تھی مگر اس جھنکار کے ساتھ ہی اسے چرچ کے گھنٹوں کا خیال آگیا وہ گھنٹے جو عبادت سے قبل یا ختم پر بجا کرتے ہیں اور چرچ کا خیال آتے ہی صلیب پر ٹنگے یسوع مسیح اس کے سامنے آ گئے اس کا سر عقیدت سے آپ ہی آپ جھک گیا۔ دوبارہ جب اس نے نگاہ اٹھائی تو سنبھل سنبھل کر چلتا گرتا، اٹھتا ہوا بچہ پگڈنڈی کے سرے پر جا کر غائب ہو گیا تب لمحہ بھر کے لئے ساری پگڈنڈی پر ایک خلا سا پیدا

ہو گیا اور اس خلا کے احساس سے نشا پژمردہ ہونے لگی تبھی یکایک اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

ایک لڑکی جو سترہ یا اٹھارہ برس کی ہو گی بے حد رنگین لباس پہنے، سر پہ دودھ کی گاگر اٹھائے، پیروں کی پائلیں بجاتے اسی پگڈنڈی پر نمودار ہوئی اور اس کے چہرے کا مجموعی تاثر دیکھ کر نشا یہ فیصلہ ہی نہ کر سکی کہ اسے چاند کہے یا سورج۔ اس کا تمام وجود امڈی ہوئی گھٹا کی طرح لبریز تھا اور ہونٹوں پر ایسی حسین مسکراہٹ جیسے آسمان کے افقی گوشوں پہ سورج کی سنہری ضیاء دمکتی ہو۔ آنکھوں میں پُرسکون جھیلوں کی سی کیفیت۔ چال میں غزالوں جیسا مستانہ پن اور بڑھتے ہوئے قدموں میں بے فکری اور الھڑپن، زمانوں کے کرب سے ناآشنا۔ مسائل کی گرہوں سے بے خبر۔

نشا ایک دم اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور آگے کی طرف جھک کر بغور لڑکی کو دیکھنے لگی۔ اس کا جی چاہا آواز دے کر لڑکی کو پاس بلائے اور اس سے ضرور چند باتیں کرے مگر کون سی باتیں؟ اول تو اسے لڑکی کا نام نہیں معلوم، دوم وہ اسے پاس بلا کر کیا پوچھے گی؟

وہ یہی سوچتی رہ گئی اور لڑکی تیز تیز قدم اٹھاتی پگڈنڈی طے کر گئی۔ نشا کی یہ خواہش کہ اس کی آواز سُنے اپنی جگہ دم بخود رہ گئی صرف نشا کے کانوں میں اس کے پائلیوں کی کھنک برسات کی بوندوں کی طرح ٹپکتی رہ گئی اور پگڈنڈی پھر سونی سی ہو گی۔

نشا اپنی کرسی پر ٹک کر سوچنے لگی۔ یہ سب قدم کس طرف رواں ہیں؟

ننھے ننھے قدم۔

بے فکر الھڑ قدم۔

کیا پگڈنڈی کے سرے پر کوئی سنہرا کلس اطمینان و عقیدت کی مہین دھوپ میں جگمگا رہا ہے یا کوئی سورج جو نکل چکا ہے یا کوئی چاند جو جاگنے والا ہے۔ آخر اس راستے پہ اتنی تابناکی کیوں ہے کس کا عکس — ؟

اسے آرزو ہوئی وہ بھی اپنی کاٹج کا چوبی دروازہ کھول کر باہر نکلے اور اس پگڈنڈی پر چل کر دیکھے۔

پگڈنڈی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ کہاں جا کر ختم ہوتی ہے۔

پگڈنڈی کی ابتدا کیسی ہے۔ انتہا کیسی۔ مگر وہ کرسی پر بیٹھی ہی رہ گئی کیونکہ یکایک اسے گھنے بالوں کا ایک جھنڈ سا نظر آیا جو ایک ایسے چہرے کا احاطہ کئے ہوئے تھا جس کے خد و خال بے حد مضبوط اور مثبت مثبت سے تھے جس کے ہونٹوں میں بانس کی بھوری بانسری پھنسی ہوئی تھی جس سے سُریں نکل رہے تھے جیسے آبشار سے نکلتی پھواریں، کالی کالی بکریوں کا ایک ریوڑ جس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ بکریاں دھان کے تازہ پودوں پر منہ مارنے کو بے قرار ہو رہی تھیں مگر ان کا نگران بانسری کے سروں کے ساتھ ساتھ انہیں بھی یوں بس میں

کئے ہوئے تھا جیسے کہتا ہو.

نا بابا۔ انسانوں کی غذا تم نہیں کھاؤ گے۔ اسے کھا کر اگر تم بھی انسان بن گئیں تو۔؟ چلو۔ آگے بڑھو ایک نشا پھر اپنی کرسی پر بے ساختہ آگے جھک گئی۔ صبح جب اس نے دریچہ کھولا تھا تو ساری پیش آنے والی باتیں اور مناظر بالکل اس کے ذہن وخیال میں نہ تھے۔ وہ تو کاٹج کی امس سے گھبرا کر دریچے کے آگے آئی تھی۔ مگر اس دریچے نے اس کے وژن کو للکارا تھا اور اب وہ یوں بے بس ہو کر اس دریچے کے آگے اٹک گئی تھی جیسے یہاں سے اٹھنا بھی چاہے تو نہ اٹھ سکتی ہو.

قریبی تپائی پر رکھے رکھے اس کی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی اور جب ملازمہ نے اسے ناشتے کی تیاری کی اطلاع دی تھی تو اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر خاموشی سے لوٹ گئی تھی۔ نشا کو یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ ناشتے کا وقت کب کا گزر چکا ہے. اس کی ممی اس کا انتظار کر کر کے جانے کس مصروفیت میں مگن ہو چکی ہیں اور اون میں پھنسی ہوئی سلائیاں دوسری کرسی کے کشن پر پڑی اس کی توجہ کی منتظر ہیں کہ جاڑے سے قبل ممی کا پوری باہوں کا سویٹر پورا ہونا ضروری ہے ورنہ ممی ہمیشہ کی طرح نشا سے کہیں گی۔

تم ہر کام کرتی ضرور ہو مگر وقت پر نہیں۔

یہ سن کر اس میں کیفیتِ یاس ایک لہر کی طرح امڈے گی اور جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گی کیونکہ یہ سب پرانا ہے۔ بہت بہت پرانا۔ اس کی اپنی عادتوں کی طرح اور ممی کی اسے سدھارنے کی تنبیہہ بھری کوششوں کی طرح۔ اس میں کہیں بھی کوئی چارم نہیں۔ نہ کسی امید کی آگ، نہ کسی تمنا کے پھول نہ خواہشات کی تمازت۔ ۔ ۔ ۔

وہ اکیلی پیدا ہوئی۔ اکیلی پلی۔ اکیلی ہی قدم قدم زندگی طے کرتی رہی۔ اس اکیلے پن نے اسے کوئی جوش دیا نہ جنون۔ اکیلا پن کتنا پھیکا ہوتا ہے۔ کتنا بدمزہ۔ اگر اس کے بھی اور بھائی بہن ہوتے تو یقیناً زندگی میں بڑا خوشگوار ہنگامہ ہوتا۔ وہ اپنی اپنی خوشیوں اور خواہشوں کے لئے ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے۔ جیتتے، ہارتے مگر نہ نشا نے کسی سے معصوم جھگڑے کئے تھے نہ جیتنے ہارنے کی دوڑ میں حصہ لیا تھا۔ اس گھر کی ہر چیز نہ صرف اس کی اپنی تھی. بلاشرکت غیرے اور اسی اطمینان نے نشا میں ایک ٹھہراؤ اور جمود پیدا کر دیا تھا چونکہ ہر چیز قابلِ حصول تھی لہٰذا وہ ہر چیز کو بڑی بے گانگی سے دیکھتی۔

جو بس میں ہو جو اپنا ہو وہ کتنا معمولی۔ مزہ تو تب ہو کہ آدمی ڈھونڈ ڈھونڈ کر۔ کھوج کھوج کر۔ چھانٹ چھانٹ کر اپنی پسند پائے، تب بھی اس کا حاصل کرنا دشوار ہو۔

نشا نے اپنا سر جھٹکا اور سوچ کی راہوں سے ابھر کر بے اختیاری سے پھر باہر دیکھنے لگی۔ کہیں اپنی بیرنگی میں دریچے کے باہر کے انتہائی خوبصورت اور بھڑکیلے رنگ نہ کھو جائیں۔

ریوڑ اب آدمی سے زیادہ پگڈنڈی طے کر چکا تھا اور مستحکم بدن والا چرواہا کھلے ہوئے دریچے سے جھانکتی ہوئی نشا کی پُر شوق نظروں سے بالکل ہی بے خبر ہموار چال چلتا آگے ہی آگے بڑھا جا رہا تھا۔ نشا کے جی میں آئی دوڑ کر اس کے قریب پہنچے اور پاس سے، بہت پاس سے اس کا چہرہ دیکھے۔ اس کے خدوخال جانچے۔ اس سے کہے۔ چند منٹ کے لئے رک جاؤ اور مجھے اپنی مضبوطی کا راز بتاتے جاؤ۔ مگر نشا پھر بھی کرسی سے نہ اٹھ سکی اور جب ریوڑ سمیت موٹی موٹی بھوری آنکھوں والا گڈریا اپنے لبوں میں بانسری دبائے پگڈنڈی کے سرے پر غائب ہو گیا تو نشا کو بالکل یوں لگا جیسے ابھرتی جاگتی ہوئی نرم دھوپ اس کے وجود پر سے ہو کر نکل گئی ہے اور فضا میں دور کہیں وہ سُر ہلکورے لے رہے ہیں جن کی زبان دیہات کا پتہ پتہ بوٹا بوٹا سمجھتا ہے۔ صرف وہی نہیں سمجھ سکتی مگر یہ سُر کہیں اس کے اندر بھی گونج گئے ہیں اور ان کی بازگشت رہ رہ کے اسے کسمسا رہی ہو۔

اس مرتبہ خالی ہو جانے والی پگڈنڈی کو دیکھنے سے قبل ہی نشا نے اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹیک دیا اور سوچنے لگی، وہ خلاء دیکھ کر کیا کرے؟

وہ کوئی اسپوتنک تو نہیں جو جستجو اور کھوج کے مشن پہ نکلا ہو۔ جو زمین یا آسمان کے اسرار کی تلاش میں ہو۔ وہ تو گوشت پوست کا ایک ایسا وجود ہے جس میں جان تو ضرور ہے مگر جانے کہاں گم ہے کہ خود کو بھی نظر نہیں آتی۔ خود کو بھی نہیں ملتی اور تب نشا نے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور بے ساختہ خود کو ڈھونڈنے لگی۔ ٹھیک اسی وقت کسی لاٹھی کی کھٹ کھٹ نے اسے پھر آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے کرسی کی پشت پر سر ٹکائے ٹکائے ہی نظر آگے دوڑائی اور اس بار دیکھا کہ ایک ضعیف شخص جس کے ننگے بدن پہ لباس کے نام کی صرف ایک لنگوٹی کسی ہے آہستہ آہستہ لکڑی ٹیکتا ہوا پگڈنڈی پر چلا آ رہا ہے اس کے سفید بال اس کے پتلے سوکھے مرجھائے ہوئے چہرے پر ٹوکرے کی طرح جمے ہوئے ہیں اور زندگانی کا رس اس کی رگوں سے بالکل ہی نچڑ چکا ہے۔ نشا کو دفعتہً ایک برقی جھٹکا سا محسوس ہوا معصوم بچہ۔ الھڑ دوشیزہ، کڑیل چرواہا، کیا سب کی انتہا یہی ہے ۔۔؟

اس خیال کے ساتھ ہی وہ بوکھلائی اور اس نے کھلا دریچہ بے اختیار بند کر دیا۔

نہیں نہیں۔ اس آخری نظارے کے اختتام سے قبل ہی اسے خود میں کوئی نہ کوئی دریچہ ضرور کھول لینا چاہیئے تاکہ بھرپور، رنگین مناظر کی تمام دلکشی اور توانائی زندگی کا حصہ بن جائے ورنہ تمام سہانی رُتیں اندھیرا بن کر اس میں سما جائیں گی۔

کانچ کی اس کی طرح ۔ ۔ ۔ اور اپنی جگہ جمی ہوئی وہ۔ دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ زندگی سے خراج

رشید امجد

ہریالی بارش مانگتی ہے

ہریالی بارش مانگتی ہے اور بادل خوب گھر گھر آتے ہیں لیکن بارش نہیں ہوتی، پیاسا شہر ہانپ ہانپ کر اپنے آپ سے باہر اُبل پڑا ہے ـــ ایک پھیلاؤ ہے کہ سمٹتے نہیں سمٹتا، لیکن ایک دائرہ ہے گرداگرد جو تنگ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے ـــ

(۲)

کلاس میں لیکچر دیتے ہوئے اس نے لڑکوں پر ایک نظر ڈالی اور باہر دیکھنے لگا۔

گرمی ـــ شدید گرمی

لڑکوں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا

"ہاں گرمی اور بارش نہیں ہوتی، ہریالی تو بارش مانگتی ہے"

اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا ـــ "سارے گلاب سوکھ گئے ہیں۔

بنجر پن ایک ایک چہرے پر کنڈل مارے بیٹھا ہے،

شگفتہ چہرے شہر کا حسن ہیں اور یہاں تو سارا شہر ہی پیاس سے ہانپ رہا ہے،

بارش کب ہوگی؟

بادلوں کے ٹکڑے آسمان کے طشت میں ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں

روز کی طرح آج بھی یہ ایک دوسرے کو پکڑتے، چھپتے چھپاتے شہر کی بانہوں کے دائرے سے نکل جائیں گے

اور حبس زدہ چہرے والی گرم رات ان پر ٹوٹ پڑے گی۔

رات کا تصور آتے ہی اسے جھرجھری آ گئی

حبس زدہ گرم رات نے تو ان سے پہچان کے سارے زاویے چھین لئے ہیں اور ایک حبس زدہ بے غیرت چھپا ہوا

وہ باہر نکل آیا

"کہاں جا رہے ہو؟" کسی نے پوچھا

"ہریالی تلاش کرنے"

"ہریالی"
اس نے کندھے اچکائے، موٹر سائیکل سٹارٹ کی اور سڑک پر نکل آیا۔
"کہاں جاؤں؟"
بادلوں کے سرمئی ٹکڑے ایک ایک کر کے آسمان سے رخصت ہو رہے تھے،
وہ شہر سے باہر نکل آیا —— فضا میں دفعتہً سیاہی سی گھلنے لگی۔ بادلوں کے بھاگتے ہوئے ٹکڑے بکھرا کٹھے ہونے لگے تھے۔
شہر اب پیچھے رہ گیا تھا —— گھنے درختوں کے خشک چہرے اس کے دونوں طرف پھیلے ہوئے تھے۔
بارش —— بارش شاید اب کبھی نہ ہو —— اس نے سوچا —— اور یہ سارے چہرے ایک ایک کر کے مرجھا جائیں گے —— سارا شہر بے آبرو ہو جائے گا۔
درخت شہر کا لباس ہیں اور جب یہ لباس ایک ایک کر کے تار تار ہو جائے گا تو ننگا شہر کیسا لگے گا۔
اس نے موٹر سائیکل سڑک کے کنارے کھڑی کر دی اور درختوں کے جھنڈ میں گھس گیا۔ گرمی اور خشکی نے درختوں کے چہروں پر آبلے ڈال دیئے تھے۔
فضا میں ایک عجب حبس زدگی تھی۔
اب تو چند ہی دن کا کھیل باقی رہ گیا ہے —— ننگا شہر کیسا لگے گا۔
اور میں بھی تو ننگا ہو جاؤں گا۔
ہاں میں بھی ——
لیکن میں تو اب بھی ننگا ہی ہوں —— پسینے میں شرابور کپڑوں سے بو کے بھبکے اٹھ رہے ہیں۔
اس نے ایک ایک کر کے سارے کپڑے اتار دیئے اور ننگ دھڑنگ ایک درخت کے تنے پر بیٹھ گیا۔
آسمان گھنے گہرے بادلوں میں چھپ گیا۔
لیکن بارش نہیں ہو گی —— بادل تو روز اسی طرح گھر گھر آتے ہیں، لیکن برستے نہیں —— معلوم نہیں وہ شہر سے کیوں اتنا ناراض ہو گئے ہیں۔
ہریالی تو بارش مانگتی ہے —— اور بارش
"بارش نہیں ہوتی —— ہے نا" کسی نے کھنکتی آواز میں اس کا جملہ پورا کیا
وہ اچھل پڑا اور تیزی سے کپڑوں کی طرف بڑھا
وہ سامنے والے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے عجب شانِ بے نیازی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

وہ ہنسی
"بارش نہیں ہوتی"
"ہاں ___"
وہ اس کے قریب آگئی ___ اس کے بالکل سامنے، چند لمحے یوں ہی کھڑی رہی، پھر دفعتاً اس نے جانے کیا کہا ___ جانے کیا ہوا کہ اس کا سارا لباس پلک جھپکنے میں اس کے بدن سے کھسک کر پاؤں میں آن گرا۔
وہ ششدر رہ گیا
کچھ دیر کے لئے سمجھ ہی نہ آیا کہ کہاں ہے ___ اور یہ کیا ہوا ہے
وہ اپنے بدن کی ساری توانائیوں اور جلوؤں کے ساتھ سامنے کھڑی مسکرائے جارہی تھی۔
اور وہ اس کے سامنے زمین پر یوں پڑا تھا جیسے لڑ لڑ کر ہار گیا ہو ___
لیکن میں تو ابھی میدان میں اترا ہی نہیں
وہ چند قدم آگے آئی ___ اسے دیکھتی رہی پھر بولی ___ "ہریالی اس شہر سے روٹھ گئی ہے ___ ہے نا؟"
وہ دم بخود اسے دیکھے جارہا تھا
"لیکن"
"لیکن کیا؟"
"میں ہریالی ہوں ___ میں ہی تو بارش ہوں؟"
"ہاں میں ___ تم نے مجھے خود ہی شہر سے نکال دیا ہے، تمہیں میری ضرورت ہی نہیں؟"
"نہیں ___ نہیں" اس نے اچھل کر اسے دبوچ لیا ___ مجھے تمہاری ضرورت ہے ___ مجھے ___ مجھے
بادل گھرے ہوگئے ___ فضا نے آنکھوں میں گہرا سرمہ لگا لیا۔
جانے کتنی دیر گزر گئی
اپنے حواس میں آیا تو وہاں کوئی نہیں تھا ___ بس مسلی ہوئی گھاس سے جانے والی کے بدن کی مہک آرہی تھی ___
یہ خواب تھا، یا حقیقت، اُسے کچھ سمجھ نہ آیا
اس رات خوب بارش ہوئی
ہر چیز دھل گئی ___ لیکن سب چیزیں بدلی بدلی سی لگتی ہیں
کیا سب کچھ وہی ہے ___ ویسا ہی ہے۔
وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا اور پہچاننے کی کوشش کرتا ہے
کچھ پتہ نہیں چلتا ___ چہروں اور چیزوں پر ایک عجیب منافقانہ مسکراہٹ ہے۔
اب بارش روز ہوتی ہے، خوب ہوتی ہے لیکن ہریالی میں ایک عجب زرد پن ہے، جو جائے نہیں جاتا!

محمد منشا یاد

دیوارِ گریہ

گاؤں کے سرکردہ لوگوں کے وفد سے میں نے اتوار تک کی مہلت مانگی اور وعدہ کیا کہ میں گاؤں آکر اسے سمجھاؤں
گا ہو سکتا ہے وہ میری بات مان جائے انہوں نے کہا "ہم اتوار تک آپ کا انتظار کریں گے ہمیں آپ کا بہت لحاظ ہے
اور ہمیں یقین ہے کہ وہ آپ کی بات ضرور مان جائے گی کیونکہ وہ صرف آپ سے ڈرتی ہے۔"
اب میں انہیں کیا بتاتا کہ اگر وہ مجھ سے ڈرتی ہے تو میں بھی تو اس سے ڈرتا ہوں۔ ایک انجانے خوف کی دیوار ہم دونوں
کے درمیان حائل ہے کبھی کبھی یوں لگتا ہے ہم دونوں اپنے اپنے ہاتھوں پر اس دیوار کو روکے کھڑے ہیں اور ہم میں سے
جس نے بھی ہاتھ پیچھے ہٹائے وہ دیوار کے نیچے دب جائے گا۔

وہ میری سگی خالہ نہیں تھی۔

لیکن وہ مجھے اپنی سگی خالاؤں سے زیادہ اچھی لگتی تھی۔

یہ عجیب بات ہے کہ خوبصورت چیزیں ہمیں دوسری چیزوں کے مقابلے میں زیادہ اچھی لگتی ہیں خواہ ان کا تعلق ہم
سے ایک جیسا ہو۔ ہم اپنے بچوں میں سے خوبصورت ترین بچے سے زیادہ پیار کرتے ہیں اور خواہ ہمارے قدموں میں گیارہ
گرانڈیل جوان بیٹے بیٹھے ہوں۔ بارہویں خوبصورت بیٹے کی جدائی میں ہماری آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں بن جاتی ہیں۔
خوبصورت بیٹوں کے بڑھتے ہوئے بدن اور روز بروز گلابی ہوتے رخسار دیکھ کر ہمیں خواہ مخواہ ان پر پیار
آنے لگتا ہے۔ بدصورت بہن کو ہم آسانی سے ڈانٹ سکتے ہیں لیکن خوبصورت بہن کی فرمائش آسانی سے نہیں ٹال سکتے۔
خالہ خوبصورت تھی اس لئے مجھے اپنی سگی خالاؤں سے اچھی لگتی تھی ویسے بھی ہم بچپن میں ایک ساتھ کھیلے تھے۔
وہ مجھ سے کچھ ہی بڑی تھی مگر اسے کہانیاں بہت یاد تھیں۔ میری اس سے بڑی دوستی تھی اور میں زیادہ تر وقت
اسی کے ہاں گزارتا تھا کبھی کبھی خالہ اپنی خالہ کے ہاں چلی جاتی تو میرا دل اداس ہو جاتا۔ میں ابا کے صندوق سے وہ کتاب نکال

لیتا جس میں ہر طرح کے تعویذ اور گنڈے تھے۔ یہ کتاب ابا کے ہاتھ دادا جان کے انتقال کے بعد آئی تھی لیکن میں اتنا طویل انتظار نہ کر سکتا تھا۔ میں کتاب سے بچھڑے اور روٹھے ہوئے محبوب کو منانے اور واپس بلانے کے تعویذ نقل کر کے آزماتا اور خالہ کو چند ہی روز میں واپس آنا پڑ جاتا لیکن اسے بالکل پتہ نہ چلتا کہ میں نے اسے کس طرح واپس آنے پر مجبور کیا ہے

پھر خالہ اچانک بڑی ہو گئی اور زیادہ خوبصورت بھی۔ اس کے گال انگاروں کی طرح دہکنے لگے۔ آنکھیں زیادہ چمکیلی اور نشیلی ہو گئیں اور بال لمبے ہو کر ٹخنوں تک پھیل گئے جب کبھی وہ مجھے پیار کرتی اور میرا منہ چومتی مجھے اس سے بڑی میٹھی میٹھی خوشبو آتی اور میرا جی چاہتا وہ میرا منہ چومتی رہے اور مجھے اپنے نرم نرم سینے سے لگا کر بھینچتی رہے مگر وہ اب مجھ سے زیادہ منظوم پنجابی داستانوں کے کرداروں سے محبت کرنے لگی تھی۔ ان کرداروں میں اسے ہیر اور مرزا پسند تھے اور مجھے رانجھا اور صاحباں ۔۔۔ اس اختلاف پر کئی بار ہمارا جھگڑا ہو جاتا اور ہم کئی کئی روز تک ایک دوسرے سے بات نہ کرتے۔

خالہ کی آواز بڑی اچھی تھی وہ اکثر ہیر وارث شاہ کے بند گنگنایا کرتی ۔

"میرے میکے کی گلیوں کو ہاتھ جوڑ کر میرا سلام کہنا اور ترنجن میں جا کر میری سکھیوں کو میرا پیغام دینا کہ وہ مجھے دشمنوں کے حوالے کر کے بھول گئی ہیں۔ میاں رانجھا کے پاؤں پکڑ کر اور میری طرف سے ہاتھ جوڑ کر کہنا کہ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ وہ بے آسروں کا آسرا ہے۔ میرے ماں باپ سے کچھ بھی نہ کہنا انہوں نے مجھے گھمن گھیر میں غرق کیا ہے۔ ان سے اب میرا کوئی ناطہ نہیں ہے ؟"

خالہ جب مجھے ہیر پڑھ کر سناتی تو مجھے یوں لگتا جیسے وہ میری بجائے اپنے آپ کو سنا رہی ہو۔ ہیر پڑھنے پر اسے کئی بار ڈانٹ بھی پڑ چکی تھی۔ اڑوس پڑوس میں بھی چہ میگوئیاں ہوتی تھیں۔ گاؤں میں عورتوں اور لڑکیوں کے لئے ہیر وارث شاہ پڑھنا بڑا معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن مجھے اور خالہ کو اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی تھی۔

کبھی کبھی خالہ کسی لفظ پر اٹک جاتی تو مجھے بڑی خوشی ہوتی میں چونکہ سکول میں پڑھتا تھا اس لئے ہجے کر کے لفظ پڑھنے میں کامیاب ہو جاتا۔ لفظ جتنا مشکل ہوتا۔ وہ اتنا ہی زیادہ پیار کرتی۔ میرا جی چاہتا اسے ایک بھی لفظ پڑھنا نہ آئے۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگتا۔ اللہ کرے وہ اندھی ہو جائے۔ میں اسے کتاب کے سارے لفظ پڑھ پڑھ کر سناتا رہوں اور ہر لفظ پر ۔۔۔ مگر خیر یہ بچپن کی باتیں ہیں ۔

پھر مجھے تعلیم کے سلسلے میں شہر بھیج دیا گیا اور میں خالہ سے جدا ہو گیا۔ میں شہر میں جب بھی کسی حسین عورت کو دیکھتا مجھے یاد آ جاتی اور میں دل ہی دل میں اس کا خالہ سے موازنہ کرنے لگتا۔ شہر میں قدم قدم پر حسین عورتیں تھیں لیکن میں نے خالہ سے بڑھ کر کسی کو نہ پایا۔ لمبی لمبی کاروں میں حسین اور امیر عورتوں کو دیکھ کر مجھے رشک آتا۔ کاش خالہ بھی ایسی ہی کسی لمبی چمکیلی کار میں بیٹھی ہو اور اس کا دولتمند میاں اس کی ہر ادا اور فرمائش پر آنکھیں بچھا رہا ہو۔

خالہ سے اب میری ملاقات بڑے وقفوں سے ہوتی تھی۔

لیکن میں جب بھی گاؤں جاتا زیادہ تر وقت اس کے گھر میں گزارتا۔ اگرچہ ہمارے گھروں کے تعلقات خوشگوار نہ ہوتے اور ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا بند ہوتا لیکن ہم پر اس کا کچھ اثر نہ پڑتا۔ خالہ کے گھر والے مجھ سے بات نہ بھی کرتے تو بھی خالہ سے مل کر ساری کوفت دور ہو جاتی۔ وہ مجھے طرح طرح کی چیزیں اور پکوان کھلاتی اور ہم پہروں باتیں کرتے رہتے۔ گاؤں کی باتیں، شہر کی باتیں، فلموں کی باتیں جو میں شہر میں دیکھتا تھا اور کتابوں کی باتیں جو ہم دونوں ایک دوسرے کو پڑھ پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔

خالہ اب مجھ سے اور بڑی ہو چکی تھی۔

کبھی کبھی مجھے وہ ایک بڑی عورت نظر آتی اور مجھے اس سے جھجک محسوس ہونے لگتی لیکن ایک بار جب ہم باتیں شروع کر دیتے تو ساری اجنبیت اور جھجک خود بخود دور ہو جاتی۔ خالہ اب بے قرار ہو کر مجھے لپٹاتی اور چومتی نہیں تھی اور شاید میں بھی اب اس کی توقع نہیں کرتا تھا۔

ایک بار گرمیوں کی چھٹیوں میں جو کسی طرح ختم نہیں ہو رہی تھیں۔ گھر والوں نے مجھے خالہ کے ہاں جانے سے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ میں نے پہلے پہل اس کی پرواہ نہ کی مگر پھر سخت ڈانٹ ڈپٹ ہوئی اور والدہ نے مجھے باور کرانے کی کوشش کی کہ دشمن کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا۔ کیا پتہ وہ لوگ مجھے زہر دے کر ہلاک کر ڈالیں اور دشمنی کا بدلہ چکائیں۔ میں دل ہی دل میں ہنسا۔ خالہ کے ہوتے ہوئے مجھے اس گھر میں زہر کیسے دیا جا سکتا تھا۔ میرے لئے ایسا سوچنا بھی حماقت تھی لیکن پھر والدہ کے بار بار کہنے سے شک نے میرے دل کے کسی گوشے میں ڈیرہ جما لیا اور میں نے طے کر لیا کہ خالہ کے ہاں بہت کم جاؤں گا اور اس کے ہاں سے کھانے پینے کی کوئی چیز تو بالکل نہیں لوں گا۔

دو ایک روز بعد مجھے چلا جانا تھا اور میں خالہ سے ملے بغیر نہیں جانا چاہتا تھا اس لئے ایک سہ پہر میں گھر والوں سے چوری اسے ملنے چلا گیا۔ اتفاق سے وہ اس وقت گھر میں اکیلی تھی۔ اس کی طبیعت اچھی نہیں تھی اور وہ سر کو دوپٹے سے باندھے بستر پر لیٹی ہوئی تھی، مجھے دیکھ کر کھل اٹھی اور حسب عادت مسکرا کر بولی۔

"بسم اللہ"

میں پائنتی کی طرف بیٹھ گیا وہ کہنے لگی۔

"تو نے اچھا کیا جو چلا آیا — میرا بڑا ہی دل چاہ رہا تھا کہ تجھے دیکھوں۔ کل سے میری طبیعت ٹھیک نہیں اور تو مجھے بہت یاد آ رہا تھا"

مجھے کوئی بات نہیں سوجھ رہی تھی، میں اٹھ کر اس کے سرہانے بیٹھ گیا اور اس کا سر دبانے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور کہنے لگی۔

"سُنا ہے تیری چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ وقت گزرتے کیا دیر لگتی ہے ہاں تو مجھے شہر جا کر خط لکھ بھیجا کر۔ مگر ڈیا۔ آسان لکھنا تو اب بہت پڑھ گیا ہے نا؟"

"تو جواب دے گی، تو لکھوں گا۔"

وہ ہنس پڑی اور بولی "مجھے لکھنا کہاں آتا ہے؟"

"کسی سے لکھوا لینا۔"

"نہ بابا۔" اس نے کہا "لوگ سمجھیں گے پتہ نہیں کسے خط لکھوا رہی ہے۔"

پھر خالہ میرے منع کرنے کے باوجود میرے لئے دودھ گرم کر لائی، میرا ماتھا ٹھنکا، اس نے دودھ میں کچھ ملا نہ دیا ہو۔

میرے لئے اب نہایت مشکل صورت حال تھی، جی چاہتا تھا بھاگ جاؤں مگر خالہ کا رویہ دیکھ کر انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اسے پتہ چل جاتا کہ میں اس کے بارے میں ایسا سوچ رہا ہوں تو صدمے کی تاب نہ لا کر وہ خود ضرور زہر پھانک لے گی۔

پھر اس خیال سے کہ مجھے خون کی قے کرتے دیکھ کر وہ پشیمان ہو گی اور زندگی بھر اپنے اس فعل پر سینہ کوبی کرتی رہے گی۔ میں نے دودھ کا گلاس منہ سے لگایا اور غٹاغٹ پی گیا — اور منہ اور نتھنوں سے خون جاری ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ ساتھ ہی اتنی جلدی دنیا سے رخصت ہو جانے کے خیال سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس نے گھبرا کر پوچھا "میں واری — کیا بات ہے؟"

مجھ سے ضبط نہ ہو سکا میں نے کہا "امی نے کہا تھا تم لوگ مجھے زہر دے دو گے۔"

وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ کچھ دیر پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔

"اور یہ جانتے ہوئے بھی تو نے دودھ پی لیا؟"

"اور کیا کرتا؟"

"ہائے میں مر جاؤں، اس نے کہا "تجھے مجھ پر اتنا اعتبار ہے؟"

مجھے ایسے لگا جیسے میں بے حد کمینہ ہوں، اگر خالہ کو پتہ چل جائے کہ میں نے اس پر شک کیا تو؟

وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی

"دیکھ اڑیا — تو ایسا کبھی نہ سوچنا تجھے زہر دینے سے پہلے میں خود سو بار زہر نہ پھانک لوں گی۔" مجھے ہنسی آ گئی

"زہر تو ایک ہی بار میں مار ڈالتا ہے پھر تو سو بار کیسے پھانکے گی؟"

"اچھا گولی مار زہر کو" وہ بولی "کوئی اور بات کر۔"

مجھے پھر ہنسی آگئی "زہر کو گولی کیسے ماری جاسکتی ہے"

اس نے میرا ماتھا چوما اور کان مروڑ کر کہا "تو بہت شریر ہو گیا ہے"

میرا جی چاہتا تھا ہنستا رہوں ... ہنستا ہی چلا جاؤں۔ ہنسی اور خوشی سے میرا سارا اندر بھر گیا تھا۔ کئی برس بعد اس کے خوبصورت ہونٹ میری پیشانی سے چھوئے تھے۔ دنیا بھر کی لذت اور خوشی اس ایک لمحے میں قید ہو گئی تھی لیکن پھر خالہ سے اکبرے ماچھی والی بات سن کر میری ساری ہنسی اور خوشی کافور ہو گئی تھی۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ وہ ایک کسان کی بیٹی ہو کر ایک کامی سے بیاہ کیسے کرے گی اور اگر بیاہ نہیں کریگی تو کیا کرے گی؟ مجھے اس پر بڑا غصہ آیا اور میرا جی چاہا اُسے چوٹی سے پکڑ کر صحن میں گھسیٹوں، مگر اس کی چوٹی دیکھ کر میرا سارا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور میں سوچنے لگا کہ وہ اتنی بھاری اور لمبی چوٹی کیسے اٹھائے پھرتی تھی۔

جب میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا خالہ نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے لڈو بنائے اور اپنی سہیلیوں کو اور مجھے خوب خوب کھلائے۔ اتفاق سے ان دنوں ہمارے گھروں کے تعلقات بھی خوشگوار تھے، لیکن مجھے اس بات کا بے حد رنج تھا کہ گاؤں میں اب اس کے اور اکبرے ماچھی کے بارے میں طرح طرح کی باتیں شروع ہو گئی تھیں۔ یہ باتیں سُن سُن کر میرا دل اس کی طرف سے کھٹا ہو گیا تھا اور مجھے اس کی کوئی بات اچھی نہ لگتی تھی لیکن میں اسے کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ اس کا سامنا کرنے سے کیوں گھبراتا تھا اس کا مجھے خود بھی پتہ نہیں تھا۔

پھر میں نے کالج میں داخلہ لے لیا اور زیادہ تر ہوسٹل میں رہنے لگا۔

جب کبھی گاؤں جاتا اور میرے ہم عمر مجھ سے کہتے کہ یار اعظم تیری خالہ نے بڑا گند ڈالا ہوا ہے تو شرم سے میری گردن جھک جاتی اور مجھے خالہ پر غصہ آنے لگتا۔ اس لئے میں نے اب گاؤں جانا کم کر دیا تھا اور دل لگا کر پڑھ رہا تھا۔

ایک ایک کر کے کئی برس گزر گئے۔

میں نے تعلیم مکمل کر کے ملازمت کر لی اور میری شادی شہر میں ہو گئی۔

اب میں شہر میں رہتا تھا اور کبھی کبھار گاؤں جاتا تھا، تاہم بہت سے لوگ آتے جاتے رہتے تھے اور مجھے ہر طرح کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ گاؤں والے باتیں بنا بنا کر تھک گئے تھے۔ خالہ اور اکبرے ماچھی کی بات اب عام سی ہو گئی تھی کبھی کبھی گاؤں والے اچانک بھڑک اٹھتے تھے۔ مولوی صاحب گاؤں پر عذاب الٰہی نازل ہونے اور قرب قیامت کی پیشگوئیاں دہرا دہرا کر تھک چکے تھے لیکن خالہ سے براہ راست الجھنے کا کسی کو حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ اپنے والد کے مرنے کے بعد وہ اور دلیر ہو گئی تھی اور خوب کھری کھری سناتی تھی۔ خالہ کی طرح اکبرے کو ٹوکنے کی بھی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ سب جانتے تھے کہ وہ ہر وقت ڈب میں پستول رکھتا تھا اور اس سے کسی بھی قسم کے اقدام کی توقع کی جاسکتی تھی۔

خالہ اب وہ خالہ نہیں رہی تھی جو کبھی گاؤں والوں کے دلوں پر حکمرانی کرتی تھی اور جسے دیکھ کر جوانوں کا ایمان

ڈول جاتا تھا اور جسے بیٹی یا بہن کہہ کر پکارنے والوں کے لہجے میں بھی عجیب طرح کی مٹھاس ہوتی تھی۔ سخت جسمانی محنت کی وجہ سے اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا اور رنگت تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ گھر بار کے کام کاج کے علاوہ کھیتوں میں بھی مردوں کی طرح کام کرتی تھی۔ اکبرے کے سوا پورے گاؤں میں اس کا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہ تھا۔ یہ درست ہے کہ اکبرے کبھی اس کے گھر نہیں آتا تھا لیکن سارا گاؤں جانتا تھا کہ وہ باہر ہیر رانجھے کی طرح ملتے ہیں اور خالہ اس کے لئے دو وقت کھیتوں میں روٹی لے کر جاتی تھی۔ اُسے دیکھ کر اس پر ترس ضرور آتا تھا لیکن یہ سوچ کر کہ ان حالات کی وہ خود ذمہ دار ہے، غصہ آنے لگتا تھا۔

لیکن اب حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے میرا گاؤں جانا اور اس سے بات کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ پروگرام کے مطابق میں اتوار کے روز گاؤں پہنچ گیا۔

رات کا کھانا کھا کر اور والدہ سے اجازت لے کر میں اس کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے گھر کے دروازے پہ کھڑے ہو کر میں نے فیصلہ کیا کہ اس سے پہلے کہ وہ اپنی باتوں کے شہد میں مجھے ڈبو دے میں ایک ہی سانس میں اپنی بات کا سارا زہر انڈیل دوں گا اور اسے کھری کھری سناؤں گا۔

کئی لمحوں شاید صدیوں بعد میں نے دروازے پہ دستک دی۔ دروازہ کھولے بغیر اس نے دستک پہچان کر اور چہک کر کہا۔

"بسم اللہ"

اس کی آواز سے اس کا گھر ہی نہیں گلی بھی روشن ہو گئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی بوڑھی اور نابینی ماں کے پاس لے گئی اور بولی۔

"دیکھا ماں — اعظم آیا ہے۔"

میں نے سلام کیا۔ اس کی ماں نے دعا دی۔ خالہ لپک کر کرسی اٹھا لائی۔ میں بیٹھ گیا تو اس نے میرے سامنے تپائی لا رکھی، اس پہ ہاتھ سے بنا ہوا رومال بچھایا۔ لالٹین کی لو اونچی کی اور کہنے لگی۔

"میں بھی کہوں — یہ سارا دن کوا کیوں بولتا رہا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تو آنے والا ہے۔" میں سہ پہر کو آ گیا تھا۔ ملنے ملانے اور کھانا کھانے میں دیر ہو گئی۔

"ہائے مجھے کیا پتہ تھا کہ تو آیا ہوا ہے اگر مجھے پتہ چل جاتا تو میں نائیوں کے گھر کی چھت پہ کھڑے ہو کر تجھے ایک نظر دیکھ آتی۔"

اس نے لالٹین میرے قریب رکھ دی، پھر بولی۔

"اب تو بڑا آدمی ہو گیا ہے نا — گھبرا گیا — فکر نہ کر — میں تجھے پیالے میں چائے نہیں دوں گی۔ میں نے تیرے لئے چائے کا سیٹ خرید لیا ہے اور کئی مہینوں سے چائے کا بند ڈبہ منگا کر رکھا ہوا ہے۔ مجھے تو مزہ آئیگا۔"

وہ مجھے بٹھا کر چائے بنانے لگی۔ ساتھ ساتھ گھر کے حالات اور خیریت پوچھتی رہی۔ بات بات پر خوش ہو کر کہتی۔

"میں تو ہر وقت دعا مانگتی رہتی ہوں، اللہ تجھے اس سے بڑا عہدہ دے، میرا دل تو ہر وقت تیری یاد میں جلتا رہتا ہے۔ پتہ نہیں تو نے بھی کبھی مجھے یاد کیا ہے کہ نہیں ۔۔ اڑیا ۔۔ تو نے آج تک مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت بھی نہیں دی۔ آپا ہم سے ناراض رہتی ہے پر تجھے تو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔"

میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ وہ مجھے کوئی بات کرنے کے قابل نہ چھوڑے مجھے اپنی بات شروع کر دینی چاہیے میں نے کہا

"میں تجھے یاد تو کرتا ہوں لیکن یہ یاد بڑی تلخ ہوتی ہے، مجھے تمہارے حالات سن کر ندامت ہوتی ہے۔"

وہ چپ ہو گئی اس کی بجائے اس کی والدہ نے جواب دیا۔

"پتر ۔۔ تو ٹھیک کہتا ہے ۔۔ تو سیانا ہے تو ہی اسے سمجھا ۔۔ اس نے ہمارا دین اور دنیا دونوں خراب کر دیئے ہیں۔ کاش یہ دن دیکھنے سے پہلے مجھے بھی موت آجاتی۔"

"ماں جی" میں نے کہا "میں اسی مقصد سے آیا ہوں۔ گاؤں والے آپ لوگوں کا حقہ پانی ۔۔۔۔"

خالہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح غراتی ہوئی میرے قریب آئی اور چیخنے کے سے انداز میں بولی۔

"گاؤں والوں کو چھوڑ ۔۔ تو اپنی کہہ۔"

میں سہم گیا۔

وہ بولی "میں سمجھتی تھی تو پڑھا لکھا ہے انصاف کی بات کرے گا مگر تو بھی ۔۔۔۔" اس کی آواز بھرا گئی اور آنسو پیتے ہوئے بولی۔

"اس اجڑے گاؤں میں کیا کچھ نہ ہوا۔ یتیموں کی زمین لوگوں نے اپنے نام لگوالی۔ قاتل دندناتے پھرتے رہے اور بے گناہ سولی چڑھ گئے۔ چوریاں۔ ڈاکے، شراب، جوا، اغوا ۔۔ مگر ایک ہمارا نکاح نہ ہوا۔ ہم نے والدین اور گاؤں والوں کی منتیں کیں۔ سائیں چپ شاہ کے مزار پہ چراغ جلائے۔ مولوی صاحب کے پاؤں پکڑے مگر انہوں نے کہا پنچایت نہیں مانتی ۔۔ کیونکہ اس سے نئی رسم پڑنے کا ڈر ہے۔ میں پوچھتی ہوں کیا تو نے بھی یہی کچھ پڑھا ہے؟" وہ بلند آواز میں رونے لگی۔

روتے روتے بولی "میں سوچتی تھی ایک دن تجھے خیال آئے گا۔ تو آئے گا اور انصاف کرے گا۔ مگر آج میری تمام امیدیں خاک میں مل گئی ہیں۔ میرا سارا مان ٹوٹ گیا ہے۔" وہ ہچکیاں لینے لگی۔

مجھے یوں لگا جیسے میرے اور اس کے درمیان کھڑی ان دیکھے خوف کی دیوار بھی ہچکیاں لینے لگی ہے۔

وہ دیوار سے ٹیک لگائے گھٹنوں میں سر چھپائے دیر تک روتی رہی۔ لگتا تھا اب کبھی چپ نہیں ہو گی۔

کسی انجانے خوف سے میرے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے اور دل و دماغ میں پٹاخے سے چلنے لگے پھر مجھے ایسا لگا جیسے وہ دیوار جس سے لپٹ کر وہ برسوں سے گریہ کر رہی ہے۔ اس کے آنسوؤں سے آہستہ آہستہ گرنے لگی ہے۔

بشریٰ رحمٰن

شکریہ صنم

تین دن ہو گئے تھے۔ میں اپنی کہنہ روایات کی نہتی فوج کے ساتھ لڑ رہی تھی جب میں تابڑ توڑ حملے کر کے اپنے مضبوط دلائل سے اقدار کے قلعے پاش پاش کر دیتی تو مذہب کی آڑ لے کر شرم و حیا کی کمک کہیں سے نکل آتی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میدانِ جنگ میں توپ و تفنگ کا سہارا لے کر آگ اور خون کی ہولی کھیلنا آسان ہے۔ پر اپنے پُرسکون مصفا بستر پر بیٹھ کر رسم و رواج اور نفسیاتی بندشوں کے بُت چکنا چور کرنا بہت مشکل ہے۔ مگر شاعر نے کہا ہے نا؟ کہ کوئی مشکل نہیں ایسی کہ جو آسان نہ ہو ——— میں نے بھی تحت الشعور میں جذبات کی گرما گرم فوج بچا کر رکھی تھی..............

خالص انسانی جذبات ——— جن کا سلسلہ تمنا اور طلب ہے۔ محبت جن کا آخری ٹارگیٹ ہوتا ہے۔ زندگی کے میدانِ وغا میں سب سے مہلک ہتھیار محبت ہی ہے ——— اور جب کوئی خاکی بت کمک لے کر میدان میں اُتر آئے تو وسوسوں اور واہموں کی کشتیاں جلا کر آتا ہے ——— من و تو کا حجاب چیر کے رکھ دیتا ہے ——— اور ہر قیمت پر.....فتح ایک روشن فتح اس کا مقصد بن جاتی ہے۔

آخر تین دن کی مسلسل اور اعصاب شکن جنگ کے بعد خاندانی اقدار اور معاشرتی روایات کی فوجیں پسپا ہونے لگیں۔

آپ نے کبھی کسی فاتح جرنیل کا مکھڑا دیکھا ہے ——— ؟

نشاط اور مجبول ایک ساتھ رہتے ہیں۔

میں نے نہا دھو کر خوبصورت کپڑے پہنے اور اپنی فتح کی خوشخبری اس لان کو سنانے کے لئے اس کے فلیٹ کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

افسوس پہلا حرف گھمانے سے ہی دل کی دھڑکن کی آواز آئی۔ ایک بار..... دو بار........ تین بار..........

تین چار مرتبہ نمبر ملانے کی کوشش کی۔ نمبر نہیں ملا۔ تو میں نے ریسیور واپس رکھ دیا۔ مگر دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے اس کے سامنے کھڑی اقرارِ محبت کر رہی ہوں

عورت پر گھبراہٹ کی ایک گھڑی ضرور آتی ہے۔

یہ اقرارِ محبت کی گھڑی ہوتی ہے۔

محبت اور اس سے متعلقہ ہر قسم کے احساسات کو وہ اپنی نسوانیت کا بیش بہا خزینہ سمجھتی ہے۔ اظہار تو اس کا آخری وسیلہ ہوتا ہے۔ اس لئے وہ مرد کو گومگو کی کیفیت میں رکھتی ہے۔ کبھی ہاں کہتی ہے ——— کبھی اپنی ہی زبان کاٹ کر نہ کہہ دیتی ہے۔ وہ جانتی ہے، مرد جب شکار کو چت کر لیتا ہے تو اسے سونگھ کر آگے نکل جاتا ہے۔ اقرار سے پہلے اسے عورت پُر اسرار نظر آتی ہے، اور وہ دیوانہ وار اس کے گرد چکر لگاتا ہے ——— عورت اس دیوانگی پر مرتی ہے ——— مرنا چاہتی ہے، اس لئے اظہار محبت کر کے اپنے جسد کو اس روحانی قوت سے خالی نہیں کرنا چاہتی .... یہی وجہ ہے۔ جب محبت اسے اظہار کے موڑ پر لے آئے تو وہ خوش بھی ہوتی ہے اور مغموم بھی ——— ہنستی بھی ہے اور روتی بھی ہے ——— اس طاقت کو استعمال بھی کرتی ہے اور اس کے لُٹ جانے پر افسردہ بھی ہوتی ہے ———

اس دھوپ چھاؤں کے منظر کو شاعر اور ادیب اپنے اپنے ظرف کا مفہوم عطا کرتے رہتے ہیں۔ مرد اس کیفیت کو کوئی بھی نام کیوں نہ دیں ——— مگر حقیقت یہ ہے کہ محبت کی طاقت کو اقرار کر کے ضائع کرتے وقت اس پر عجیب بھیگی بھیگی گھبراہٹ اور معطر خفت طاری ہو جاتی ہے۔

یہی گھبراہٹ اس وقت مجھ پر بھی طاری تھی۔

یہ تو اچھا ہوا کہ فون نہ ملا۔ ورنہ جانے میں اسے کیا کہہ دیتی۔ دل حد سے زیادہ دھڑک رہا ہو تو زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔ لڑکھڑاتی زبان اظہار کے لئے مناسب الفاظ نہیں چن سکتی۔ اس پر میری کمزوری کھل جاتی ———

کمزوری کیوں ——— ؟ میری محبت عیاں ہو جاتی۔

میں جو پچھلے چھ ماہ سے باقاعدہ ارسلان کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہوں اور بڑے سلیقے سے اپنے آپ کو طرح دے کر نکل جاتی ہوں۔

میں نے جب "شاہکار اشتہاری کمپنی" میں ملازمت کی تھی، تو محبت وغیرہ کے چکر میں پڑنے کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔ دراصل میں نے دو سال پہلے فائن آرٹس میں ایم اے کیا تھا۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں میں سب سے اچھی تصویریں بناتی تھی۔ پورٹریٹ بنانے میں تو میرا کوئی مقابلہ ہی نہ کر سکتا تھا۔ کلاس میں فرسٹ آ کر میں گھر بیٹھ گئی تھی۔ اس وقت یوں لگتا تھا، حسین و جمیل پورٹریٹ بنا بنا کر میں اِک جہانِ نو تشکیل کر لوں گی۔ آدمی اپنے ارد گرد بہت سے چہرے تخلیق کرنے کے قابل ہو جائے تو اسے بے چہرہ دنیا کی پروا نہیں رہتی۔

میں شاعروں اور مصوروں کو خوش نصیب جانتی تھی جو اپنے تخیل کو ایک پیکر میں ڈھال لینے کی قدرت رکھتے ہیں اور پھر اس کو تصویر میں بٹھا کر مدتوں اس کی پوجا کرتے ہیں۔ اس بھری دنیا میں، "دنیا جہان کے کام چھوڑ کر سرو قدے، لالہ رخسارے آفتِ دل کو ڈھونڈنے کی فرصت کسے ہے ؟

میں نے بھی چہروں کے سمندر میں غوطہ لگا دیا۔ مگر سال کے اندر اندر ہی اوب گیا۔ اس وقت خالقِ کائنات کو بے اختیار داد دینا پڑی۔ وہ چہروں سے کبھی نہیں تھکتا۔ اس کے کتنی ورائٹی ہے۔ ذرا دُنیا کے نقشے پر نظر ڈالیں افریقہ، امریکہ، چین، جاپان، ایشیا، عرب ——— ہر خطہ الگ، ہر چہرہ جُدا ——— ہر قوم کی ساخت

مختلف ——— وہی آنکھ کان ناک.......... ہاتھ پاؤں ——— دل و دماغ ——— مگر ہر چہرے کا تاثر جدا ——— ہر چہرا دوسرے سے الگ ——— پھر بھی ہر فرد کی پہچان اس کا چہرہ ——— پھر بھی دل کا بھانڈہ کا داعد آئینہ چہرہ ———

واہ واہ ———

اس بیکراں تخیل اور اس ہزار رنگ خالق کو دن میں کئی بار داد دیتی ...... اور منہ اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا کرتی جہاں سے چہرے اُترتے ہی رہتے ہیں۔ میں نے سب سے پہلے تو گھر کے افراد کے پورٹریٹ بنائے کہ گھر والوں کو تسخیر کرنا ہر شہنشاہ کے لئے ایک کٹھن مسئلہ بنا رہا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے آپ کو ترقی پسند ظاہر کرنے کے لئے نوکروں تک کے پورٹریٹ بنا ڈالے۔ اور جب میں نے گھر سے ذرا آگے قدم بڑھایا۔ عزیزوں اور دوستوں کی خواہشیں دہلیز تک پہنچیں تو میں اکھڑ چکی تھی۔

آخر ان چہروں میں کیا تھا ——— ؟

کہ آدمی ان کو زندوں سے اتار کر مردوں میں دکھائے۔ بار بار وہی آنکھیں، ہونٹ، ناک، کان بنا بنا کر میں تھک گئی۔ پھر میں نے برش توڑ دیا ——— ہاں ایک اور وجہ بھی تھی ———

وہ شبیہہ تو باہر ہی نہ آتی تھی جس میں میں اپنے مقدر کی لَو تلاش کرتی۔ میں نے کچھ ادھوری خواہشوں اور بے نام خیالوں کو مجسم کرنا چاہا۔ تو خود رنگ میری ہنسی اڑانے لگے۔

مرد .....

مرد ...... مرد......

حقیقت میں اَن دیکھے مرد کی شبیہہ بنانا بہت مشکل ہے۔ اس کے مزاج کی طرح اس کے نقوش بھی تلون آشنا ہوتے ہیں۔ ویسے بھی مرد نقوش سے نہیں، کردار سے بنا کرتا ہے اور اس کے کردار کی تو میں نوع بنوع کہانیاں سُن چکی تھی، کہ ایک شریف النفس وفادار مرد کو مجسم کرنے کے لئے ہر رنگ پھیکا دکھائی دیتا تھا۔

دو سال گھر میں بیٹھی رہی ———

نہ تو دُنیا نے کھوج لگایا

نہ کوئی الف لیلوی شہزادہ برق رفتار گھوڑے پر بیٹھ کر میری تلاش میں نکلا۔

تیسرے سال میں نے ایک اشتہاری کمپنی میں ملازمت کر لی۔ انہیں ایک مصور خاتون کی ضرورت تھی۔ میں جب دفتر میں آئی تو میرا ارادہ بالکل وہی تھا جو پرانی اقدار کی چادر میں لپٹی ہوئی لڑکیوں کا ہوتا ہے۔ ایم۔ اے تو کر لیتی ہیں۔ مگر دل کو گھر کی چار دیواری میں رکھتی ہیں۔ لڑکوں کے ساتھ آ بیٹھتی ہیں مگر جسم کے گرد دوپٹے کی باڑ کھینچ لیتی ہیں اور مسکراتے وقت بطور خاص احتیاط برتتی ہیں کہ کہیں سے کوئی زاویہ روایت شکنی کی ترغیب دیتا نظر نہ آتا ہو۔

میں نے دفتری ماحول کے بارے میں دلچسپ قصے سن رکھے تھے

اور مجھے وہ لڑکیاں زہر لگتی تھیں جو ــــــ "ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد" کی تفسیر بن جاتی تھیں۔ اس لئے میں اپنے آپ کو اصولوں کے غلاف میں لپیٹ کر دفتر جا بیٹھی تھی۔

دفتر کا ماحول بہت صاف ستھرا تھا۔ کام کے وقت صرف کام ہوتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ دفتر سے نکلتے ہی لڑکیوں اور لڑکوں کی سمتیں بدل جاتیں۔ بہر حال اندر صاف ستھرا ہو تو باہر کا کوئی غم نہیں رہتا۔ میں اور ارسلان ایک ہی کمرے میں بیٹھتے تھے۔ ارسلان میڈیا منیجر تھا۔ ویسے بھی ہمارا کمرہ سارے دفتر کا کلب تھا۔ سب لڑکیاں لڑکے آتے رہتے۔ بحث و مباحثہ ہوتا ــــــ اور ہر معاملہ طے ہوتا۔ کبھی کبھی جب میں تھک کر نگاہ اٹھاتی تو ارسلان مجھے دیکھ کر مسکرا دیتا۔ ایک دھیمی سی مسکراہٹ جس پر صرف شبہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر سر جھکا کر اپنا کام کرنے لگتا۔ پتہ نہیں اس مسکراہٹ میں کیا تھا؟

پہلے پہل مجھے یوں لگا کرتا جیسے وہ مجھ پر طنز کرتا ہے اور کہتا ہے "کیا ضرورت تھی، دفتر میں نوکری کرنے کی۔ تم کسی مدرسہ کی استانی کیوں نہ بن گئیں.... ؟ جہاں ہر وقت اخلاقیات پر درس دیا کرتیں" مگر رفتہ رفتہ اس کی مسکراہٹ کا اسرار مجھ پر کھلتا گیا۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا؟ کہ ایک دم ہم بند کمرے سے باہر نکلتے ہیں تو سامنے چاند کا طبق روشن نظر آتا ہے۔ بے اختیار مسکراہٹ لبوں پر آجاتی ہے اور دل میں ایک نئی امنگ سر اٹھاتی ہے۔

ہاں وہ مسکراہٹ کئی دن تک میرے وجود کی سوئی کلیوں کو جگاتی رہی۔ بہت دن تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔

پھر ایک دن ایسا ضرور آتا ہے۔ جب عورت مرد کی مسکراہٹ کا مطلب سمجھنے لگتی ہے۔ اس گھڑی سے وہ خود بھی ڈرتی ہے۔

اس دن اچانک ہم دونوں لفٹ میں اکیلے ہو گئے۔

اس نے سرسری انداز میں مجھے دیکھا۔ اور پھر سگریٹ سلگا کر منہ کے ساتھ لگا لیا۔ اور بولا

"آپ کیسے جاتی ہیں ــــ؟"

"بس سے"....

میں نے آہستہ سے کہا۔

پھر تھوڑی دیر انتظار کیا۔ میرا خیال تھا وہ ابھی مجھے آفر دے گا۔ اور کہے گا میں اس کے ساتھ اس کی کار پر چلی جایا کروں۔ یا جو بھی ایسے موقعوں پر کہا جاتا ہے۔ اور میں نے جلدی جلدی دل میں جواب بھی سوچ لیا تھا۔ وہی جواب جو روایت زدہ لڑکیاں دے سکتی ہیں۔ مگر لفٹ نیچے پہنچ گئی۔ اور اس نے آگے کچھ بھی نہ کہا بلکہ مجھے خدا حافظ کہہ کر کار پارک کی طرف چلا گیا۔ میں بس سٹاپ پہ کھڑی رہ گئی۔ اور وہ کار سٹارٹ کر کے میرے سامنے سے نکل گیا۔ مجھے سُبکی سی محسوس ہوئی۔ کیا میں اس قابل نہیں تھی۔

باوجود اس کے کہ میری عمر پچیس چھبیس سال ہو گئی تھی۔ میں ابھی تک نوخیز اور تر و تازہ ہی لگتی تھی۔

ایک دن میں اوپر جا رہی تھی، وہ نیچے آرہا تھا۔ راستے میں اس نے ہاتھ ہلایا ــــــ ہیلو کہا.... اور سیڑھیاں اتر گیا ــــــ جب کہ ہر مرد کسی بھی عورت کے لئے دو گھڑی رک سکتا ہے۔ بات کر سکتا ہے ــــــ وقت ضائع کر سکتا ہے۔ یوں دفتری ملاقاتوں میں اس نے مجھے ایک کونگ ہی سمجھا

میں بھی اپنی جگہ پر سیدھی ہو گئی۔

ایک روز میری اور اس کی ملاقات ایک شاپنگ پلازا میں ہو گئی اور میرے ہاتھ سے سارے بھاری بھرکم لفافے اس نے پکڑ لئے۔ بولا

"چلئے میں آپ کو باہر چھوڑ آؤں ۔"

مرد کی نیت کا پتہ چل جائے۔ تو عورت اس پر ایک انجانا سا بھروسہ کرنے لگ جاتی ہے۔ میں ہنس ہنس کر اس سے باتیں کرنے لگی۔ باہر نکل کر اچانک بولا۔

"میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ آؤں ____ "

"کیوں ____؟"

میں نے اجڈ پنے سے جواب دیا۔

"ویسے ہی" ____ ہنس کر بولا۔" اتنے سامان کے ساتھ آپ ٹیکسی پر جائیں گی۔

"مجھے عادت ہے۔" میں نے کہا۔" ٹیکسی اور بس پر سفر کرنے کی عادت پڑ جائے تو کوئی بات عجیب نہیں لگتی۔

اس نے ٹیکسی سٹینڈ کی طرف قدم بڑھائے۔ ایک ٹیکسی رک کر دی۔ میرا سامان اس میں رکھا اور چلا گیا۔

میں حیرت سے مڑ مڑ کر اسے دیکھتی رہی۔

عام مردوں سے مختلف لگا۔ مجھے ____ وہ چاہتا تو مجھے مجبور کر سکتا تھا۔ اور میں چاہتی تو مجبور ہو سکتی تھی۔

پھر ایک عرصہ تک سلسلہ کچھ یونہی سا چلتا رہا۔ دفتری اوقات میں مبہم سی مسکراہٹ کا تبادلہ اور ادھر ادھر ٹکراؤ پر صرف ہیلو کہنا۔

پر سامنا تو ضرور ہو جاتا۔

جب وہ مجھے ہیلو کہہ کر آگے نکل جاتا۔ تو میں بڑی دیر تک اسے جاتا ہوا دیکھتی رہتی۔۔۔۔

آدمی اپنی فطرت کے خلاف کوئی کام کر رہا ہو تو بڑا انوکھا لگتا ہے۔ انوکھے مرد عورتوں کو بڑے اچھے لگتے ہیں۔ بعض مرد عورتوں کو شیشے میں اتارنے کے لئے اپنی فطرت سے الگ ہو کر جال بچھانے لگتے ہیں۔

وہ اپنے حربے میں بالکل کامیاب رہا تھا۔

جب وہ بے نیاز بن کر جلدی جلدی میرے قریب سے گزر جاتا تو میں دیر تک اسے مڑ مڑ کر دیکھتی رہتی اور اکثر تنہائی ملتے ہی اس کے بارے میں سوچا کرتی۔

اور پھر ایک دن میں اس کے ساتھ پلازا کے دلکش ریستوران میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ چائے پینے کا سلسلہ دراز ہوا تو گفتگو کو دوسرا رنگ ملا۔ ہر عورت مرد کے منہ سے بس ایک ہی فقرہ سننا چاہتی ہے ____

یعنی وہ کب اور کیسے اس کے عشق میں گرفتار ہوا ____؟

جو مزہ مرد کو ہر بار اپنی قیود توڑ کر ملتا ہے ویسا ہی نشہ عورت کو اس وقت آتا ہے۔ جب وہ دیکھتی ہے کوئی مرد اس کا

عشق میں مبتلا ہو گیا ہے ــــــــ مرد کی طرح وہ بھی یہ سن کر اپنے آپ کو نئے سرے سے جوان محسوس کرتی ہے ــ

شاید اسی لئے قدرت نے عشق کی کوئی عمر مقرر نہیں کی ؟

جب ارسلان نے مجھے یہ بتایا کہ وہ تو شروع دن سے ہی میرے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا۔ صرف میری نفرت کی وجہ سے بے نیاز بنا ہوا تھا۔ تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں دنیا کے سب سے اونچے مینار پر پہنچ گئی ہوں۔ جب تک وہسکی کا گھونٹ نہ بھرا جائے کیا پتہ چلتا ہے کہ ظالم کس طرح چڑھتی ہے ؟ محبت کا نشہ بھی وہسکی کے گھونٹ سے کم نہیں ہوتا۔

مجھے یہ نشہ چڑھا تو میرے پاؤں زمین سے دو دو فٹ اونچے ہو گئے۔

مگر بات کافی ہاؤس سے آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔ کیونکہ مجھے بھی برابر اپنی عمر کے ضائع ہونے کا احساس ستانے لگا تھا مگر میں تعصبات اور رسموں کی صدیوں پرانی گٹھڑی اپنے سر پر اٹھا رکھی تھی اسے پھینکنے پر تیار نہ تھی۔ اس بات پر ارسلان کو بہت غصہ آیا کرتا۔ اور غصے میں عاشق بڑا پیارا لگتا ہے۔

ایک دن جب وہ عشق کے گھوڑے پر سوار جذبات کا کوڑا فضا میں لہرا رہا تھا میں نے صاف کہہ دیا۔

"ارسلان تم سیدھے سیدھے مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔"

وہ بولا۔

"میں نے شادی سے کب انکار کیا ہے ؟ شادی ہی تو کرنا چاہتا ہوں۔ مگر روایتی شادی نہیں ــــ"

"روایتی شادی کیا ہوتی ــــ ؟"

"شادی سے پہلے لڑکی اور لڑکے کو ایک دوسرے سے بے حجابانہ ملنا چاہیئے۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح جاننا چاہیئے۔ ہم قدیم زمانے میں سانس لے رہے کہ آناً فاناً شادی والا حادثہ کر بیٹھیں۔ اس طرح کی شادیاں روایتی شادیاں کہلاتی ہیں۔ تم مجھ پر اعتبار کرو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے ساتھ گھومو پھرو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تھوڑا سا زندگی کا لطف اٹھائیں۔ جو شادی کے بعد ہرگز نہ اٹھا سکیں گے۔"

"بہر حال محبت کی انتہا تو شادی ہی ہے نا ؟"

"مگر تم اتنی جلدی انتہا پر کیوں پہنچنا چاہتی ہو۔ انتہا تو کسی بھی جذبے کا اخیر ہوتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے محبت کرنے والے شادی نہ کیا کریں۔"

"میں یہ کب کہتا ہوں۔ میں تو کہتا ہوں، محبت کرنے والے پہلے محبت کو عریاں دیکھ لیں۔ عشق کی انتہا تک پہنچیں شادی شدہ زندگی چکی کا ایک پھیر ہوتا ہے۔ دونوں کو دوبارہ دیوانہ بننے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ بچے ہو جائیں تو قدموں میں فرائض کی فولادی زنجیریں پڑ جاتی ہیں۔ محبت کرنے کا لطف پہلے کی طرح نہیں آتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"آؤ تھوڑا عرصہ محبت کریں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اور یہ کہتے وقت اس کی شوخ آنکھوں میں عنابی رنگ کے ڈورے مچل اٹھتے، جنہیں دیکھ کر میرا دل بھڑ بھڑ جلنے لگتا۔

"تم ایک روایتی لڑکی بن کر دکھاؤ۔ دیکھو تو دنیا کس قدر حسین ہے۔ آؤ عاشق اور معشوق کی نظر سے اس دنیا کو دیکھیں، اس سے پیار کریں۔ ایک دوجے میں کھو جائیں۔ شادی کرنے کو تو عمر پڑی ہے۔ وہ لوگ جو پیار کے

صلاحیتوں سے محروم ہوتے ہیں۔ شادی کر لیتے ہیں۔"

"پھر اس کے بعد کون کسی سے شادی کرتا ہے ارسلان ——— ؟" میرے اندر کی وہمی لڑکی بول اٹھتی۔

"یہی تو میں کہتا ہوں۔ مجھ پر اعتماد تو کر کے دیکھو۔ جہاں اندھا اعتماد نہیں ہوتا وہاں اندھی محبت نہیں ہوتی۔"

"تم نہیں جانتے . . . . . . میں رک رک کر کہتی۔ عورت کو ہمیشہ آنکھیں کھول کر محبت کرنی چاہیئے۔"

اس بات پر بالآخر ہمارا جھگڑا ہو جاتا۔

تین دن پہلے بھی ہمارا زبردست جھگڑا ہوا تھا۔

اصل میں ہمارے دفتر کو ایک ہفتے کی چھٹیاں ہو رہی تھیں۔ اور ارسلان چاہتا تھا۔ ہم دونوں چھٹیاں شہر سے باہر گزاریں۔ اور اس خیال سے ہی میری روح فنا ہو رہی تھی۔ میں جانتی تھی شہر سے باہر جانے کا انجام کیا ہوگا ——— ؟

اس لئے میں نے صاف صاف کہہ دیا۔

"ارسلان ہم دونوں شہر سے باہر چلے گئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے پیٹرول کے قریب آگ رکھ دیں۔ اور اپنا تماشا آپ دیکھیں۔"

"تو کیوں نہ ایسا کریں ——— ؟"

وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں جذبات کے الاؤ سلگنے لگے۔ اس وقت وہ مجھے اتنا پیارا لگا کہ جی چاہا اسے کلیجے میں بھر لوں۔

"محبت کے دو رنگ ہوتے ہیں۔" وہ بولا۔ "ایک شادی سے پہلے اور دوسرا شادی کے بعد۔ شادی اگرچہ دونوں کی رضامندی سے ہوتی ہے مگر شادی کے بعد محبت کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ اس لئے تو کہہ رہا ہوں شادی سے پہلے محبت کا وہ جنون خیز رنگ دیکھ لو۔ کیونکہ پھر ساری عمر شادی کے بعد والی پھیکی پھیکی اور زبردستی کی محبت کے ساتھ زندگی گزارنا ہوگی۔"

"ارسلان تم شادی کو اتنا بھیانک بنا کر کیوں پیش کرتے ہو ؟"

"بھئی میں سچ بولتا ہوں۔ میں شادی کے خلاف نہیں ہوں۔ شادی ایک باعزت سمجھوتہ ہے اور معاشرے کا ایک قابلِ عزت سٹیٹس بھی ہے۔ اتنی بہت سی باتیں اس میں شامل ہو جاتی ہیں کہ محبت کا جنون کہیں پیچھے رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے جب عورت کے بچے ہوں، گھرداری ہو۔ اس کے پورے فلسفۂ حیات میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ یہی حالت ایک ذمے دار مرد کی ہوتی ہے۔ محبت کے سوا بہت سے غم ستانے لگتے ہیں۔ میں نے کئی ایسے عاشق و معشوق دیکھے ہیں جو بیچارے کہتے ہیں کہ شادی کے بعد وہ تو سب ملا مگر عشق کرنے کی فرصت نہ ملی ——— بھئی ایک شادی میں تو پورا زمانہ شامل ہو جاتا ہے۔ اب ہم دونوں اکیلے ہیں۔ بس حوا اور آدم ہیں۔ کچھ زندگی صرف محبت

کو کیوں نہ دیں۔ ہمارے درمیان زمانہ کیوں حائل ہو۔ ایک بار اس طرح محبت کر لیں۔ ساری زندگی اس طرح کرتے رہیں گے"

میں چپ ہو گئی۔

بولا

"شادی بھی ہو جائے گی۔ شادی کے بعد بچے ہو جائیں گے۔ پھر تم تھک ہار کر گھر بیٹھ جاؤ گی اور میں بچوں کے چکر میں پڑ جاؤں گا۔ پھر تم کہو گی — جیسی محبت کا میں دعویٰ کرتا تھا ویسی محبت میں نے تم سے نہیں کی وغیرہ وغیرہ"

میں ہنس پڑی —————

"ہاں" وہ سر ہلا کر بولا "یہ سب باتیں اس زندگی کا خاصہ ہوتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں ایک بار ہم دونوں مل کر زندگی کی انتہا دیکھ لیں۔ پھر ہاتھ تھام کے اسی قانونی راستے پر چل پڑیں۔"

تجویز اچھی تھی۔ دل کو بھاتی تھی۔ مگر میرا ضدی دل نہیں مانتا تھا۔ دل کے اندر ہی سیج سجی تھی۔ جسے کنواریاں ہوش سنبھالتے ہی سجاتی ہیں۔ اور پھر نکاح کے بول ہی اس سیج کو سہاگن کرتے ہیں۔ یوں ہر جوان لڑکی کو ایسے ہی مست ملنگ جیالے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اپنے جنون کی ضرب سے اس کے اوہام کے سارے بت ریزہ ریزہ کر دے۔ وسوسوں کی مورتیاں توڑ دے۔ جنونی قسم کے دعوے باز عاشق کے زمانے میں بڑے اچھے لگتے ہیں اور جو مرد اپنے جذبات کا کھلم کھلا اظہار کرتے ہیں وہ عورت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ لیتے ہیں۔ میں پھر اپنی سوچوں کے پل صراط پہ پہنچ گئی تھی۔ ایک طرف محبت میرا دامن کھینچ رہی تھی تو دوسری طرف شرم و حیا کی روایات سرخ جھنڈی دکھا رہی تھیں۔

وہ مجھے گومگو کی حالت میں دیکھ کر بولا۔

"ایک سادہ کاغذ پر دستخط کر دوں کہ سوات سے واپس آنے کے بعد میں فوراً تم سے شادی کر لوں گا۔"

میں ہنس دی۔

"اتنی بھی بے اعتباری نہیں ——"

"بے اعتباری تو مسلسل دکھا رہی ہو کہ میرے ساتھ سفر کرتے ہوئے ڈر رہی ہو"

"ڈرنا تو چاہیے نا ارسلان ——— ؟

"تو عہد توڑنے والوں کو محبت نہیں کرنی چاہیے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے تو دستبردار ہو جاؤں ؟"

وہ کچھ سوچ کر اٹھا۔

"اگلے دو دنوں میں مجھے تمہارا جواب چاہیے۔

"مجھ میں حوصلہ نہیں ہے ارسلان۔"

"حوصلہ پیدا کرو۔" وہ گرجا

"مرد ہمیشہ عورت کے انکار کو اقرار سمجھتا ہے۔ یہ بات نہیں۔ عورت دل سے دماغ سے سوچتی ہے۔ انکار تو سوچ سمجھ کر کرتی ہے اور سمجھتی ہے کہ انکار میں ہی اس کی بھلائی ہے۔ مگر اس انکار کو پاش پاش ہونے سے بچا نہیں سکتی۔ کہ اس کا دل بیچ میں آن حائل ہوتا ہے۔"

وہ بولا

"پرسوں میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔ اب زیادہ دن انتظار نہیں کروں گا۔ پرسوں سے ہماری چھٹیاں ہو رہی ہیں۔"

"مگر میں گھر سے کیا بہانہ کر کے جاؤں گی؟" میں نے پوچھا

"کماؤ لڑکیوں پر سختی نہیں کی جاتی۔ میں جانتا ہوں۔ تم صاف کہہ سکتی ہو کہ دفتر کی ساری لڑکیاں سوات جا رہی ہیں۔ کوئی تمہارے پیچھے تفتیش کرنے نہیں آئے گا۔"

میں جانتی تھی جب سے میں نے نوکری کی تھی گھر والے میری طرف سے بے فکر ہو گئے تھے۔ جیسے میں نے نوکری نہیں کی۔ میری جنس بدل گئی ہے۔ خود کفیل کیا ہوئی ہوں، اپنی حفاظت خود کرنے کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ دیر سویر آؤں کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ جیسے اب میں عورت نہیں رہی۔ گھر والوں کی اس بے حسی سے میرا دل دکھتا تھا۔ دل چاہتا تھا وہ مجھے صرف عورت سمجھیں ——— کانچ ہی کانچ ——— اور اندر باہر آتے جاتے ہوئے ہدایات سے نوازیں مثالی فقرے کہیں۔ . . . .

"جواب دیں مجھے۔" ارسلان غرّا رہا تھا۔

"بھئی پرسوں میں تمہیں فون کروں گی۔"

"فون پر میں انکار نہیں سنوں گا۔ تمہیں ہر حالت میں اپنے آپ کو راضی کرنا پڑے گا۔"

"سوچوں گی"۔ ... میں نے دھیرے سے کہا۔

"سوچنے والی لڑکیاں بزدل ہوتی ہیں۔ پھر ان کی زندگی کے فیصلے دوسروں کے اختیار میں چلے جاتے ہیں۔"

"ہاں ... ہاں"۔ ... میں نے چڑ کر کہا ... "میں جانتی ہوں، بزدلی کیا ہے اور بہادری کیا ———؟"

دل میں جو جذبات کے تپتے صحرا میں ایک عرصہ سے پاپیادہ چل رہی تھی اور پھر بھی پیاس نہیں بجھاتی تھی میں بہادر تھی کہ بزدل،

میرے چہرے پر خفگی کی لہر دیکھ کر کہنے لگا

"میں انکار سننے کا عادی نہیں ہوں۔"

"میں نے کبھی اقرار نہیں کیا" ——— میں نے اسی لہجے میں کہا۔

"تو کیا کرو گی ———؟"

"تو ۔۔۔۔۔ تم" ارسلان بھوکے چیتے کی طرح غرایا

"صرف اتنا کہوں گی ۔۔۔ ارسلان تمہارا بے حد شکریہ!"

"شکریہ ۔۔۔ شکریہ ۔۔۔ کس بات کا شکریہ، خبردار یہ منافقت میرے ساتھ مت کرنا۔ میں آکر تمہارا سر توڑ دونگا ۔۔۔۔ شکریہ تو بڑا اجنبی سا لفظ ہے، اور محبت کرنے والوں کا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

"جبھی تم جو مجھے اتنی اچھی آفر دے رہے ہو ۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔۔

"مداق!" ارسلان نے دانت پیس کر کہا "تم ایک دن اپنے طرز عمل پر پچھتاؤ گی ۔۔۔۔۔۔۔

اور تین دن ہو گئے تھے مجھے اپنے طرز عمل کو بدلتے ہوئے!

اگر میں نے کسی دنیوی مسئلے پر اتنا غور و خوض کیا ہوتا تو آج دنیا کو ایک اچھا حل پیش کر سکتی۔ مگر یہ سراسر میرا ذاتی بلکہ دلی مسئلہ تھا، ہر چند کہ میں ایک روایت پسند قدیم گھرانے کی لڑکی تھی، محبت نے میرے قدم اکھیڑ دیئے تھے۔ تین دن اور دو راتیں میں نے محبت پر ہر پہلو سے غور کیا تھا ۔۔۔۔۔۔ بالآخر محبت جیت گئی ۔۔۔۔ اور میری ساری مدافعتی قوتیں ہار گئیں ۔۔۔۔۔

جوانی بار بار نہیں آتی ۔۔۔۔

زندگی میں ایک بار شیشے کی ڈگر پر چلنے کو جی چاہتا ہے۔

عورت بھی عجیب مخلوق ہے۔ اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کر ایک آدمی کو اپنے عشق میں پاگل ضرور دیکھنا چاہتی ہے اور کبھی کبھی اس کے لئے جوانی کا آخری پتہ بھی لگا دیتی ہے۔ حالانکہ میں بھی جانتی تھی کہ کامیاب ازدواجی زندگی کے لئے اس آخری پتے کو بچا کر رکھ لینا چاہیئے۔

مگر اب بات ۔۔۔۔ میرے اختیار میں نہ رہی تھی۔

اور میں اس کے اشاروں پر چلنے کے لئے تل بیٹھی تھی۔ اور اتنی دور پرواز کے لئے سارے پر اکٹھے کر لئے تھے۔

آگے جانے والے انجام کے بارے میں نہیں سوچا کرتے ۔۔۔۔۔

دوسری بار ریسیور اٹھایا کہ جلدی سے ارسلان کو یہ خوشخبری سنا دوں۔ کہیں میرے جیسی ڈرپوک لڑکی کے خیالات ہی نہ بدل جائیں۔ تو کم بخت فون انگیج تھا۔ اتنے دنوں سے میرے جذبات انگیج ہو رہے تھے۔ آج ان کی لائن کلیئر ہوئی تو فون کہیں اور جا لگا۔ یہ زندگی کی لائنیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ ۔۔۔۔ چلتے چلتے کہیں اور مل جاتی ہیں ۔۔۔۔

اب میرے وسوسے پھر سر اٹھانے لگے تھے اور میں ڈر رہی تھی، کہیں میرے فیصلے کے پاؤں نہ اکھڑ جائیں۔ تیسری بار جلدی سے ریسیور اٹھایا۔ ابھی تین نمبر ہی ڈائل کئے تھے کہ لائن کہیں اور مل گئی۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی گفتگو کر رہے تھے، ویسے مجھے ٹیلیفون پر لوگوں کی باتیں سننے کا شوق بالکل نہیں ہے۔ خصوصاً اس وقت جب

میں اپنے شوق کے پیروں پر سوار ہو کر محبت کے آسمان کو چھونے جا رہی تھی۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ کسی کی لایعنی باتیں سننے کی ——— ایسے میں تو بس اپنے حبیب کی والہانہ سرگوشی ہی اچھی لگتی ہے۔ پیشتر اس کے کہ میں اگلا قدم گمان کے رازونیاز کی جنت سے نکل جاتی، ایک فقرہ میرے کان میں پڑ ہی گیا ...... اور اسی فقرے نے مجھے ساری گفتگو سننے پر مجبور کر دیا۔

لڑکی روہانسی آواز میں کہہ رہی تھی

"آفتاب مجھے اس مصیبت سے نجات دلاؤ۔ ورنہ میں خودکشی کر لوں گی۔"

"ارے صاف صاف بتاؤ ———"

"واہ کئی بار بتا چکی ہوں، آخر تم انجان کیوں بنے رہتے ہو؟"

"مگر یہ سب ہوا کیسے؟" ———

"آفتاب" لڑکی غصے سے چلائی ——— "میں تمہیں ہمیشہ منع کرتی رہی، ہاتھ جوڑتی رہی۔ مگر تم ہمیشہ محبت کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھنے کے جنون میں مبتلا رہے۔ اب کہتے ہو، یہ سب کیسے ہوا ——— ؟"

اس پر لڑکے نے قہقہہ لگایا۔

"تم لڑکیاں ایک بات یاد رکھتی ہو۔"

"اور کیا تمہاری طرح بھول جائیں۔"

"ہاں ایسی باتوں کو بھول جانا چاہیئے۔"

"آفتاب تم اتنی جلدی بدل گئے ہو؟"

"کب بدلا ہوں بھئی، ایسے ہی تمہیں وہم ہو گیا ہے۔"

"وہم نہیں ہوا ہے آفتاب، پورا ایک مہینہ گزر گیا ہے۔"

"تو کیا ہوا ——— ؟"

"تم چاہتے ہو کچھ ہو جائے تب تمہیں خبر کروں۔"

"میرا مطلب ہے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

"کیا خوش ہونے کی بات ہے ——— ؟"

"بے وقوف!" وہ بولا، "کچھ کرو نا؟ ———"

"کیا کروں میں" لڑکی بے بسی سے بولی ——— "مجھے کیا پتہ کیا کرتے ہیں ...... میں کوئی ... نا کوئی ......"

پھر غالباً اسے رونا آ گیا۔

لڑکا بولا ___!
"بعض ایسے موقعوں پر بیچارے اُبال کر کھاتے ہیں۔ اور بعض بہت ڈھیٹ ہوتے ہیں...... اور نہیں تو کوئی لیڈی ڈاکٹر سہیلی بنا کے رکھتے ہیں۔"
"آفتاب، آفتاب ___ یہ تم کیا کہہ رہے ہو...... کل تک ہر ذمہ داری اپنے سر پر لینے کو تیار تھے، اور آج" ___
"ارے اب میں کون سا منکر ہو رہا ہوں"۔
"اس وقت تمہیں ہوش نہیں ہوتا۔ میری بات نہیں سنتے...... میری ہر دلیل کا مذاق اڑاتے ہو۔ اب میں مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔ تم نے کچھ نہ کیا تو میں خودکشی کر لوں گی"۔
"اچھا اچھا کچھ کرتے ہیں ___ ؟
"کب کرو گے ___ تین دفعہ پہلے فون کر چکی ہوں۔ ایک ہفتے بعد میری فلائٹ ہے..... اگر تم کچھ نہیں کرو گے تو میں زہر کھا لوں گی"۔
"توبہ ہے تم لڑکیاں کتنا ڈراتی ہو ___ دم ہی نکال دیتی ہو"....
"اور تم لڑکے کتنا مجبور کرتے ہو۔ محبت کے نام پر کتنی قسمیں کھاتے ہو۔ کیسے کیسے چکر چلاتے ہو۔ اب ایک مہینے سے میں تمہیں جگہ جگہ پیغام بھجوا رہی ہوں۔ فون کر رہی ہوں، اور تم فون پر بھی سیدھے منہ بات نہیں کر رہے"۔
"اچھا بتاؤ میں کیا کروں ___ ؟ لڑکے نے بڑے سپاٹ لہجے میں پوچھا" ______
"جو بھی کرنا ہے تمہیں ہی کرنا ہے۔ میں کیا بتاؤں ؟ اور ہاں" لڑکی جھجکتی ہوئی بولی۔ "تم نے تو کہا تھا ایسی بات ہو گئی تو فوراً مجھ سے شادی کر لو گے" ______
ہا ہا لڑکا قہقہہ لگا کر ہنسا۔
"لڑکیوں کو شادی کا بہت شوق ہوتا ہے...... ارے ابھی تو ہم نے عشق کی انتہا دیکھی نہیں اور شادی کر لیں۔ اک ذرا سی بھول کی اپنے آپ کو اتنی بڑی سزا دیں" ______
"آفتاب ___ ! شادی سزا ہوتی ہے ؟"
"ہاں ہاں ___ وہ بولا ______ محبت کرنے والوں کے لئے سزا ہوتی ہے۔
"ایک تو تمہارا محبت کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آتا" لڑکی عاجز آ کر بولی۔
"بس جیسے میں کہتا ہوں، ویسا ہی کرتی جاؤ۔ ایک دن سمجھ میں آ جائے گا۔ اس دفعہ کہاں جا رہی ہو ؟"
"بیروت ___" اس نے جیسے آنسوؤں میں جواب دیا ___
"کیا میں بھی چلوں ___ ؟" لڑکے نے پوچھا ___
"پہلے میرا کچھ کرو ______ اگر جانے سے پہلے تم نے کچھ نہ کیا، تو میں...... میں......" لڑکی

کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی .... شاید کوئی آگیا تھا، اس نے جلدی سے فون بند کر دیا۔
لڑکے نے دو تین بار ہیلو ہیلو کہا ....
پھر کہنے لگا
"مصیبت ہو جاتی ہیں یہ لڑکیاں .... اب اتنا بھی نہیں جانتیں ... باقی کام ان کا ہے۔ کم بختیں محبت کرنے نکلتی ہیں"
اس کے پاس شاید اس کا کوئی دوست بھی بیٹھا تھا۔ اسے مخاطب کر کے بولا۔
"یار! اگر اس مصیبت کا دوبارہ فون آئے تو کہہ دینا کہ میں ڈیوٹی پر چلا گیا ہوں اور بار بار فون نہ کرے ——"
ان کی لائن بند ہو گئی۔
ریسیور میرے ہاتھوں میں کانپنے لگا۔ میں نے گھبرا کر واپس رکھ دیا۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے برف ہو رہے تھے، اسی وقت فون کی گھنٹی بجی اور میں اس طرح ڈر گئی، جیسے کسی نے مجھے چوری کرتے پکڑ لیا ہو۔ ڈرتے ڈرتے چونگا اٹھایا تو دوسری طرف ارسلان تھا۔
گرجنے لگا ——
"آدھے گھنٹے سے نمبر ملانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ محترمہ نے وقت دیا تھا۔ لٹکا ہوا ہوں۔ کہیں باہر نہیں جا سکتا کوئی پروگرام نہیں بنا سکتا۔ فون کرتا ہوں تو لائن انگیج ملتی ہے۔ کیا کوئی ضروری فون فرما رہی تھیں"
"نہیں ارسلان میں نے آہستہ آہستہ سے کہا۔ اصل میں میں آدھے گھنٹے سے تمہارا نمبر ملا رہی ہوں، ادھر..."
"اچھا... اچھا...." اس ایک فقرے سے اس کا موڈ بدل گیا۔ خوشگواری کی لہر میں نے صاف محسوس کی۔ مگر وہ میرے لہجے کا خوف اور سہاہٹ بالکل محسوس نہ کر سکا، میں نے دل کو بمشکل سنبھالا اور لہجہ مضبوط کر کے کہا ——
"ارسلان تمہارا بے حد شکریہ ——"
اور جلدی سے ریسیور واپس رکھ دیا۔

منظہر الاسلام

کہانی سے باہر گرا ہوا بابا

اس وقت رات کے گیارہ بجے ہوں گے میں چوک سے پیدل مشہور بازار کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا تو دو تین قدم پیچھے ایک بابا جی چلے آ رہے تھے سفید کھدر کی دھوتی اور کرتا ڈھیلی ڈھالی پگڑی اور عام سے دیسی جوتے جو بہت زیادہ گھِس چکے تھے ـــــ معلوم نہیں بات کیسے شروع ہوئی اور ہم کیسے ایک دوسرے کے قریب آ گئے لیکن کچھ ہی دیر بعد ہم فالودہ کھانے جا رہے تھے۔ بابا کے اصرار پہ میں نے اُسے بتایا کہ میں جب بھی کسی شہر میں جاتا ہوں، دن بھر کام کرتا ہوں، دوستوں سے ملتا ہوں اور جب شام رات کا لباس پہننے کی تیاری کرتی ہے تو میرا من جوان ہوتی لڑکی کی قمیض کی طرح ادھر اُدھر سے ادھڑ جاتا ہے۔ کبھی یہاں سے کبھی وہاں سے اور میں انتظار کی سوئی میں اُس کا دھاگہ ڈال کر شہر کے چوک پہ بیٹھ کر اُسے رفو کرتا ہوں۔ بابا ہنس پڑا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا، کرتے رہو، یہ کبھی رفو نہیں ہوگا۔ جتنا رفو کرو گے اتنا ہی ادھڑتا جائے گا ـــــ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ من تو ایک شہر ہے۔

پھر بابا چُپ ہو گیا اور ہم دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ میرے جی میں آیا کہ بابا سے اس کے بارے میں کچھ پوچھوں لیکن کچھ عرصہ سے میری یہ عادت ہو گئی ہے کہ میں جب بھی کسی سے ملتا ہوں تو اس سے اُس کے بارے میں کچھ نہیں پوچھتا اور اس کتاب کی طرح انہیں پڑھنا شروع کر دیتا ہوں جس کا کوئی صفحہ اچانک سامنے کھل جاتا ہے۔ بابا اس کتاب کی طرح تھا جس کا آخری صفحہ میرے سامنے کھل گیا تھا لیکن میں نے اس سے کچھ پوچھنے کی بجائے اُسے پڑھنا شروع کر دیا۔

ہم نے فالودہ کھایا اور پھر بازار کی طرف چل پڑے۔ میں نے یہ سوچ کر کہ بابا تھک گیا ہوگا، رکشا لینے کی خواہش کا اظہار کیا۔ بابا نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ پیدل سفر کرنے کا عادی ہے اور سچا سفر وہی ہے جو پیدل چل کر طے کیا جائے

سارا بازار بند پڑا تھا صرف خوبصورت عورتوں کی خوشبو خریداری کر رہی تھی اور میری اور بابا کی کیفیت اس دکاندار جیسی تھی جو اپنی دکان بند کر کے جا رہا ہو ۔ میں نے سوچوں کے شکنجے سے نکلنے کے لئے کہا بابا ۔ دن کو یہ بازار کتنا بھرا ہوا تھا ۔ لسی سے بھرے ہوئے مٹکے کی طرح ۔ بابا بولا ہاں لگتا ہے کوئی ڈیک لگا کر ساری لسی پی گیا ہے اور اب مٹکا خالی ہو گیا ہے ۔ خالی چاٹی ہو ۔ پیالہ یا بندہ کسی کام کے نہیں ہوتے ۔ میں نے کہا ۔ شہر کے لوگ سو رہے ہوں گے ۔ بولا ۔ مگر جو مزہ جاگنے میں ہے وہ سونے میں کہاں ، اسی لئے میں بہت کم سوتا ہوں ، میرا چاچا بھی کم سوتا تھا مگر وہ اپنے دشمنوں کے خوف سے جاگتا رہتا تھا اور میں اپنے آپ کے خوف سے جاگتا رہتا ہوں ۔

واہ بابا اپنے آپ سے ڈرتے ہو ۔ میں نے کہا ۔ وہ اداس لہجے میں بولا ۔ ہاں اپنے آپ سے ڈرتا ہوں جب دن چڑھتا ہے اور شہر لوگوں سے بھر جاتا ہے تو ہجوم میں مجھے اپنے آپ سے اور زیادہ ڈر لگنے لگتا ہے لیکن جوں ہی اندھیرا دن کی دہلیز پہ قدم رکھتا ہے ۔ یہ ڈر کم ہونے لگتا ہے ۔ اور جب میں اکیلا ہو جاتا ہوں تو مجھے اپنے آپ سے بالکل ڈر نہیں لگتا ۔ میری ماں اندھیرے سے بہت ڈرتی تھی ۔ میں جب چھوٹا سا تھا تو تب بھی مجھے اندھیرے سے بالکل ڈر نہیں لگتا تھا ۔ میری ماں اندر سے کوئی چیز لانے کو کہتی تھی تو میں بغیر لالٹین کے بھاگ کر وہ چیز لے آیا کرتا تھا ۔ مگر پھر اندھیرے سے ڈرنے والی میری ماں نے سارا اندھیرا گٹھڑی میں باندھ کر اپنی قبر میں رکھ لیا اور ساری روشنی اپنی باتوں میں باندھ کر میرے لئے چھتی پہ رکھ کر چلی گئی ۔ بس اب میں ماں کی باتوں کی پنڈ اٹھائے پھرتا ہوں ۔ مجھے لگتا ہے تم بھی سفر کے شوقین ہو ۔ میں نے کہا ہاں بابا ، میرے پاؤں میں چکر ہے ، میں بھی گھومتا رہتا ہوں ، میں نے بھی تمہاری طرح ایک پنڈ اٹھا رکھی ہے مگر پتہ نہیں اس پنڈ میں کیا ہے اور میں ڈر کے مارے اسے کھولتا نہیں کہ کہیں اس میں وہ چیز نہ ہو جو میں سمجھ رہا ہوں ۔ میرے خیال میں یہ ہارے ہوئے شخص کا رویہ ہے ۔ مجھے لگتا ہے میں ہار گیا ہوں ۔ اُس سے ۔ اپنے آپ سے ۔ بابا مسکرایا ، بھلیا ہارنا تو اچھی بات ہے ۔ مجھے تو ہار کر خوشی ہوتی ہے ۔ پہلی بار میں اس وقت ہارا تھا جب میرا باپ بیمار پڑا تھا اور ایک چام چڑکی (چمگادڑ) پسار میں چکر کاٹ رہی تھی میرے باپ کے بالکل اوپر ۔ میں نے کپڑا لے کر اُسے باہر نکالنے کی کوشش کی مگر وہ باہر نہ نکلی ۔ پھر میں اس وقت ہار گیا جب میں نے پہلی بار گامے سے ہیر سُنی تھی اور مجھے پتہ چلا تھا کہ ہیر کو سید کھیڑا بیاہ کر لے گیا تھا ۔ پھر اس نے پوچھا ، تم کب کب ہارے ہو ۔ بار بار بابا ۔ کوئی ایک بار ہو تو بتاؤں ۔ پہلی بار اس وقت جب میری ماں نے میری موجودگی میں کسی سے کہا تھا اس کی انا باپ پہ گئی ہے ساری زندگی روئے گا ۔ اس وقت میں ہار گیا تھا ۔ پھر میں نے اور بابا نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا تو احساس ہوا کہ جیسے ہم دونوں ایک دوسرے سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہماری آخری ہار کون سی تھی ۔ لیکن ہم دونوں نے ہی اپنا اپنا یہ سوال ایک دوسرے کو واپس دے دیا ۔ پھر چپ لمبی ہو گئی تو میں نے کہا ۔ بابا میں تنہائی کی بھوک کاٹتا ہوں ۔ لمبی بھوک ۔ بولا ۔ یہ اچھی بات ہے

... کی بھوک کے سبب جب کوئی ملتا ہے تو — تو بس کچھ نہ پوچھو — پھر وہ چپ ہو گیا — اور ہم چپ رہ کر باتیں ... نے لگے — رات تھک گئی تھی۔ بابا کے قدم ابھی تک تر و تازہ تھے — میں نے کہا۔ اچھا بابا — اب میں چلتا ... تم نے کہاں جانا ہے میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں، بابا مسکرایا اور بولا — تم جاؤ — میں یہیں رہوں گا۔ میں تو چوکیدار ... شہر کا، اپنے آپ کا، روٹھے ہوئے یار کا، پیار کی خوشبو کا — تم جاؤ، میں نے ابھی بہت سے کام کرنے ہیں ... نے جتنا کھلا کھلا ما ہے ابھی اسے سنبھالنا ہے۔ پیر کے دربار پہ جھاڑو دینا ہے۔ لوگوں کی دن بھر کی مری ... خواہشوں کو کوڑے کے ڈرم میں پھینکنا ہے۔ تم جاؤ — میں نے اصرار کیا، مگر بابا نہ مانا اور منہ میرے کان کے قریب لاتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولا — سارا شہر ادھڑ گیا ہے۔ تمہارے من کی طرح — اب تم جاؤ۔ میں نے ... سارے شہر کو رفو کرنا ہے — اور پھر تیزی سے آگے بڑھ گیا — اور اب میں چوک پہ کھڑا سوچ رہا ہوں۔ ... اتنا بڑا شہر کیسے رفو کرے گا۔

فریدہ حفیظ

کارزار

یہ میدان جو آپ دیکھ رہے ہیں یہاں بڑی بڑی جنگیں لڑی گئیں۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ کبھی مخالف مذاہب اور اکثر ہم مذہب قومیں اس میدان میں یوں بھڑیں کہ لوگوں کا دینی بھائیوں پر سے اور باپ کا بیٹے پر سے اعتماد اٹھ گیا۔ کہتے ہیں اس سے پہلے بھی ایک زمانہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب لشکر سے لشکر نہیں لڑتا تھا۔ دونوں لشکروں کے جری ترین بہادر سورما زور آزمائی کرتے تھے۔ دونوں لڑتے تھے اور دونوں لشکر اپنے اپنے ہتھیار تھامے لڑائی دیکھتے تھے۔ لڑائی کا فیصلہ دونوں سورماؤں کی ہار جیت پر ہوتا تھا۔ اور وہی فیصلہ پوری قوم تسلیم کر لیتی تھی۔

پھر یہ بھی ہوتا تھا کہ ملکوں کے بادشاہ اور حکمران اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ ساتھ ہراول دستے میں شریک ہوتے تھے۔ سپاہی لڑتا تھا تو شاہزادہ بھی ساتھ ہوتا تھا۔ سوار کے ساتھ پیادہ بھی۔ جو حکمران جتنا عدل اور اپنی رعایا کے لئے نیک ہوتا اس کے ساتھ فوج اسی لئے جگری سے لڑتی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ اب ان لوگوں کو تم میدان دکھلانے دکھلانے ماضی کی یادوں میں کھو گئے اور وہ بھی اس اعتماد سے کہ جیسے اس دور میں پیدا ہوئے تھے۔

ہونا تم نرے جاہل ۔ اسی لئے کہتا ہوں اپنے ملک کی تاریخ پڑھا کرو تمہیں معلوم ہو کہ ہم کیا تھے اور کیا ہیں۔

ہاں مجھے معلوم ہے تم سے ہی سن سن کر یاد ہو گیا ہے۔ یہی نا کہ پہلے لوگ ۔ ۔ ۔ اپنی زمین اپنی آبرو اور اپنے ایمان کو بچانے کے لئے لڑتے تھے۔ جب تک حکمران کے پاس لڑائی کے لئے ایمان افروز وجہ نہیں ہوتی تھی اس کے لئے لڑائی میں سپاہی کا حکم نہیں تھی۔ لڑائی کی کوئی معقول وجہ ہوتی تبھی تو وہ ایسی شعلہ آفریں تقریریں کرتے کہ سپاہیوں کے رگ رگ میں جو حُب وطن کا خون ہے گردش کرنے لگتا۔ وہ تن من دھن کی بازی لگا دیتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پر ابا مجھے تو یہ سب باتیں بے کار لگتی ہیں۔ مجھے تو وہ کہانیاں اچھی لگتی ہیں جو چاندنی کی روشنی کی طرح میدانوں میں بکھری ہوتی ہیں۔ مگر نہ ہمیں یاد آتی ہیں نہ ہم انہیں دیکھ سکتے ہیں۔ چاند بادلوں میں چھپ جاتا ہے اور اندھیرے ہمارے اندر سرایت کر گئے ہیں۔ بابا مجھے تو بس ایک ہی طریقہ اچھا لگتا ہے وہی ستم ڈھانے والا۔

کہانیوں کی بات کہانیوں میں رہنے دے۔ اصل دنیا میں یہ نہیں ہو سکتا۔

اصل دنیا میں کیا ہے بابا عذابوں کا شور اور طویل تھکا دینے والے گھڑ۔ آنگنیت لمحے جو صدیوں میں بدل گئے ہیں اپنے گھونسلے پر واپسی کی طرح زخمی فاختہ دکھیے تھی بابا ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں زمین تنگ ہوتی جا رہی ہے کیا یہ نہ

ہمیں اپنے درختوں میں جگہ دیں گے ؟ بابا تو ہی تو سناتا ہے مجھے کہ وہ جس پر مہربان ہوا اس نے ان کے لئے اپنی زمین کشادہ کردی ، اور اب زمین کی تنگی کا عذاب ہے۔ یوں لگتا ہے میں قبر میں ہوں اور زمین دونوں طرف سے بڑھ کر مجھے پیس ڈالے گی۔ مگر کیوں آخر کیوں ؟ ——— ہم بے چارے لوگ کس کے دشمن ہیں۔ کون ہمارا دشمن ہے۔ جس کا جی چاہے میدان میں جائے۔ جس کو دشمن سمجھتا ہے اس کو للکارے اور لڑے۔ جو فیصلہ ہو ہمیں منظور ہے۔

وہ بدیسی ادھر ہی آرہے ہیں۔ ہٹ جا یہاں سے۔ میں انہیں اس میدان کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔

بابا ان کو ان لوگوں کے بارے میں بتا۔ وہ لوگ جو نہ جانے کہاں چلے گئے ، وہ جن کی کھوپڑیاں تو نے سنبھال کر رکھی ہیں۔ وہ جو جنگوں میں مارے گئے۔ بے چارے بے کار مارے گئے۔ شاید حرام موت . . . . . .

. . . . . لوگ آنی جانی چیز ہیں بیٹے ! اصل شے مٹی ہے ، ایمان ہے ، روایات ہیں جن کی حفاظت حاکم کرتا ہے۔

پہلے کرتا ہوگا ، اب نہیں کرتا۔ اب صرف اپنی حفاظت کرتا ہے

خاموش ، وہ آ گئے۔

بھئی واہ بہت "امپریسیو" جگہ ہے۔ دیکھنے کی حسرت تھی وہ بھی پوری ہوگئی۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا، پہلے یہاں سونے چاندی کے ڈھیر تھے۔ پھلدار درختوں کے باغات اور نہریں تھیں۔ لوگ ان کے لئے لڑتے تھے۔ اب یہاں سیال سونے کے چشمے بہتے ہیں۔ اس لڑائی کے بارود اور جلے ہوئے گوشت کی بو ابھی تک فضا میں ہے۔ دوسرے نے کہا۔

اور اب یہ پھر ایک اور منظر . . . . . . مجھے یقین نہیں آتا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔

یقین تو مجھے بھی نہیں آرہا۔ جبھی تو مجھے یہ ARRANG MENT ملی تو میں نے فوراً حامی بھر لی اور ٹکٹ کٹا کے بھاگ لیا۔

مگر یوں لگتا ہے ابھی ہمیں یہاں کافی دن ٹھہرنا پڑے گا۔ یہاں تو کسی قسم کے آثار ہی نظر نہیں آتے۔

او۔ یو آر لکی۔ زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ پڑوسی ملک کے حکمران نے بات مان لی ہے۔ دیکھو میرے ٹرانسسٹر پر خبریں آرہی ہیں۔ لوگوں نے عجب سے یہ بات سُنی ہے پورے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ جشن کی تیاریاں ہوا چاہتی ہیں۔ شاید اس ملک کے باسیوں کو یقین ہے کہ ان کا حکمران بہت طاقتور ہے۔ وہ ضرور اپنے حریف کو پچھاڑ دے گا۔

کیا . . . . ؟

پاس کھڑے باپ بیٹا یہ عجیب و غریب گفتگو سُن رہے تھے۔ ایک ساتھ ان کے منہ سے نکلا۔

ارے بابا ! آپ کو نہیں معلوم دُنیا کے اس حصے میں کتنا بڑا انقلاب آیا ہے . . . . .

کیا یہ اصلی دنیا کی بات ہے۔ کیا وہ جان گئے ہیں کہ ہزاروں انسانوں کو داؤ پر لگائے بغیر بھی . . . . یعنی رستم سہراب کا زمانہ واپس آ سکتا ہے

تیرا کیا خیال ہے کہ یہ سب کچھ آج ہی ہو جائے گا۔ کئی دن لگیں گے۔ یہ میدان خوب سجے۔ قوسِ قزح کے رنگ بکھریں ہندوستان

ناشاخیں لہرائیں۔ وہ صبح آئے جو ہمیں آگے جانے کی خبر سنائے۔

اور بابا ہم ڈوبتے سورج کو الوداع کہنے کی بجائے نئے سورج کا استقبال کرنے آئیں۔ بابا تو تو میری جیسی باتیں کرنے لگا ہے۔ یاد دیکھو روشنیاں بڑھ رہی ہیں۔ سفید گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دے رہی ہیں۔ سفید کبوتروں کا غول اور امن کی فاختہ جو یاد ہے بابا زخمی پڑ گئی تھی۔ اب اس کے باہر نکلنے کا وقت آ گیا ہے۔ بابا۔ یہ امن کی فاختہ کے لئے کھلی فضائیں جتنی اب خطرناک ہیں کبھی بھی نہیں تھیں۔ لیکن شہر دیا بابا دل کیسی گتھیاں سلجھانے میں لگا ہوا ہے۔ کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے۔ خواہشوں کے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ سکتی ہیں۔ دل بھی بدیسی اخبار نویس جی ایسا ممکن ہے؟

پھر ہم دیکھنے کے لئے آئے ہیں۔ ہم نے کتنے سورجوں کو الوداع کہا ہے۔ ہم بھی بڑے عجیب لوگ ہیں۔ ہمیں کہاں کہاں جانا پڑتا ہے۔ ندیوں جنگلوں کی قبروں کا روپ دھار لیتی ہیں۔ نیلے آسمان کے نیچے جب وہ آوازیں جنہیں سننے کے لئے ہلکے کان بے تاب ہوتے۔ تاکہ ہم ان آوازوں کو ٹیپ کر کے ان تک پہنچا سکیں جنہوں نے ہمیں یہاں بھیجا ہے اور کئی بار ایسا ہوا جب ہر طرف سناٹا تھا اور جن دنوں کی گہماگہمی کی خبریں ہم تک پہنچتی تھیں وہ بچانہ تھیں اور وہ جنہوں نے ہمیں یہاں بھیجا ہے ان کے پاس اپنے خوابوں کی تکمیل کے ہتھیار ہیں۔ جو اپنے جسموں کو ڈھانپنے کے لئے دوسروں کو برہنہ کرتے ہیں اور اپنی آنکھوں کی روشنی کے لئے دوسروں کی بینائی چھین لیتے ہیں۔

پھر...........

پھر ہمیں خیال آتا ہے کہ ہماری مسافت بے کار گئی۔ مگر ہم ایسا نہیں ہونے دیتے۔ ہم ڈراما کراتے ہیں۔ آوازوں کے پیرہن میں نگاہ کر دھاکے کرتے ہیں۔ پھر ان کے کیسٹ آوازوں کے جال پھیلانے والوں کو بھیج دیتے ہیں۔ یہ آوازیں جو سناٹوں کی فریادیں ہیں۔ جو نقطہ نقطہ ہوا کے سینے پر پھیلتے ہوئے ہر طرف محیط ہو جاتے ہیں۔

نقطہ نقطہ نقطہ............ جو لمبی مسافتیں طے کر کے پٹاخوں کو ہم انگلیوں میں سلگتے سگریٹوں کو سرولائٹ نے میں اور ہمیں انجانی خوشخبریوں کے جال میں گھیر کر لیتے ہیں۔

بیٹا میری سمجھ میں تو اس بدیسی کی باتیں نہیں آتیں

میری سمجھ میں آتی ہیں بابا —— میری طرح ہیں۔ میری طرح بولنے لگے ہیں۔ یہ بھی جو لمبی مسافتیں طے کر کے آئے ہیں۔ اور بابا وہ جو آگ کے بیوپاری ہیں وہ دیکھو بابا وہ دیکھو یہ سب کچھ امن کی فاختہ کی لمبی اڑانوں کے لئے فضاؤں کو ناگوار بدبوؤں سے پاک کرنے لئے کیا جا رہا ہے۔

پھر بابا کیوں میرا دل نہیں مانتا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ نفرت کے تیر برسانے چھوڑ دیں اور آگ اگلنے والی توپوں کی بجائے پانی پہ چلنے والی تفریح کی کشتیاں تیار کریں جو ہر کوئی خرید سکے۔ اور ایک دوسرے کے پانیوں کو چوری کرنے کی بجائے اپنے اپنے پانیوں پہ کشتیاں تفریح کے لئے آنے دیں۔

کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ زندگی کو موت سے گتھم گتھا کرنے کے اکھاڑے، ہریالے سبزہ زار ہوں۔

دیوانہ ہے میرا بیٹا۔ ابھی تیرے سامنے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ بس اب تو چند ساعتوں کی بات ہے۔

وہ دونوں میدان میں آنے ہی والے ہیں۔ بگل بجانے والے تیار ہیں۔

کیا وہ رستم و سہراب ہیں۔ وہ اپنی قربانی دے کر ہزاروں کو قتل ہونے سے بچا لیں گے۔

یہی تو دیکھنا ہے لڑکے ! دیکھو بگل بج رہا ہے۔

ہاں بگل بج رہا ہے۔ یہ جنگ کے نقارے کی آواز ہے۔ دونوں اپنے اپنے لشکروں سے نکلے ہیں بابا۔

بیٹے دیکھو! وہ اکھاڑے کی جانب بڑھ رہے ہیں اور لوگوں کو دیکھو۔ ان کے چہروں پہ تجسس نے کیسے کیسے نقشے کھینچ دیئے ہیں؟ ان کے دلوں کی دھڑکنیں بھی میری طرح ہی ہوں۔ کیسی بے بسی چھائی .... ؟

ہاں بابا بولتے رہو۔ آج میں اپنے ٹیپ ریکارڈ میں تمہاری کنٹری ریکارڈ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ڈر تھا کہیں یہاں ہی مجھ کو خود ہی نہ رہنا پڑے۔ بابا بولو۔ کہو دیکھو وہ اکھاڑے میں ایک دوسرے کے مقابل آ گئے ہیں اور کتنی عجیب بات ہے ہم ان کی ایک ایک سانس سن رہے ہیں۔ یہ آگے کیوں نہیں بڑھتے بابا۔

بڑھیں گے بیٹے: جب دو قوموں کی زندگی داؤ پہ لگی ہو تو داؤ سوچ سمجھ کر ہی لگایا جاتا ہے۔

ناممکن ہے بابا ناممکن وہ ابھی تک ایک دوسرے کے سامنے رکے ہوئے ہیں۔ بابا میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی ان کی ہمت بڑھاؤں، آ نگاؤں۔ مگر یہ یخ ہوا کیوں چلنے لگی ہے اور آسمان پر سخت بادل چھا گئے ہیں۔

شاباش تم دونوں کی کنٹری بہت زور دار ہے

اُف سردی بڑھتی جا رہی ہے۔ بابا میں تو کانپنے لگا ہوں۔

خش چپ دیکھو، ایک نے دوسرے سے کچھ کہا ہے۔ کیا کہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے

میرے پڑوسی حکمران تمہاری مجھ سے کوئی ذاتی دشمنی ہے۔ ہمارے اور ان کے درمیان کتنا فاصلہ ہے جو

میں بھی یہی سوال تم سے کرتا ہوں۔

ہم دونوں دل کے مریض ہیں اور ہوا بہت سرد چل رہی ہے۔ بارش بھی ہونے والی ہے اور یہ لوگ کہاں جائیں گے۔ سوچنے کا وقت نہیں میں نہیں جانتا بابا۔

چپ رہو۔ اب دنگل ٹوٹے گا کہیں بے بسی چھائی۔ ہاں بس وقت آ گیا ہے بچ کر نہ نکلنے پائیں۔ آگ سے کھیلو ہارنا ہولناک کشمکش میں آ گئے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ کانٹوں پر پھول نہیں اُگ سکتے۔

وہ دونوں آگے بڑھ رہے ہیں بابا بس اب دونوں وار کرنے کو ہیں۔

دونوں حکمران آگے بڑھے اور سب آنکھیں حیرت اور مسرت آمیز جذبات کے مارے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہونے کی بجائے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔

بے بسی اخبار نویس نے کنٹری کا آخری جملہ خود ادا کر کے ٹیپ ریکارڈ بند کر دیا۔

ش ۔ م ۔ اعظم

چار پھول

آج پھر ۱۴ اگست کا دن ہے وہ یادگار دن جس دن برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کی آزادی کا چمن مہک اٹھا تھا ان کی برسوں پر محیط جدوجہد نے آزادی کے رنگ سے اپنے کو رنگا تھا ان کی خواہشوں کا سورج پاکستان کے روپ میں دنیا کے افق پر اپنی تابناکیوں سمیت طلوع ہوا تھا. خداوند ذوالجلال کا عظیم اور ناقابلِ فراموش تحفہ برصغیر کے مسلمانوں کو دنیا کے کینوس پر ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی شکل میں ملا تھا ۔

دنیا کے دوسرے باسی جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں مگر برصغیر کے مسلمان بخوبی آگاہ تھے کہ اس ملک کے بنانے میں تاریخ کو انہوں نے اپنے خون سے رقم کیا تھا ان گنت قربانیوں نے اس پاک وطن کی داغ بیل ڈالی تھی، کتنے بیگناہ اور معصوم چہروں نے اپنے ہی خون میں غسل کیا اور شہیدوں کا درجہ پا گئے. شبنم کے قطروں کی طرح صاف شفاف اور پاک عصمتیں گرد آلود کر دی گئیں، نوجواں کلیاں مسل دی گئیں انہیں اپنے چمن سے جدا ہو کر پھر سے جینا نصیب نہ ہوا. ناز و نعم کے پلے لوگ خانہ بدوشوں کی زندگی گزارنے لگے. ان کا قصور اپنے لئے ایک علیحدہ وطن کا خواب دیکھنا تھا. جہاں ان کی صدیوں پرانی تہذیب، ثقافت، زبان، روایات اور ان کے جذبات و احساسات کی ترجمانی ہو سکے، جہاں ان کی اپنی حکومت ہو جہاں انصاف بغیر مانگے ملے، جہاں محبت، اخوت، بھائی چارے کے پھول کھل رہے ہوں. ان کی شاخیں آپس میں باہیں ڈالے ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کی تال پر بھائی بھائی ہونے کا اعلان کر رہی ہو ۔

دن، ہفتے، مہینے اور سال پانی کی طرح بہت جلد بڑھاپے کی نشیبی راہوں کی طرف بہہ جاتے ہیں، بوڑھے وقت کی طرح انسان بھی ان ہی راستوں پر گرتا پڑتا موت کی وادی میں جا گرتا ہے جہاں اس کی زندگی کا ڈراپ سین ہو جاتا ہے وہ سوچ کی ریل میں سوار اپنے سفر کے مختلف اسٹیشنوں سے گزرتا جا رہا تھا اس نے محسوس کیا جیسے دیمک

لگ گیا ہو. اب ریل آگے جانے کی بجائے پیچھے کی طرف سفر کر رہی تھی. وہ پھر سے واہگہ بارڈر پر کھڑا تھا جہاں پینتیس سال پہلے ہندوستان سے بے خانماں، بے حال، کسمپرسی کی حالت میں پہنچا تھا اسے جیسے کل کی بات لگ رہی ہوگی جوانی کی پھوار برسنا شروع ہو گئی تھی. اس کے جذبات پاکستان پہنچنے پر سیلاب کی مانند اس کے لبوں کے کناروں سے باہر بہنے کے لئے بے تاب نظر آ رہے تھے. اپنی ایکسائٹمنٹ وہ زیادہ دیر تک نہ چھپا سکا. گرجدار آواز میں پاکستان زندہ باد کا نعرہ اس نے لگایا لیکن اس گرج کو پچھلے کئی برس سے وہ اپنے میں اور دوسروں میں تلاش کر رہا تھا مگر وہ شاید گم ہو چکی تھی۔

جب وہ ہندوستان کے کسی شہر سے اور لاکھوں بے خانماں اور تباہ حال مسلمانوں کی طرح نفرت، تعصب لوٹ مار کی طرح آگ میں جلتا ہوا اور اپنے نہتے ہم مذہبوں پر ظلم و ستم کے جوالا پہاڑوں کو ان پر برستا دیکھ کر واہگہ چیک پوسٹ پر پہنچا تھا ننھی ننھی بوندوں کی رم جھم میں شام اپنی آمد کا اعلان کر چکی تھی اس نے اپنی آنکھوں کی پلکوں سے پاک سرزمین کو چوما. پہلی مرتبہ چاند تارے والے سبز اور سفید اسلامی پرچم کی شعاعیں اس کی آنکھوں میں ٹھنڈک انڈیل رہی تھیں اس کی فسادات کے دوران کی گئی دعائیں بارگاہِ ایزدی میں قبول ہو چکی تھیں، وہ زندہ بچ گیا تھا اور اپنی آنکھوں سے آزادی کے روشن مینار کو دیکھ رہا تھا. آزادی کے درخت میں پھل آ گیا تھا جسے برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے آنسوؤں سسکیوں اور خون کی کھاد سے پروان چڑھایا تھا پاکستانی جھنڈا امن و آشتی صلح و صفائی اور بھائی چارے کا پیغام تھا. ہمارا پاسبان ہماری پہچان تھا وہ بھی اب اپنے سر کو کھجور کے درخت کی مانند اونچا کر کے دنیا کی آزاد قوموں کے ساتھ چل سکے گا اور یہ ببانگ دہل اعلان کرے گا کہ وہ بھی آزاد وطن رکھتا ہے اس کی قومیت ہے جو پاکستانی ہے.

چیک پوسٹ پر کھڑے چاق و چوبند پاک فوجی اسے اپنے محافظ لگے. اللہ اکبر اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا. ایک آزاد فضا. نئی مملکت، نئے لوگ، نئی تہذیب، نئی سوچ، نئی زمین اور نیا آسمان. ہر چیز پرانی ہوتے ہوئے بھی اسے نئی نظر آ رہی تھی. دل خوشیوں کے جھولوں میں پینگیں لے رہا تھا. ہر طرف مسرت اور شادمانی رقص کر رہی تھی اسے یوں لگا جیسے چند لمحوں میں اسکی نظروں میں کئی صدیاں ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گئی ہوں. شہنشاہ بابر سے بہادر شاہ ظفر تک کا عہد ایسٹ انڈیا کمپنی سے پاکستان بننے کی تاریخ. وہ کتنا خوش نصیب تھا جو اپنے سامنے تاریخ بنتے دیکھ رہا تھا.

سب کچھ لٹ جانے کے بعد اور اپنے آباؤ اجداد کا شہر چھوڑنے، مالی و ذہنی انتشار کے تلاطم میں پھنسنے کے باوجود ہر کسی کے چہرے پر اطمینان کے بادل چھائے ہوئے تھے وہ تازہ کلیوں کی طرح کھلے پڑ رہے تھے. جوش و خروش کی لہروں کا سمندر ہر شخص کے چہرے پر ٹھاٹھیں مار رہا تھا ہر کوئی ولولے، ایثار اور قربانی کے جذبے سے سرشار تھا مایوسی کے اندھیروں کو روشنی اور امید کی کرنوں نے نگل لیا تھا. کوئی پچھتاوے کے آنسو نہیں بہا رہا تھا. ذاتی نفع و نقصان کی بجائے مجموعی قومی نفع کے بارے میں سوچ رہا تھا. آنے والی نسلوں کے درخشاں مستقبل کو یقینی بنانے کے لئے

قومیں قربانیاں پیش کرتی آئی ہیں اس کے ذہن نے اسے سمجھایا۔

سوچ کی لہریں اسے خیالات کی رو میں بہائے جا رہی تھیں وہ تنہا ہی پاک وطن میں وارد ہوا تھا کیونکہ اس کے والدین فسادات کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ اس کا کوئی بہن بھائی بھی نہیں تھا، دور پرے کے رشتہ دار جو محض تماشائی تھے اس وقت اسے فکر معاش کی مکڑی نے اپنے مضبوط جال میں جکڑ رکھا تھا میٹرک ہونے کے باعث اسے ایک اہم سرکاری ادارے میں ملازمت مل گئی۔ فارغ البالی کی چاندنی نے اپنی آنکھ کھولی اور غربت اور لاچارگی کے اندھیروں کو مار بھگایا اب اس کے رشتہ دار اس کے سگے تھے مگر اس سگے پن کی چادر کی اوٹ میں مکاری اور خود غرضی چھپی ہوئی تھی وہ خلوص اور اپنائیت کے میٹھے جھرنوں کی تلاش میں تھا مگر وہاں کیلا پانی رواں دواں تھا۔

نوکری کے ساتھ اس نے اپنی تعلیم بھی جاری رکھی۔ اب وہ ایم اے کر چکا تھا۔ سرکاری ادارے کی نوکری کی جگہ اس نے قوم کے بچوں کے شعور کو اجاگر کرنے کی ذمہ داری اپنے ذمہ لے لی وہ مقامی کالج کا لیکچرار تھا وہ چاہتا تو اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں شادی کر لیتا مگر اس نے مقامی گھرانے میں شادی کو ترجیح دی۔ قدرت نے اس کے گلشن میں چار پھول مہکائے۔ اب اس کا دن رات کا ورد یہ تھا کہ رب العزت اس کے بچوں کو قوم اور وطن کی خدمت کرنے کی توفیق دے

وقت کے سفید اور کالے پرندوں نے اپنی پرواز جاری رکھی، اس کے ذہین بچے اب انجینئر، فلائنگ آفیسر، میجر اور لیفٹیننٹ کمانڈر تھے۔ وہ سب قوم کی اپنی استطاعت کے مطابق خدمت کر رہے تھے وہ اب بھی خیالوں کی دنیا میں کھوئے رہتا۔ اس ملک نے اسے اتنا کچھ دیا۔ اتنا کچھ جس کا خیال متحدہ ہندوستان میں محض شیخ چلی کے خواب دیکھنے کے مترادف تھا اسے عزت ملی، نیک اولاد، خوشحال زندگی۔ اس ملک نے اس جیسے لاکھوں بے آسرا لوگوں کو سہارا دیا۔ وہ صفر سے لاکھوں اور کروڑوں میں کھیلنے لگے ان کی اپنی ملیں اور فیکٹریاں ان کے راستے میں سونا بچھانے لگیں۔ یہ سب کیا ہندو مسلمان کو دولت کی دوڑ میں اپنے سے آگے نکلنے دیتا۔ نہیں۔ بالکل نہیں، یہ ناممکن تھا۔ اس کے اندر کا آدمی جواب دیتا۔ نہیں ہرگز نہیں، اس جیسی قابلیت کا آدمی تو وہاں محض کلرکی کے تالاب میں غوطے کھا رہا ہوتا یہ سب تو اس پیارے وطن پاکستان کی مہربانیاں ہیں کہ روڑے پتھروں کو بھی پارس میں بدل ڈالا۔ سنگلاخ چٹانوں سے پھول کھل اٹھے مگر اس کا دل مرجھائے پھول کی طرح بےجان ہو جاتا ہے جب کوئی اسے پوچھ بیٹھتا:

وہ کہاں کا رہنے والا ہے پاکستان کا۔ وہ جواب دیتا، مگر سوال کرنے والا شاید اس کے جواب سے غیر مطمئن نظر آتا اور اپنی کوتاہ نظری کا تیر چلاتے ہوئے اپنا سوال پھر سے دہراتا۔

وہ پہلے سے کہاں کا رہنے والا ہے۔

وہ اس کا منہ حیرت سے تکتا رہ جاتا اس کے اندر کا آدمی جھنجھلا اٹھتا۔

جس ملک میں وہ پچھلے [illegible] برس سے رہتا چلا آ رہا ہے کیا اب بھی وہ اس کا باشندہ کہلانے کا مستحق نہیں ہوا۔

اس کی آنکھیں احساس کے موتی بکھیرنے لگتیں جب وہ دیکھتا کہ صوبائی تعصب کا جھلستا سورج ابھی تک اپنی پوری تمازت سے ہمارے چہروں کو بھسم کئے دے رہا ہے ہم ابھی تک اپنی شناخت پنجابی، پٹھان، بلوچی، سندھی کے حوالے سے کروا رہے ہیں۔ ہماری رگوں میں ابھی تک پاکستانی خون دوڑنا شروع نہیں ہوا ہم اپنی انفرادیت کا ڈھول بجانے میں زیادہ مصروف نظر آتے ہیں ہم میں قومیت اور وطنیت کے پودے نے ابھی تک اپنی جڑیں قائم نہیں کیں کب تک ایک گاڑی کے چار پہیئے مختلف سمتوں میں علیحدہ علیحدہ بھاگتے رہیں گے کب تک چھوٹے چھوٹے اختلافات کی آگ کو فسادات کے الاؤ میں تبدیل کرکے اپنی اجتماعی قوت کو راکھ بناتے رہیں گے جسے دشمن جب چاہے اپنی طاقت کی آندھی سے ہوا میں بکھیر دے۔ اس کا ذہن سوال کرتا کیا ہم ایک نہیں ہیں۔ کیا ہمارے مذہب اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں وحدانیت کا سبق نہیں دیا۔ کیا وہ تعلیم ہم نے بھلا دی کہ ہمارا معبود ایک اور قرآن ایک ہے۔ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی کے رشتے سے بندھے ہوئے ہیں۔ کیا ہم سب پاکستانی نہیں بن سکتے کیوں نہیں وہ خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتا مگر یہ سب کیسے ہوگا خالی سوچ کی وادی میں گھومتے رہنے سے تو یہ حاصل نہیں ہوگا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے وطن کو کچھ نہ کچھ ضرور لوٹائے گا جس نے اسے اتنا کچھ دیا ہے اس نے اپنے چاروں بچوں کی شادیاں ملک کے چاروں صوبوں میں طے کر دیں، شاید اس طرح وہ نفرت، علیحدگی اور تعصب کے جھگڑے کو دور کر سکے ان کی جگہ اخوت، بھائی چارے، خلوص اور یگانگت کے پودے اگا سکے جہاں پیار اور محبت کے پھولوں کی خوشبو سے پاکستان کا چمن مہکے۔ جہاں سب ایک آواز میں بے اختیار پکار اٹھیں، ہم ایک ہیں ہم سب پاکستانی ہیں۔

اب اس کے مرغزار میں پاکستان کے چاروں گلشن کی کلیاں پھول بن کر اپنی اپنی مہک اور دلکشی بکھیر رہی تھیں وہ بہت مسرور تھا اس کے رشتے داروں میں پنجابی تھے، سندھی تھے، بلوچی تھے اور پٹھان تھے۔ یہ سب اس کے عزیز تھے، بھائی تھے، اس کے اپنے تھے اب وہ سب ایک تھے، پاکستانی تھے۔

عبدالوحید

تحفہ

اس کے جوتے چلنے سے آواز پیدا کرتے تھے۔ لباس صاف ستھرا تھا اور کلائی پر گھڑی بندھی تھی۔ تین بچے ساتھ تھے۔ لیکن شاید نسیم کو بچہ نہیں کہنا چاہیئے۔ اس کی شاخوں پر پھل ابھی کچے تھے، پر اُسے نئے موسم کا احساس ہو چکا تھا اور بچے موسم کو نہیں پہچانا کرتے۔

سید احمد کے ہاتھ میں ڈبہ تھا۔ وہ ہمارے گھر تین سال بعد آئے تھے۔ نیک بخت فتح جنگ سے نئی نئی آئی تو بھی وہ ایسی ہی تھی۔ کم گو، لیکن مختی۔ جفاکش۔

ادھر اسلام آباد میں اس وقت گھر کا کام کاج کرنے کے لئے مائیوں کی کمی نہ تھی۔ کیمبل پور کے لاتعداد لوگ یہاں محنت مزدوری کرنے کے لئے آتے تو اُن کی عورتیں گھروں میں صفائی ستھرائی کا کام کرنے لگتیں۔ نیک بخت بھی ایسی ہی ایک عورت تھی۔

میں کالج میں پڑھتا تھا اور اکثر گھر سے باہر رہتا تھا۔

وہ صبح ٹھیک ۹ بجے آ کر پہلے گھر میں جھاڑو دیتی پھر فرش پر گیلے کپڑے سے پوچا پھیرتی اور آخر میں برتن دھوتی۔ میری والدہ ذرا سخت گیر واقع ہوئی تھیں۔ وہ بظاہر نیک بخت کے کام سے مطمئن تھیں لیکن شاید رسماً یا عادتاً اسے ٹوکتی رہتیں۔

میز کے نیچے کپڑا پڑا ہے۔ برتنوں میں چکنائی لگی ہے۔ وغیرہ وغیرہ

وہ چپ چاپ سنتی رہتی۔

ایک عجیب عادت میں نے اس کی نوٹ کی کہ وہ میرے کمرے کی صفائی ذرا اہتمام سے کرتی۔ مثلاً کمرے کی کتابوں اور میز پر پڑی گرد جھاڑ دیتی۔ کمرے کے جالے صاف کر دیتی اور ایک آدھ مرتبہ تو میرے گندے جوتے بھی پالش کر گئی۔ یہ سب کام اس کے فرائض میں شامل نہیں تھے۔ یوں نیک بخت اور میرے مابین ایک اَن دیکھا معاہدہ ہو گیا۔ وہ میرے کام کرتی اور میں صرف تشکر آمیز خاموشی سے اس کا شکریہ ادا کرتا۔ ہمارے درمیان کبھی بات نہیں ہوئی۔

[illegible]

ملا۔ وہ سید احمد کی دوسری بیوی تھی۔ اس کا اپنا پہلا شوہر مرچکا تھا جس سے ایک جوان لڑکا تھا میرے برابر۔ وہ اپنے باپ کے خاندان میں رہتا تھا اور ماں کی دوسری شادی سے ناخوش تھا، ہاں کبھی کبھار ملنے کے لئے آتا رہتا تھا۔ سید احمد سے بختی کے تین بچے تھے۔ سید احمد بھلا مانس انسان تھا۔ خوش طبع اور پُرمزاح۔ وہ محکمہ جنگلات میں مالی تھا اور مارگلہ کے پہاڑوں کی گھاس کاٹنے پر مامور تھا۔ بختی اعوان خاندان سے تھی اور اس کا باپ کھاتا پیتا شخص تھا۔ چونکہ والدہ کی غیر حاضری میں کھانے پینے کی تکلیف تھی۔ اس لئے ہم نے بختی سے درخواست کی کہ وہ ہمارے لئے دو روز کا کھانا اکٹھا پکا دیا کرے۔ وہ رضامند ہو گئی۔ گھر کی چابی اس کے حوالے کر دی گئی۔ میں اور آپا جی بلا وجہ اس پر اعتماد کرنے لگ گئے تھے۔

والدہ کی غیر موجودگی میں بھی ہمارے گھر کی حالت تبدیل نہیں ہوئی۔ بختی سلیقے سے ہر کام کرتی تھی۔ دوسرے سال تک وہ اور بہت سے گھروں کا کام بھی حاصل کر چکی تھی۔ اب ان کے حالات بدل رہے تھے۔

"چلو اچھا ہے! بیچارے محنت کرتے ہیں"
ایک روز باجی نے یونہی کہہ دیا۔
"ہوں! نیچ لوگ! کم بخت بے غیرت ہیں"
والدہ خدا جانے کیوں بختی کی تعریف پر ناراض ہو جاتی تھیں۔

دراصل وہ بھی ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ بختی میں ایک عادت عجیب تھی۔ وہ ہمارے گھر سے کبھی کچھ کھانے کو نہیں لیتی تھی۔ پرانے کپڑے ایک دفعہ دینے کی کوشش کی تو وہ بھی اس نے یہ کہہ کر لوٹا دیئے کہ وہ محنت کرتی ہی اس لئے ہے کہ کسی سے مانگ کر نہ کھانا پڑے اور کسی کی اترن نہ پہننی پڑے۔ وہ اپنے بچوں کو بھی گھروں کے کام کاج نہیں کرنے دیتی تھی۔ یہ عادات عام مائیوں سے مختلف تھیں اور ظاہر ہے مختلف لوگ کچھ زیادہ قابلِ قبول نہیں ہوا کرتے۔

بختی کو ڈاکٹر نواب کے گھر کا کام ملا تو اس نے بہت سے گھر چھوڑ دیئے۔ ہمارے ہاں البتہ بدستور کام کرتی رہی۔ ڈاکٹر نواب کی بیوی کالج میں لیکچرار تھی۔ اس لئے انہیں کل وقتی کام کے لئے ایک عورت درکار تھی جسے وہ معقول معاوضہ دینے پر تیار تھے۔ چنانچہ بختی انہی کو مل گئی۔

یہ اسی سال کی عید تھی جب بختی نے مجھے ۱۰ روپے عیدی دی۔ مجھے حیرت ہوئی۔ لیکن جس محبت سے وہ عیدی دینے آئی میں انکار نہ کر سکا۔ بعد میں ہمارے گھر میں طویل جھڑپ ہوئی۔ اور دوسرے روز بختی کی چھٹی کرا دی گئی۔

مجھے وہ کبھی کبھار بازار میں، سڑک پر، گلی میں مل جاتی۔ ہمیشہ کی طرح، اُسی خلوص سے گھر کا حال احوال دریافت کرتی۔ میری تعلیم کا خاص طور پر پوچھتی اور گھر آنے کی دعوت دے کر چلی جاتی۔

پھر خبر ملی کہ بخشی نے ہسپتال میں ملازمت کر لی ہے۔

ڈاکٹر نواب نے اسے چپڑاسن کی جگہ دلوادی تھی اور اپنے گھر کا سرونٹ کوارٹر بھی دے دیا تھا۔

خوشی ہوئی اور مبارک باد دینے اس کے گھر چلا گیا۔

"سرفراز صاحب! بچے سکول جانے لگے ہیں، فیس زیادہ ہے، سید احمد کی اور میری تنخواہ کم تھی۔ سوچتی

ں ہماری محنت سے بچے لکھ پڑھ تو جائیں گے آپ کی طرح۔"

وہ بڑی سمجھداری سے اپنی آئندہ زندگی کا خاکہ بنا چکی تھی اور سجاؤ سے اس میں رنگ بھر رہی تھی۔

چند روز بعد سفید شلوار اور قمیض میں ملبوس وہ مجھے سڑک پر مل گئی۔

"صاحب! مجھے آپ ہی کی تلاش تھی، ایک کام ہے"

وہ اپنے لڑکے کو سکول میں داخل کرانا چاہتی تھی۔

"آپ کہاں پڑھتے تھے؟ بس وہیں داخل کرا دیں۔"

اس نے سکون سے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

"لیکن بخشی! وہاں فیس بہت زیادہ ہے، کیا ضرورت ہے ماڈل سکول میں پڑھانے کی۔"

"ہے جی! آپ بھی تو پڑھتے تھے! آج اللہ نے کرم کیا ہے، فیس میں دے دوں گی ——" وہ

بعزم تھی۔

دوسرے روز اس کا لڑکا داخل ہو گیا۔

سید احمد اور بخشی شکر گزار بھی تھے اور خوش بھی۔ میں نے دانستہ گھر میں اس واقعہ کا ذکر

میں کیا۔

بخشی مجھے ملتی رہی۔ سید احمد وہیں تھا محکمہ جنگلات کا مالی۔

میں کالج سے نکل کر یونیورسٹی میں آ گیا۔ اُسے میرے پل پل کی خبر تھی۔ ایک روز پوچھنے لگی

"سرفراز صاحب! یونیورسٹی کی فیس کتنی ہے؟"

"کچھ زیادہ نہیں، معمولی ہے، تمہارے بچے کے سکول سے کم ہے۔"

"کتنی جماعت کے بعد داخلہ ملتا ہے جی وہاں"

میں نے تفصیل سے اسے بتایا۔ ابھی اس کے لڑکے کو یونیورسٹی آنے کے لئے تیرہ سال درکار تھے اور وہ

نا مدت انتظار کرنے کے لئے تیار تھی۔

پچھلے ہفتے میرا نتیجہ نکلا تو اسے خبر مل گئی۔ اب وہ مبارک باد دینے آئے تھے۔ بڑے اہتمام سے

شہ کی طرح اپوری وضعداری سے۔

میری والدہ نے بادلِ ناخواستہ ڈرائنگ روم میں انہیں بٹھایا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ کچھ مرعوب تھیں۔ بختی کا چہرہ چمکدار لگ رہا تھا۔ سید احمد بھی صاف ستھری شلوار قمیض میں تھا۔ بچوں کا لباس سلیقے سے سیا گیا تھا۔ سب کچھ ایک ڈھنگ سے۔

مٹھائی کا ڈبہ تھام کر والدہ نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ شاید سچے دل سے

کچھ دیر بعد سید احمد نے ایک قلم نکال کر میری طرف بڑھایا

"سرفراز صاحب! یہ میری طرف سے تحفہ ہے۔"

میں نے قلم لے لیا۔

بختی اور سید احمد کے چہروں پر میں نے ایک مطمئن مسکراہٹ دیکھی۔

والدہ چائے بنانے کے لیے اٹھیں تو بختی نے نسیم کو اشارہ کیا کہ وہ کچن میں جا کر والدہ کا ہاتھ بٹاتے۔ چائے کے دوران ہماری گفتگو زیادہ تر ان کے بچوں کی تعلیم اور ان کے خاندان میں ہونے والی تبدیلیوں پر تھی۔

رات گئے بختی نے واپسی کی اجازت لی۔ ہم لوگ انہیں گیٹ تک چھوڑنے گئے۔ میں سید احمد سے ہاتھ ملا رہا تھا جب والدہ نے بختی کے لڑکے کے ہاتھ میں پچاس کا ایک نوٹ پکڑا دیا۔ وہ حیرت سے ٹھٹھک گئی

"یہ کس لئے بیگم صاحب"

"بختی تمہارا خرچہ بہت ہو گیا ہے مٹھائی اور قلم پر، تمہارا بچہ پاس ہو گا تو انشاء اللہ ضرور کچھ دوں گی۔" والدہ نے مغرور تبسم سے اس کی طرف دیکھا۔

اندھیری گلی میں صرف ایک بلب روشن تھا۔ میں نے دیکھا بختی کا چہرہ بجھ گیا۔ نیم روشن سائے کی اوٹ میں بختی کی آنکھیں بہہ نکلیں۔

وہ چلے گئے اور میں سمٹ کر دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ میں بختی کا دیا ہوا قلم کبھی استعمال نہیں کرتا۔ اس میں سے رندھا ہوا خلوص جھانکتا ہے۔ اب شاید بختی ملے تو میں آنکھ بچا کر گزر جاؤں۔ کہیں وہ پوچھ نہ لے "تمہاری قیمت کیا ہے؟"

امجد ایوب

چُپ ہوا میں ایک خواب

زندہ لوگ آہستہ آہستہ قبر میں داخل ہو رہے ہیں!
مُردے آہستہ آہستہ قبر سے باہر نکل رہے ہیں!
سارے شہر میں اندھے بلب جل رہے ہیں ہر طرف اندھیرا پھیل چکا ہے
سیاہ بھوتنے سنگینیں لیے انسانوں کا تعاقب کر رہے ہیں قبرستان میں انسانوں کی اتنی بھیڑ ہے کہ ایک قبر میں کئی کئی انسان پناہ لینے دوڑ پڑے ہیں اور مُردے خوفزدہ ہو کر قبروں سے باہر بھاگ رہے ہیں۔
"مت بھاگو!" —— "بھائیو مت بھاگو!"
"ہم بھی انسان ہیں.....؟"
"نہیں ہم مردے ہیں"
نہیں نہیں تم جھوٹ بولتے ہو ہم انسان ہیں مردہ بھائیو! ہم سیاہ بھوتنوں سے پناہ لینے تمہارے گھر آ رہے ہیں مگر..
"ہاں ہم جلد ہی چلے جائیں گے" —— انسان سٹپٹا چکا ہے!
بھگدڑ مچی ہوئی ہے!
قبرستان مردوں سے خالی ہو چکا ہے۔ آناً فاناً سارے شہر میں مردے ہی مردے گھس آئے اور انسان....
"انسان کو کہیں دیکھا" بھوتنے نے اس سے پوچھا
"انسان؟" وہ سوال بن کر بھوتنے کے سامنے ناچنے لگا
"انسان تو گئے —— چلے گئے!
"کہاں؟" کدھر؟"
"قبرستان میں" —— "قبرستان!"
"کیا بکتے ہو؟ ہمیں بہکانے کی کوشش! پکڑو! یہ انسان لگتا ہے۔ ہمیں بہکاتا ہے"
بھوتوں کی ایک ٹولی اس کے تعاقب میں بھاگی
وہ بھاگ کر اس دیوار کے پیچھے جا کر چھپا جہاں سے میں شہر سے نکلتے ہوئے انسان کی رہائی اور مردوں کے داخلے کا منظر دیکھ رہا ہوں۔

"کون ہو تم؟" اس نے پتھرائی ہوئی نظر سنگین کی طرح مجھ پر گاڑ دی۔

"انسان" میں نے گڑبڑا کر جواب دیا

"یا پھر مردہ ہوں" مجھے متذبذب زدہ اطمینان نے گھیر لیا

"تم کون ہو" میں نے پوچھا ——— "مردہ"

"مگر تم کون ہو" اس نے سوال کا زہریلا تیر مجھ پر چلایا

"میں!" انسان ——— یا شاید مردہ!

نہیں نہیں انسان!

ہاں ہاں مردہ!

بے یقینی کسی بے قرار ابابیل کی طرح چیختی ہوئی فضا کو چیر گئی

دھماکے سے ایک قبر پھٹی اور انسان شہر کی طرف بھاگنے لگے

بھوتوں نے اپنی سنگینیں ان کی طرف اچھال دیں ——

ایک ساتھ بے شمار قبریں پھٹیں اور ان گنت انسانوں نے سنگینوں کے وار اپنے سینوں پر روک لئے۔

سنگینیں سینوں میں پھنس گئیں۔ بھتنے خالی ہاتھ کانپ اٹھے — لرز گئے

اچانک انسانوں نے سنگینیں بھوتوں پر برسا دیں۔

بھتنے آہستہ آہستہ قبروں میں گرنے لگے۔

قبریں بھرنے لگیں!

بھاگتے بھاگتے اچانک میرا پیر ایک قبر میں گھس گیا اور میں قبر میں اتر گیا۔ قبر کی تہہ غائب تھی، میں گرتا ہی چلا گیا حتیٰ کہ خلاؤں میں لٹک گیا۔

کسی نے لپک کر مجھے پکڑا اور کھینچ کر زمین کے اندر لے آیا

"تم کون ہو؟" میں نے خوف کے سمندر میں ڈبکیاں کھاتے ہوئے کہا

بائیں طرف الاؤ جل رہا ہے اور اس میں انسانوں کو پھینکا جا رہا ہے۔ دائیں طرف سے انہیں نکال کر ایک ایک لمبی قطار میں کھڑا کیا جا رہا ہے جہاں سے وہ قطار سیدھی سطح زمین تک چلی گئی ہے ——

"یہ کیا ہے؟" میں نے ہمت کر کے پوچھا

ایک اجنبی مسکراہٹ کے بعد اس نے میرے کان میں کہا

"یہ وہ آتشیں دہانہ ہے جس سے گزر کر انسان فرشتہ بن جاتا ہے!"

طنز و مزاح

سید ضمیر جعفری

ہمارا پہلا مشاعرہ

مشاعرہ، ایک تقریب، ایک پروگرام، ایک تماشے کی حیثیت سے مختلف سامعین کے ذوق اور توفیق کی چیز ہے۔ ہماری تہذیبی زندگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ کوئی اس کا کم شوقین کوئی زیادہ۔ کوئی ٹکٹ بھر کر مشاعرہ دیکھتا، سنتا ہے، کسی کی دلچسپی مفت مشاعرے تک محدود ہے

مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟

کچھ لوگ طبعاً اور بعض لوگ اصولاً مشاعرے سے کتراتے ہیں۔ مثلاً ہمارے لالہ مصری خان گمبر حالانکہ خود شاعر ہیں مگر مشاعرے کا نام سن کر خون ان کی رگوں میں جم جاتا ہے، کہا کرتے ہیں — "میں برے شعر کو تو گوارا کر لیتا ہوں مگر مشاعرے میں شعر پڑھتے وقت بعض شاعروں کی شکلوں کا مسخ ہونا میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے"

ایک نحیف و نزار مگر بڑے نامی "مشاعرہ شکار" شاعر کے بارے میں فرماتے

"جب جان کنی سے وہ اپنے مصرعوں کو اونچے سُروں میں لے جاتے ہیں، ڈر لگتا ہے کہ خود بھی کسی مصرعے کے ساتھ نہ اڑ جائیں یا دفعتاً کمر سے ٹوٹ کر نہ گر پڑیں"

موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

مشاعرے سے ہمارا ذاتی رشتہ سکول کے زمانے میں قائم ہوا اور برابر بڑھتا چلا گیا۔ عمرِ رفتہ کی طرف پلٹ کر دیکھتے (جس کی طرف ہم اکثر دیکھتے ہیں) تو نظر آتا ہے کہ ہم شاعر کم ہیں اور مشاعرہ ہم میں کچھ زیادہ ہی دخیل رہے ہیں۔ چنانچہ ہمارے بے تکلف احباب مع لالہ مصری خان گمبر ہمیں شاعر کم اور مشاعرہ زیادہ سمجھتے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک مشاعرے سے ہمارے تعلقات یک قلم کشیدہ تو نہیں ہوئے لیکن کچھ عرصے سے ہمارے ترنم کا شیرہ جس تیزی سے گاڑھا ہوتا جا رہا ہے اور الفاظ جس طرح ہمارے قابو سے باہر ہونے لگے ہیں ڈر ہے کہ سامعین کسی روز ہمیں بھی پیشۂ شاعری سے ریٹائر کر دیں گے۔ یعنی کسی روز

- "چھا لبڑا دے"
- "بچُّو کا مار اوے"

کے آوازے سننے پڑیں گے۔ مصیبت یہ ہے کہ شاعروں اور سیاست دانوں کو اکثر پتہ نہیں چلتا کہ لوگ ان کے

پیروی کر رہے ہیں یا تعاقب ــــــ! اصولاً تو مشاعرے سے ریٹائرمنٹ کا دن کسی شاعر کی زندگی کے مبارک ایام میں شامل ہونا چاہیے کہ صحیح معنوں میں دراصل اسی روز اس کی شاعری کی روح "حلقۂ جسم" (قافیہ ردیف) کے شکنجے سے باہر نکلے گی اور وہ شعر سامعین کی بجائے اپنے لئے کہنے لگے گا۔ تاہم از خود مشاعرے سے ریٹائر ہونے پر بھی طبیعت آسانی سے آمادہ نہیں ہوتی کہ آخر یہ بھی تو اظہارِ ذات کا ایک وسیلہ ہے۔ مرزا غالب بھی کہہ گئے ہیں ؎

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

مشاعروں کے ذکر پر ہمیں اپنی زندگی کا پہلا مشاعرہ یاد آ گیا ــــــ دیکھا ہوا مشاعرہ نہیں ــــــ "کیا ہوا" مشاعرہ ــــــ یہ ہمارے ہائی سکول کے عہد کی بات ہے۔ دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے ہمارے بارے میں دو باتیں زبان زدِ عام ہو چکی تھیں۔

- مشاعروں میں پاس
- امتحان میں فیل

سکول میں ان دنوں تین استاد اور آٹھ طالب علم شاعری کرتے تھے۔ میں طلباء کا ملک الشعراء تھا۔ ہمارے سکول میں ملک الشعراء کا منصب ایک باقاعدہ عہدہ تھا جو سال کے سال ہیڈ ماسٹر صاحب کی طرف سے "گزٹ" کیا جاتا تھا۔ یہ عہدہ عموماً دسویں جماعت کے طالب علم کو ملا کرتا اور صرف ایک مرتبہ ؎

یہ طور کا جلوہ ہے ہر بار نہیں ہوتا

ہماری باری آئی تو ہم تین طلباء باری باری تین تین مہینوں کے لئے ملک الشعراء بنے۔ گویا شگرمیوں کی تعطیلات میں مدرسے کی عمارت کی طرح، ملک الشعراء کا عہدہ بھی خالی پڑا رہا ــــــ تین، ملک الشعراء کی ضرورت یوں ناگزیر ہوئی کہ تینوں نے غزل کے پرچے، میں ایک جیسے نمبر حاصل کر لئے۔

سکول کی بزم ادب، کا مہینے کے مہینے ایک طرحی مشاعرہ برپا ہوا کرتا تھا۔ ملک الشعراء کو دوسرے شعراء پر یہ فوقیت تھی کہ وہ سب سے آخر میں کلام "عطا" فرماتا تھا۔ ہم تینوں میں عبدالخلیل آتش کے شعر میں معنوی چمک زیادہ تھی ــــــ میرا ترنم اچھا تھا ــــــ اور راجہ جمشید عالم عیش کی صورت اچھی تھی۔

یہ ماہوار مشاعرے بھی گو اہم تھے مگر جس مشاعرے کو ہم اپنی زندگی کا پہلا سمجھتے ہیں وہ سکول کے سالانہ جلسہ تقسیم انعامات کی تقریب میں برپا ہوا۔ ماہوار مشاعروں میں ہیڈ ماسٹر صاحب نہیں آتے تھے۔ سالانہ مشاعرے میں پہلی بار ان کا سامنا کرنا پڑا۔ مزید برآں ایک انگریز ڈپٹی کمشنر مشاعرے کی صدارت کر رہا تھا۔ اساتذہ کے علاوہ شہر کے معززین بھی آج سامعین میں موجود تھے۔ ہمیں اس بات کا اندازہ اسی مشاعرے سے ہوا کہ ہمارے چھوٹے سے قصبے میں معززین کا کتنا عظیم جم غفیر موجود تھا۔ اس جم غفیر سے تو خیر ہم مرعوب کر نپٹ لیتے مگر بجلی تو ناگاہ اس وقت گری جب ہم مطلع عرض کرنے کے لئے اٹھے اور دوسری صف میں ہمیں اپنے چچا جان اپنے مخصوص کھونڈے سمیت نظر آئے۔ نہ جانے وہ کس وقت کس راستے سے معززین میں آ گھسے تھے اور آج کیوں آ گئے تھے کہ وہ اس شغل کو بہو و لعب سمجھے۔ اگر ہم ان کو پہلے دیکھ لیتے تو بہانۂ سر درد کر کے بھاگ نکلتے۔ مگر اب تو

ہمارے لئے نہ جائے رفتن تھی نہ پائے ماندن ـــــــ چچا جان کے سامنے ہماری روح اس لئے فنا رہتی تھی کہ ہمارے والد صاحب قبلہ کی ملائمِ طبعی کے باعث ہماری سرپرستی کی باگ ڈور دراصل انہی چچا جان کے ہاتھ میں تھی اور وہ ہمارے جن مشغلے سے سب سے زیادہ "الرجک" تھے وہ کبوتر بازی کے بعد ہماری شاعری تھی۔ ہم اس جرم کی پاداش میں بارہا ان کے "گھونسے" کی شدید ضربات سہہ چکے تھے۔ ابھی پچھلے ہفتے شاعری بالخصوص غزل گوئی سے کان پکڑوا کر، توبہ کرائی تھی کہ آج پھر رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ شومئی قسمت سے ہم اس وقت غزل ہی پڑھ رہے تھے جس کے تمام اشعار ایک الھڑ دوشیزہ کے چہرے، زلفوں اور بازوؤں وغیرہ کی طرف کچھ اس جوش و خروش سے پیش قدمی کر رہے تھے کہ چچا جان کو ایک ایک شعر پر بے چینی کے عالم میں کروٹ بدلنا پڑتی تھی جیسے وہ اس لڑکی کو صاف پہچان رہے ہوں اور گویا میں شعر نہیں کہہ رہا تھا اس کی آبروریزی کر رہا تھا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کے چہرے کا رنگ بھی بے ڈھب تھا۔ وہ طلبا کی شاعری کو مناظرِ قدرت سے باہر قدم نہیں رکھنے دیتے تھے۔ ہماری شاعری میں صرف اسی شام کا ذکر آ سکتا تھا جو سورج کے غروب ہونے کے بعد آتی جاتی ہے۔ وہ شام نہیں آ سکتی تھی جو کسی حسینہ کی زلف کے کھل جانے سے حواس پر اترتی ہے۔ اس قسم کی شام بلکہ صبح اور دوپہر بھی ہمارے لئے "آؤٹ آف باؤنڈ" (OUT OF BOUNDS) تھی۔ ہم اگر کبھی غزل میں بھٹک جاتے اور اس کی بھنک ہیڈ ماسٹر صاحب کے کانوں تک پہنچ جاتی تو وہ دفتر میں بلا کر اپنے "مولا بخش" سے ہماری وہ مرمت کرتے کہ ہمیں چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا۔ ہم نے ہر چند ابھی وادیٔ عشق میں عملاً قدم نہیں رکھا تھا مگر جوانی کی دہلیز پر تو قدم رکھ چکے تھے اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس روز ہماری غزل کچھ زیادہ ہی جذبات کی سان پر چڑھ گئی تھی۔ چچا جان اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے تیور دیکھ کر ہماری نظر اور ہمارا سر ـــــــ "یک زبان" ہو کر جھکنے لگے۔ کچھ سمجھ نہ آیا کہ ہماری زبان لڑکھڑا رہی تھی یا ہماری ٹانگیں۔ سامعین کے چہرے کبھی ناگاہ پھیل کر چوڑے ہو جاتے اور کبھی پچک کر ط

جس طرح پانی کنویں کی تہہ میں تارا ہو گیا

اس نیم بے ہوشی کی حالت میں ایک مرتبہ جو ہیڈ ماسٹر صاحب اور چچا جان کے دو آتشہ چہروں پر نظر پڑی تو یوں لگا جیسے ہیڈ ماسٹر صاحب "مولا بخش" تول کر اٹھا ہی چاہتے ہیں۔ ہم اس وقت غزل کے چوتھے شعر پر تھے جس میں کسی مہوش کی زلف ہمارے شانوں پر کھلنے والی تھی ـــــــ

مگر ہم شعر کو "ادھورا" اور زلف کو ادھ کھلا چھوڑ کر بیٹھ گئے اور کئی دن گھر سے بھی روپوش رہے کہ عافیت اسی میں تھی۔

فکر تونسوی

گھر میں چور

اور پھر ایک مرتبہ یوں ہُوا۔ کہ ہمارے گردو پیش میں دھڑا دھڑ چوریاں ہونے لگیں۔ چوریاں کسی منصوبہ بندی کے تحت ہوتیں تو کسی گھر کو شکایت کا موقعہ نہ ملتا۔ ہر ایک سے مساوی سلوک ہوتا۔ مگر افراتفری میں چور اتنے کنفیوز ہوگئے کہ ایک دن جس گھر میں چوری کر جاتے، تیسرے دن پھر اسی گھر میں نقب لگانے پہنچ جاتے ——— نتیجہ یہ ہوتا کہ انہیں وہاں پھر اسی مال سے واسطہ پڑتا جسے وہ ردّی سمجھ کر چھوڑ گئے تھے۔ مثلاً ٹیگور کی گیتانجلی اور دیوانِ غالب وغیرہ۔

ہمارے محلے میں ایک صاحب تھے انہوں نے احتیاطاً اپنے مکان کے باہر گتّے کا یہ بورڈ لٹکا رکھا تھا۔

"اس گھر میں ایک بار چوری ہو چکی ہے۔ براہِ کرم اب کسی اور گھر کی طرف توجہ کریں کیونکہ

ع ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

میں نے اُن صاحب سے پوچھا "آپ نے ہندی اور انگریزی زبان میں تو بورڈ پر لکھ دیا، اُردو میں کیوں نہیں لکھا؟"

وہ بولے "اجی، اُردو 'شرفا' کی زبان ہے۔ چوروں کی زبان نہیں ہے۔ اُن کے پلّے خاک پڑتی؟"

——— بہر کیف چوروں نے شاید چوری کو بھی ڈیموکریسی سمجھا اور اس کا استحصال شروع کر دیا۔ تو یہ دیکھ کر میری واحد لاشریک بیوی نے ماتھے پر دو ہتڑ مار کر کہا "ہائے! اس گھر میں تو آ کر میرے بھاگ ہی پھوٹ گئے"۔

چونکہ یہ بیویوں کا صدیوں بوسیدہ اور فرسودہ فقرہ تھا۔ اس لئے میں نے عرض کیا۔ "محترمہ! کچھ ماڈرن لہجہ اپنایئے کچھ جدیدیت میں شاعری کیجئے، تاکہ اُسے سمجھے بغیر داد دی جا سکے۔ اور سمجھنے کا عمل آنے والی صدیوں پر چھوڑا جا سکے"۔

وہ بولی "میں نے آپ سے شادی کا مقدس رشتہ کیا ہے اور آپ ہیں کہ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں"۔

مکرر عرض کیا۔ "مذاق بالکل نہیں، شادی تو مذاق کی قبر ہے۔ اب آگے ارشاد فرمایئے"۔

"فرماؤں کیا خاک! ہر گھر میں چوریاں ہو رہی ہیں۔ مگر ہمارے نصیب میں نگوڑا ایک چور بھی نہیں"۔

وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ حالانکہ میرے جی میں آیا، کہہ دوں "ڈارلنگ! تم جو اس گھر میں موجود ہو۔ پھر چور کی کیا ضرورت ہے؟"

یہاں اطلاعاً عرض ہے کہ میری جیب کی ہر ریزگاری اکثر میری بیوی کے بہی کھاتے میں منتقل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ شادی کے وقت مقدس اگنی کے گرد پھیرے لیتے ہوئے ہم دونوں نے حلف لیا تھا کہ ایک دوسرے کا دکھ سکھ ایک دوسرے کو منتقل کرتے

رہیں گے ــــــ چنانچہ اس حلف پر ہم دونوں برابر عمل کر رہے ہیں۔ بیوی : کہ شستل کرتی رہتی ہے اور سکھ کی ڈیوٹی میرے رکھی ہے۔

مگر میں گھر کے اس جیون ساتھی چور کی بات زبان پر نہیں لا سکا۔ کیونکہ تجربے سے سیکھا تھا کہ ازدواجی زندگی ایک ہے۔ خاوند سیدھی چال چلے تو بھی خاوند کو مات اور بیوی کوئی بھی چال چلے، تو بھی خاوند کو ہی مات (یک شہ مات)

چنانچہ میں نے بیوی سے کہا "پیاری! چور کا حصول تو کوئی مشکل نہیں۔ میرے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے سوسائٹی کا آدمی ہوں۔ ابھی پولیس تھانے میں ٹیلی فون کر دوں، تو پانچ منٹ میں ایک چھوڑ، درجن بھر چور یہاں پہنچ جائیں۔ اُن کے یہاں چور کا بھاری سٹاک ہوتا ہے۔"

میرا یہ مجاہدانہ اعلان سنا، تو میری بیوی پچیس برس بعد پھر مجھ پر فدا ہو گئی۔ اور کچھ لڑکی کہ اس کا ایک بوسہ مجھ پر انگشافی سو! مگر میں نے اسے یہ کہہ کر ملتوی کر دیا کہ پہلے چور آ جائے۔ بوسہ اس کے بعد بھی اور اس کے بعد ویسے بھی ہمارے پاس سوائے بوسے باقی رہ جائے گا۔

مگر پھر میں نے سوچا کہ تھانے میں فون کرنے پر اگر چور واقعی آ گیا۔ تو ہمارے گھر میں ہے ہی کیا، جو لے جائے گا۔ الگ نادم ہوں گے، تھانے والے الگ شرمندہ کریں گے، گزشتہ دنوں ایک شاعر کے گھر چور گھس گیا تھا۔ تو اُسے وہاں بتاں ملی نہ حسینوں کے خطوط، جن کے بوتے پر وہ شاعر کو بلیک میل کر سکتا۔ چنانچہ سنا ہے، خالی ہاتھ لوٹتے ہوئے اس نے جگہ اور پھر اُس کی شاعری پر ہی ایک کڑی تنقید لکھ کر چلا گیا ــــــ حیرت ہے کہ اپنا مناسب حد سے زیادہ پڑھے لکھے بن جاتے ہیں، نقاد کیوں نہیں بنتے؟

اچانک یاد آیا کہ پڑوس میں ایک ہندی شاعر کے گھر چوری ہوئی تھی۔ چونکہ پوزیشن یہ تھا کہ آج کل ہندی میں داد کم ملتے ہیں۔ اُردو شاعری کی طرح نہیں کہ غزل سنانے کے بعد شاعر اگر پیسوں کا مطالبہ کرے تو سامعین کہتے ہیں۔ "مکرر

شاعر کہتا ہے "پیسے! پیسے!!"

جواب ملتا ہے۔ "مکرر! مکرر!"

یعنی اُردو شاعر کو پیسہ نہیں ملتا، مکرر ملتا ہے۔ اور چور، تاریخ کے اس المیہ سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس لئے اُس نے ادھر رُخ نہیں کیا۔ شاید اُس نے سُن رکھا تھا کہ میں بھی پہلے زمانے میں شاعری کیا کرتا تھا۔ اور ترک اس لئے کر دی تھی کیونکہ وہ نہیں آتی تھی یعنی کہ رفتہ رفتہ سمجھ میں نہ آنا بھی بند ہو گئی تھی۔

چنانچہ میں نے تھانے میں ٹیلی فون کرنے سے پہلے اس ہندی شاعر کو ٹیلی فون کیا اور پوچھا "ہری شانت جی! سنا ہے، دولت خانے پر چور تشریف لایا تھا۔"

وہ فخر سے بولے "ہاں، تشریف لایا تھا۔"

میں نے کہا "بڑے لکی ہو یار! اور ادھر ہم ہیں۔ کہ ابھی تک تشنہ کام پھرتے ہیں۔ اُردو میں لکھتے ہیں نا؟ ہم پہ نظر کرتا ہے نہ چور۔ میری بیوی تو اس غم میں سہاگ کی چوڑیاں توڑنے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ خدا کے لئے کچھ کرو۔ آپ کے یہاں جو چور

کیسا تھا؟"

وہ بولا۔ "ایکسی لینٹ۔"

"اس کا کوئی اتہ پتہ بتا سکتے ہو؟"

اس نے بتایا کہ میری تو اس سے ٹھیک سلیک نہیں ہوئی۔ کیونکہ میں کوئی سیلون میں گیا ہوا تھا۔ اور میری بیوی مجھے دا دینے کے لئے وہاں پہنچ گئی تھی اور بچے سکول گئے ہوئے تھے۔"

"سکول؟ کیا چور دن میں آیا تھا؟"

وہ بولا۔" جی جناب! چور اب ماڈرن ہو گئے ہیں۔ رات کو نقب نہیں لگاتے، دن دہاڑے بیش قیمت سوٹ پہن کر کار میں آتے ہیں۔ تالہ توڑتے نہیں باقاعدہ چابی لگا کر کھولتے ہیں، تا کہ چور معلوم ہی نہ ہو۔ رشتے دار یا کرائے دار معلوم ہوں۔ اور پھر سامان اٹھا کر یوں لے جاتے ہیں جیسے چوری نہ کر رہے ہوں، مکان شِفٹ (SHIFT) کر کے جا رہے ہوں"

میں نے پوچھا۔" تو آپ کا کونسا سامان شفٹ کر کے لے گئے؟"

"میرے سبھی نئے کپڑے لے گئے، پھٹے پرانے کپڑے چھوڑ گئے"

"کپڑوں کے علاوہ اور کونسی پھٹی پرانی چیز چھوڑ گئے؟"

"میری بیوی!"

یہ کہہ کر ہندی شاعر تو ہنس دیا۔ گر میں رو دیا۔ اگر اس چور نے میرے گھر کی پھٹی پرانی رشیا کے بارے میں بھی یہی رویہ اپنایا..... تو..... ؟

تنگ آ کر آخر پولیس چوکی کا نمبر ملانے لگا۔ مگر وہ مسلسل انگیج تھا۔ چوروں کی تازہ ترین ڈیمانڈ اینڈ سپلائی کے باعث تھانے کا ٹیلیفون اکثر انگیج رہنے لگا تھا ——— کہ اتنے میں اچانک تان تان سے ایک آواز آئی۔ آواز میں دہشت تھی۔ اور پھر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب میرے ڈرائنگ روم کے روشن دان سے کود کر فرش پر آ ٹپکے اور کڑک کر بولے" ہینڈز اپ!"

"میں نے پوچھا۔" جناب کا اسم شریف"

وہ بولا۔" میں چور ہوں"

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا" چور ہو؟

بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے

——— میری بیوی آپ کو بہت یاد کر رہی تھی۔"

وہ کمینہ، ہر مرد کی طرح، جیسے رال ٹپکاتے ہوئے بولا۔" کیوں، کیوں؟"

میں نے کہا۔" عرض یہ ہے کہ پڑوس کے گھر میں ریفریجریٹر آ جائے تو بیویاں حسد کے مارے جل اٹھتی ہیں کہ ہمارے گھر میں ریفریجریٹر کیوں نہیں آیا۔ اسی طرح ہمارے گرد و پیش چوریاں ہونے لگیں تو میری بیوی بھی جل اٹھی کہ ہمارے نصیب میں ایک چور بھی نہیں۔ لہٰذا جناب! آپ نے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا۔ تو بے حد شکریہ! آپ ہمارے لئے چور نہیں ہیں، ریفریجریٹر ہیں۔"

اور کیفے مرد کی ٹھکتی ہوئی آواز سے پہلے "بیریز فرنیز" ہو کر رہ گئی۔ جس پر وہ طیش میں آکر بولا "شٹ اپ" اور "بینڈز اپ" والوں نے اُسے کہنا چاہتا تھا۔ یہ آپ کا کالے منڈاسے سے بندھا ہوا چہرہ، بڑھی ہوئی داڑھی، آنکھیں بیر بہوٹی، ہاتھ میں چاقو کی دھار ——— اس سوٹزن تکلیف دہ ہوگا! یہ سب چیزیں "ہینڈز اپ" سے کیا کم ہیں؟ پھر یہ "ہینڈز اپ" کا تکلف کیوں؟ مگر میں نے یہ سب کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ کہ کہیں سالا بُرا نہ مان جائے۔ بڑی مشکل سے تو ایک چور ہاتھ آیا تھا۔ اس لئے میں نے تفریح کا سہارا لیا اور کہا۔ "جناب چور! آپ روشن دان توڑ کر کیوں اندر داخل ہوئے۔ مین گیٹ سے تشریف لاتے تو ذرا اپنے سمبندھ میں لگتے۔"

وہ تکبر سے بولا۔ "ہم چور ہوتے ہیں۔ سیدھے راستے سے داخل ہونا توہین سمجھتے ہیں۔"

میں نے داد کی تالی بجائی۔ مکمل تک منہ سے نکل گیا۔ اور میری بیوی جو چور کے آتے ہی میری پشت میں پناہ گزین ہو گئی تھی۔ میں نے اسے مبارکباد دی۔ کہ دلی تمنا پوری ہوئی، مقا نیلام کا احسان بھی نہیں اُٹھانا پڑا۔ اور چور خود بخود تشریف لایا اسے نمسکار کرو۔"

مگر بیوی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ چور کڑکا۔ "یہ کیا تالی اور نمسکار رستکار لگا رکھی ہے۔ اور یہ عورت کون ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ بے چاری ایک رفیوجی ہے۔"

وہ گرجا۔ "مذاق بند کرو۔ میں پوچھتا ہوں، تم اس کے کون ہو؟"

"میں اس کا رفیوجی کیمپ۔"

چور میں حسِ مزاح ہوتی تو میرے فقرے پر مسکرا دیتا۔

مگر وہ تنقید نگار رطا کی طرح جکھنی نکال کر بولا۔ "میرا قیمتی وقت ضائع مت کرو۔ مجھے ابھی مزید تین گھروں میں چوریاں کرنی ہیں ——— الماری کی چابیاں نکالو۔"

میں نے کہا "پہلے آپ چاقو نکالئے"

"کیوں؟"

"کیونکہ میں چاقو کی دھمکی کے بغیر چابیاں نہیں دوں گا۔ اگر لوٹنے والوں کے کچھ اصول ہیں۔ تو لُٹنے والوں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔"

اس پر چور نے آٹھ انچ لمبا چاقو نکالا۔ دُنیا میں ہر اصول چاقو سے ہی تو تسلیم ہوتا ہے،

چاقو دیکھ کر رفیوجی ایک دلدوز چیخ مار کر مجھ سے مزید چمٹ گئی۔ جس نے چاقو کی تیکھی نوک میری گردن پر رکھی، خون کی ایک بوند نکلی، کچھ یوں جیسے کوئی مصرع طرح نمودار ہوا ہو۔ میں نے اس پر فوراً بے ساختہ گرہ لگا دی۔ یعنی چابیاں اس کے حوالے کر دیں۔

وہ بولا: "الماری کہاں ہے؟"

میں نے کہا۔ "وہ نیلام گھر میں بیچ رکھی ہے، سوموار کو بولی لگے گی، جتنے روپوں پر بولی ختم ہوگی، وہ آپ کے ... ..."

"نیلام گھر کہاں ہے؟"

"میں حضور کو دکھا دوں گا، خضرِ راہ بنوں گا۔"

بیوی نے میری پیٹھ پر ٹہوکا دیا اور سرگوشی میں کہا۔ "آپ کیوں اس کے ساتھ جا کر اپنی زندگی خطرے میں ڈالتے ہیں۔ اسے اطلاعی لیٹر دے دیجئے، خود بخود چلا جائے گا۔"

اور مجھے زندگی میں پہلی بار معلوم ہوا کہ بیوی مجھے الماری سے زیادہ قیمتی سمجھتی ہے۔

مگر چور کو جیسے شبہ سا ہونے لگا کہ ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اسے ٹرخا رہے ہیں۔ چنانچہ اس مرتبہ چاقو کی نوک صنفِ نازک تک پہنچ گئی۔ اور وہ بولا۔ "کیا تمہارا یہ طلائی ہار چھین لوں، یا خود بخود میرے حوالے کر دو گی؟"

مشرقی عورتیں غیر مرد سے براہ راست خطاب کرنا خلافِ تہذیب سمجھتی ہیں لہٰذا وہ مجھ سے مخاطب ہوئی "اسے کہہ دیجئے یہ تو نقلی ہار ہے۔ اصلی ہار تو سات دن پہلے سڑک پر ایک رہزن نے چھین لیا تھا۔"

مگر معلوم ہوتا تھا کہ تہذیب کے متعلق چور کا مطالعہ میری بیوی سے زیادہ وسیع تھا۔ بولا "تمہارا طلائی گہنوں کا ڈبہ تو ہوگا، وہ کہاں ہے؟"

چور جانتا تھا کہ ہر مشرقی عورت کے پاس گہنوں کا ڈبہ ضرور ہوتا ہے اور وہ گہنے پہنتی نہیں، بیوگی تک محفوظ رکھتی ہے۔ چنانچہ تہذیبِ مشرق کا عالم ہونے کے ناطے چور نے چاقو کی نوک میری بیوی کی گردن پر قدرے زور سے دبائی تو بیوی تہذیب اگل کر باہر آ گئی اور بیوی کہنے لگی۔ "ڈبہ بینک لاکر میں ہے اور یہ ہے بینک کی رسید اور چابی۔"

اب چور کچھ زیادہ تلملا اٹھا۔ اس نے ہم دونوں کو زبردست دھکا دے کر فرش پر گرا دیا، کچھ اس زاویے سے کہ ہم دونوں جیسے ہم آغوش سے ہو گئے۔ ہم آغوشی کا یہ لطف ہمیں صرف ہنی مون میں آیا تھا۔

چور اب گھر کی اشیاء کی الٹ پلٹ میں براہ راست مصروف ہو گیا۔ اسے بیوی کے پرس سے اڑھائی روپے کی ریزگاری ملی۔ جو میری پتلون سے پرس میں اور اب پرس سے چور کی مٹھی میں منتقل ہو گئی تھی۔ کچھ پھٹے پرانے میلے کپڑے جو ہم نے سیلاب زدگان کی مدد بھیجنے کے لئے رکھ چھوڑے تھے۔ اور بھیجے اس لئے نہیں تھے کہ اس دوران ٹیکسٹائل ملوں نے نئے کپڑوں کے ریٹ اتنے زیادہ بڑھا دیئے تھے کہ ہم اب پھر پرانے کپڑے پہننے کے موڈ میں تھے۔ اور ویسے بھی ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہماری ایک تباہ حال فیملی دوسری تباہ حال فیملی کی مدد کرے۔ میرے بک شیلف کی کچھ کتابیں زمین پر بکھیر دیں، اٹھا کر اس لئے نہیں لے گیا کہ مارکیٹ میں لٹریری ردی کا بھاؤ کافی گر گیا تھا۔ اور اس ادبی خزانے سے ایک خربوزہ تک نہیں خریدا جا سکتا تھا۔

چنانچہ جب اسے کوئی بھی کام کی چیز نہیں ملی۔ تو ناکام لوٹتے وقت اس کے غضب کا پارہ چڑھ گیا اور غصے میں دروازہ کھٹاک سے بند کیا کہ دروازے کا ایک چھوٹا سا شیشہ ٹوٹ گیا۔ بیوی کا تاسف کرتے ہوئے بولی "کم بخت! خواہ مخواہ ہمارا شیشہ بھی توڑ گیا۔ اب نیا شیشہ لگوانے کے لئے پیسے کہاں سے لائیں گے؟"

چور نے شاید سن لیا۔ دروازے سے جھانک کر اڑھائی روپے کی وہی چرائی ہوئی ریزگاری میری بیوی کے منہ پہ دے ماری اور بولا۔ "لو ارے بھوکو ننگو! میری طرف سے نیا شیشہ لگوا لینا۔"

۔ غلام قادر

گاہے گاہے باز خواں

ہمارے کالج کے دنوں میں ہمارے فزکس کے پروفیسر جناب منہاج الدین مرحوم نے ایک روز بڑے پتے کی بات کی، فرمایا. کالج کے پروفیسروں کی شگفتگی اور زندہ دلی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انہیں روزانہ ہر جگہ شگفتہ چہروں اور صحت مند نقطۂ نظر رکھنے والے نوجوانوں سے واسطہ پڑتا ہے چاہے وہ فزکس کی لیبارٹری ہو یا کھیل کا میدان نوجوانوں کی طبعی خوش دلی ان کے اساتذہ کے لئے اکسیر کا کام دیتی ہے اور یہ بات تھی بھی سو فی صد درست کیونکہ ہم نے کبھی اپنے زمانہ طالب علمی میں ہاسٹل یا کلاس میں کسی کو روتے بسورتے نہیں دیکھا اور تو اور ہم نے کالج کے قبرستان میں تدفین و تکفین کے غمناک مواقع پر بھی اکثر دبے دبے قہقہوں کی آوازیں سنیں اور بعض دفعہ قبرستان کو کشتِ زعفران بنایا۔

چند روز پیشتر ہمارے پاس اسلامیہ کالج پشاور کے چند طلبہ آئے، کہنے لگے فلاں تاریخ کو ہماری سالانہ الوداعی تقریب ہے ہم نے اسلامیہ کالج کے بارے میں آپ کے مضامین پڑھے ہیں آپ ازراہِ کرم ہماری تقریب میں ضرور تشریف لائیے ہم ان روشن ضمیر نوجوانوں کے ہشاش بشاش اور پُر رونق چہروں کو دیکھ کر اپنے وقتی رنج و آلام بھول گئے۔ ہم نے کہا چشمِ ما روشن دلِ ما شاد ہماری اس سے بڑھ کر اور کیا خوش قسمتی ہو گی کہ ہم اپنے دیرینہ کالج جا کر پرانی یادیں تازہ کریں۔ اس وقت ہمارے ادارے میں کوئی تقریب برپا تھی ہم نے گھنٹی بجا کر مہمان طلبہ کی پھل فروٹ اور کیک سموسوں سے خوب خاطر تواضع کی. طلبہ سراپا نیاز بن کر شاداں و فرحاں اپنے کالج لوٹے اور ہم سے مکرر تقریب میں آنے کا وعدہ لیا۔

عثمانیہ ہاسٹل کی سالانہ تقریب کیا تھی رنگ و نغمہ کی ایک پُر بہار محفل سجی تھی. ہاسٹل کے صدر دروازے سے مہمانوں کی نشستوں تک ہنستے مسکراتے رضاکاروں کی دو رویہ قطاریں لگی تھیں، ہم جونہی پاپیادہ ہاسٹل کے گیٹ کے پاس پہنچے، چند طلبہ نے ہمیں پہچان لیا اور ہماری پذیرائی اس خلوص اور محبت سے کی کہ باید و شاید...... نشستوں کے قریب پہنچے تو ۱۵۰ قمیض، شلوار میں ملبوس طلبہ نے کھڑے ہو کر ہمیں خوش آمدید کہا۔

عثمانیہ ہاسٹل کو اس موقع پر دلہن کی طرح سجایا گیا تھا اور جگ مگ جگ مگ کرتے چمن و روش اور در و دیوار کو دیکھ کر یہی گمان ہوتا تھا گویا ہر طرف روشنیوں کا سیلاب اُمڈ آیا ہو۔

اپنی نشست پر براجمان ہوئے تو ہمیں پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ ان عزیز طلبہ نے بغیر ہم سے دریافت فرمائے ہمیں اس پُر وقار شام کا "مہمان مقرر" قرار دے دیا ہے اور پُر تکلف عشائیے کے بعد اب ہمیں تقریر سے مفر نہیں رفتہ رفتہ دیگر مہمانانِ گرامی بھی تشریف لے آئے جن میں اسلامیہ کالج کے فاضل پرنسپل صاحب کے علاوہ کئی دیگر معزز اساتذہ بھی شامل تھے ہم نے محفل کے عمومی موڈ سے اندازہ لگایا کہ ماحول انتہائی دوستانہ اور خوشگوار ہے اور ہمارے لئے مناسب یہی ہوگا کہ ہم طلبہ سے ہلکی پھلکی باتیں کر کے اپنی عمرِ رفتہ کو آواز دیں۔

تلاوت کلام پاک کے بعد تقاریر کا آغاز ہوا تو طلبہ کی ہر فی البدیہہ اور شگفتہ تقریر کے ساتھ ہمارا خون بڑھنا شروع ہوا ہم اُلٹی زقند لگا کر کئی برس پہلے کے سنہرے دور میں داخل ہوئے جب ہم عثمانیہ ہاسٹل کے کمرہ نمبر ۶۲ میں اپنے دیگر تین ساتھیوں عثمان، حمید اور ارشاد کے ساتھ غمِ دوراں سے یکسر بے نیاز بے باکانہ مقیم تھے اور ابھی ہم میں سے کسی نے بھی غمِ جاناں کا روگ نہ پالا تھا۔ آہ! کیا بے فکری کے شب و روز تھے اور کیا مسرت و شادمانی کا بابرکت دور۔ بقول شاعر

..... ربط تھا زندگی کے قصّے میں!

سالِ اوّل، عالمِ بالا (ہاسٹل کی بالائی منزل) میں گزارنے کے بعد ہم سال دوم کے لئے زمین (گراؤنڈ فلور) پہ اُتر آئے تو ہاسٹل کے منتظمین نے ہمیں کچھ بکل (الگ کمرہ) عنایت فرما کر گویا سینیئر طالب علم کے طور پر ہماری حیثیت تسلیم کر لی۔

عثمانیہ ہاسٹل کی اس تقریب سے ایک روز پہلے ہم نے کراچی کے ایک مہمان کے ساتھ اپنے ہاسٹل کا چکر لگایا تو ہمیں اپنے کمرہ نمبر ۶۲ کے دروازوں پر حسین و جمیل فلمی اداکاراؤں کی تصویریں دیکھ کر خوشگوار تعجب ہوا اور حسنِ اتفاق ملاحظہ ہو کہ جو دروازہ ہماری نشست کے بالمقابل کھلتا تھا اس کے شیشوں پر ہماری محبوب اور پسندیدہ فلم سٹار کی خوبصورت تصویر چسپاں تھی۔ اس وقت ہمیں سر ونسٹن چرچل کا وہ لطیفہ یاد آگیا جبکہ وہ کالج کے زمانے کی یادیں تازہ کرنے کے لئے اپنے کالج کے ہاسٹل گئے اور کمرے کی ایک ایک چیز کو بہ نظرِ غائر دیکھنے کے بعد خوش ہو کر فرمایا "وہی کمرہ، وہی آرائش و زیبائش، وہی مانوس خوشبو، تب سے اب تک یہاں کے ماحول میں کوئی بھی تبدیلی نہیں آئی۔ کمرے کا پلنگ بھی اپنی جگہ بدستور موجود ہے اور کپڑوں کی الماری بھی۔ حتیٰ کہ (غسل خانے کا دروازہ ذرا سا کھول کر) اس دروازے کے پیچھے ایک سمٹی سمٹائی اور سہمی ہوئی "کزن" بھی اسی طرح موجود ہے جیسے کہ ہمارے زمانے میں ہوا کرتی تھی!

عثمانیہ ہاسٹل کے جونیئر طلبہ کی تقریریں اس بات کی غمازی کرتی تھیں کہ ان طلبہ نے سینیئر طلبہ کو بحیثیت "دوست، رہنما و فلسفی" تسلیم کر لیا تھا اور اب ان میں ابتدائی ایام کی تلخی کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔ چنانچہ جب ایک کمسن طالب علم نے ہاسٹل کے بزرگ طلبہ کی بے پایاں شفقت و مروت اور ہر مشکل وقت میں ان کے ہمدردانہ رویّے کی کچھ ضرورت سے زیادہ

تعریف کی تو سینیئر طلبہ نے اپنے آپ کو اس اعزاز کا مستحق نہ سمجھتے ہوئے اس برخوردار کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا مگر وہ اپنی منصفانہ رائے پر بدستور قائم رہے اور روایتی دریا دلی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے بزرگوں کے احسانات کو بار بار دہرایا اور دعا کی کہ یہ حضرات "جہاں بھی رہیں خوش رہیں"۔ سینیئر طلبہ نے ان کی اس خلوص بھری دعا پر باجماعت آمین کہا اور جوابی تقاریر میں احسان کا بدلہ احسان سے دیتے ہوئے انہیں کالج اور ہاسٹل میں کامیاب زندگی گزارنے کے چند آزمودہ نسخے مرحمت فرمانے کا وعدہ کیا۔

سینیئر طلبہ نے ہاسٹل سے رخصت ہوتے وقت حسبِ معمول کالج اور ہاسٹل کی انتظامیہ سے خوشگوار موڈ میں چند گلے شکوے بھی کئے مثلاً ایک طالب علم نے یہ حیرت انگیز گلہ کیا کہ جب کبھی وہ ٹائلٹ کا رخ کرتے ہیں کھانستے کھانستے ان کا برا حال ہو جاتا ہے اور واپسی پر وہ اس قابل نہیں رہتے کہ کسی سے بات کر سکیں۔ اس اجمال کی تفصیل بتاتے ہوئے انہوں نے خوش دلی سے وضاحت کی، حضرات! اب آپ لوگوں سے کیا پردہ۔ ہمارے ٹائلٹ کی اندرونی کنڈی عرصہ دراز سے مرمت طلب ہے میں بوقتِ ضرورت ایک ہاتھ سے ٹائلٹ کے دروازے کو تھامے رکھتا ہوں اور دوسرے ہاتھ سے بمشکل تمام کارِ دیگر میں مشغول رہتا ہوں۔ اس دوران ساتھ ساتھ کھانستے رہنے کا مشغلہ بھی مستقل جاری رہتا ہے تاکہ باہر سے آنے والے ضرورت مند حضرات بے جا دخل اندازی سے باز رہیں۔۔۔۔ انہی صاحب نے پُر درد لہجے میں ہاسٹل کے کولروں کو بھی شکایت کی کہ گرمی میں ان کا پانی گرم اور صرف سردی میں ان کا پانی سرد ہوتا ہے۔۔ ۔۔۔۔۔ وغیرہ۔

اپنی جوابی تقریر میں کالج کے گرامی قدر پرنسپل اور مہمانِ خصوصی نے طلبہ کی ہر شکایت کا شافی جواب دیا۔ انہوں نے فرمایا، مجھے تو یہاں آنے سے پہلے بتا دیا گیا تھا کہ عزیز طلبہ کی تمام شکایتیں خوش اسلوبی سے رفع کی جا چکی ہیں اور ہاسٹل میں نئے فرنیچر اور برتنوں کا بھی خاطر خواہ انتظام کر دیا گیا ہے بہر کیف جہاں تک کولروں کے تسلی بخش کام نہ کرنے کا تعلق ہے آپ حضرات (بشمول میاں صاحب) مجھ سے اس بات سے اتفاق کریں گے کہ یہ کولر موجد نے اس لئے نہیں بنائے کہ لوگ چوبیس گھنٹے ان سے بالٹیاں بھر بھر کر ٹھنڈا پانی حاصل کرنے کی کوشش کریں، آخر ہر چیز کی کارکردگی کی کوئی نہ کوئی حد ہوتی ہے اس لئے ہمیں ان کولروں کے بارے میں زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں!

جناب پرنسپل کی فاضلانہ تقریر سے پہلے ہمیں تقریر کی دعوت دی گئی تو ہم نے سر ونسٹن چرچل والا لطیفہ ذرا قابلِ قبول الفاظ اور دھیمے سروں میں لڑکوں کے سامنے دہرایا اور انہیں مبارکباد دی کہ انہیں ریڈیو بآوازِ بلند بجانے اور کمروں میں حسینانِ عالم کی تصویریں سجانے کی کھلم کھلا اجازت ہے۔ ہم نے انہیں یاد دلایا کہ ان کے کالج کی بنیاد ۱۹۱۳ء میں پڑی اور یہاں بجلی جیسی نعمتِ عظمٰی ۱۹۳۱ء میں پہنچی گویا ۱۹۳۱ء سے پہلے کے اٹھارہ سالوں میں یہاں کے طلبہ نے لالٹین کی روشنی میں عرق ریزی کی۔ خود ہمارے زریں دور میں (جو آزادی سے دو سال پہلے اور دو سال بعد پر مشتمل ہے) ع

ہاسٹل کے کمروں میں بجلی کے پنکھے تک ناپید تھے۔ اگرچہ ہاسٹل کی بنیاد تیرہ سال پہلے ۱۹۳۲ء میں پڑ چکی تھی اور اس میں صرف فرسٹ ڈویژنروں کو داخلہ ملتا تھا۔ جہاں تک ٹیلی ویژن اور ٹرانزسٹر ریڈیو کا تعلق تھا یہ چیزیں ان دنوں کسی کے خواب وخیال میں بھی نہ تھیں۔ لے دے کے ہاسٹل کے ڈائننگ ہال میں ایک دیوہیکل قسم کا ریڈیو سیٹ نصب تھا وہ بھی غالباً کسی مخیر ادارے کا عطا کیا ہوا تھا۔ اس ریڈیو سیٹ سے آزادی سے دو سال پہلے اور دو سال بعد کے دور کی کیسی کیسی تاریخ ساز خبریں نشر ہوئیں اور ان دنوں کیسے کیسے مشاہیر اسلامیہ کالج پشاور تشریف لائے۔

ڈائننگ ہال کے اس تاریخی ریڈیو کے علاوہ ایک ریڈیو سیٹ ہاسٹل میں اور تھا جو خیبر یونین کے صاحب صدر کی تحویل میں تھا مگر اس سیٹ کے استعمال کے بھی مقررہ آداب تھے۔ ہم جب کبھی "سائن آواز" کے بعد فرمائشی پروگرام سننے "صدارتی لاج" جاتے تمام بتیاں گل کر کے دھیمی آواز سے ریڈیو سنتے تاکہ اردگرد کے طلبہ کی پڑھائی اور خود صاحب صدر کے آرام میں ہم لوگ مخل نہ ہوں۔ اس کے برعکس عثمانیہ ہاسٹل کے آج کے مکین کس قدر بلند بخت اور خوش قسمت ہیں کہ انہوں نے اس تقریب کے لئے خوش نما روشنیوں کے ساتھ ساتھ بہترین ملکی اور غیر ملکی موسیقی کا اہتمام کیا ہے اور ان پر ہماری طرح دھیمے سروں میں موسیقی سننے کی کوئی قدغن نہیں۔

ہم نے اپنی ہلکی پھلکی تقریر میں وہی باتیں دہرائیں جو کالج کے اولڈ بوائز بھی محفلوں میں اکثر دہراتے نہیں تھکتے اور ان پرانی باتوں کے دہرانے سے ہر بار انہیں قند مکرر کا سا مزہ ملتا ہے۔ مثلاً یہی کہ ایک روز روس کیپل ہال کے سٹیج پر ہمارے انگریز پرنسپل میجر براڈرٹن نے "اتھیلو" پڑھاتے پڑھاتے اپنے پیٹ میں خنجر گھونپ کر خودکشی کر لی اور سٹیج پر ڈھیر ہو کر ہال میں موجود تمام طلبہ کو ناگہانی مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ دراصل میجر براڈرٹن فوج میں جانے سے پہلے برطانیہ کے کسی تھیٹر میں اداکارہ چکے تھے۔ انہوں نے طلبہ سے استفسار کیا کہ اتھیلو نے آپ لوگوں کے خیال میں خودکشی کے لئے کون سا آلہ استعمال کیا ہوگا، جب طلبہ نے بے خیالی میں بغیر سوچے سمجھے، جواب دیا کہ خودکشی کے لئے تلوار ہی موزوں چیز ہو سکتی تھی تو میجر صاحب نے اس جواب کو مسترد کرتے ہوئے تلوار کی لمبائی کے سبب اسے ناقابل عمل قرار دیا اور خنجر کی افادیت کو واضح کرتے ہوئے ہوا میں اچانک دونوں ہاتھ لہرائے اور ایک فرضی خنجر پیٹ میں گھونپ کر "خودکشی" کر لی!

ہم نے اپنے عزیز طلبہ کو یہ بھی بتایا کہ ہمارے فاضل استاد چوہدری سردار احمد ہمیں اردو بزبان انگریزی پڑھایا کرتے تھے اور اسلامیہ کالج کے نامور استاد اور خوش گو شاعر پروفیسر محمد موسے خان کلیم ہمیں انگریزی بزبان اردو پڑھایا کرتے تھے اور یوں طلبہ میں تقابلی مطالعے کے سبب دونوں زبانوں کا صحیح ذوق پیدا ہوا۔ ہم نے اپنے سامعین کو یہ بھی یاد دلایا کہ کس طرح اسلامیہ کالج کے قابل احترام استاد قاضی نورالحق صاحب ندوی المعروف بہ ڈین صاحب جیب میں صرف پانچ روپے کا نوٹ ڈال کر سفر پہ روانہ ہوئے، چلتے چلتے مصر پہنچے۔ الازہر شریف میں کئی برس زیر تعلیم رہے۔ ایک مصری خاتون سے شادی کی اور وہی پانچ روپے کا نوٹ جیب میں ڈالے واپس گھر تشریف

لائے! گویا بقول شاعر۔ اولوالعزمی کے لئے کوئی سدِ راہ نہیں!

ہم نے اسلامیہ کالج کی ایک دلچسپ تقریب کا ذکر کیا جو "اولڈ بوائز ڈے" پر ہوا کرتی تھی اور جس میں اس علیم دارالعلوم کے پرانے لڑکے ایک مرتبہ پھر اپنی پرانی یادیں تازہ کرتے تھے تقریب کے روز ہر ہاسٹل کی صفائی ستھرائی کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ روشیں صاف کی جا رہی ہیں۔ اینٹوں کو نئے سرے سے چونا لگایا جا رہا ہے سڑکوں پر چھڑکاؤ کیا جا رہا ہے غرض ہر طرف جشن کا سا سماں ہے صبح کے وقت خیبر یونین ہال میں "لڑکے" جمع ہو کر مذاکرات میں مصروف ہیں دوپہر کو اپنے پرانے ہاسٹلوں میں حاضری دے کر دوپہر کا کھانا نئے لڑکوں کے ساتھ کھایا جا رہا ہے۔ سہ پہر کو ایک اعلیٰ مشاعرے کا اہتمام ہے جس میں نئے شاعر پرانے شاعروں کے کان کترتے نظر آتے ہیں۔ یہ دلچسپ اور یادگار محفل ختم ہوتی ہے تو نبرد آزمائی کا دور شروع ہوتا ہے۔ نئے اور پرانے لڑکوں کی دو ٹیمیں رسہ کشی کے لئے میدان میں اترتی ہیں۔ فٹ بال کا انوکھا میچ کھیلا جاتا ہے جس میں اولڈ بوائز کسی باقاعدہ قانون کے پابند نہیں۔ ریفری اولڈ بوائز کو جتانے کے لئے تمام حربے استعمال کرتا ہے کیونکہ وہ بھی خیر سے اولڈ بوائے ہے اس کے باوجود نئے لڑکے میچ جیت جاتے ہیں ؏

کہ سربسجدہ ہیں قوت کے سامنے اشجار!

خواجہ عطا اللہ کالج میں عربی کے پروفیسر تھے، آپ انہیں راستے میں آتے جاتے کبھی سلام کریں تو ان کا جواب اس قدر طولانی ہوتا تھا کہ اسے سننے کے لئے عمرِ خضر کی ضرورت تھی خواجہ صاحب موسم کے تقاضوں کے پیش نظر ایک پتلون پر دوسری پتلون پہننے کے عادی تھے اور ان کی سفید پتلون کے پائنچوں کو اوپر کی پتلون کے نیچے سے جھلکتے ہوئے دیکھ کر ہمیں معاً اس دوست کا یہ فقرہ یاد آتا تھا کہ لکھنؤ میں شدت کی سردی ایک لحاف کی سردی یا دو لحاف کی سردی کہہ کر بیان کی جاتی ہے جناب خواجہ صاحب کا بھی کچھ یہی حال تھا یعنی کبھی ایک پتلون کی سردی اور کبھی دو پتلون کی سردی!

ہمارے کالج کے دوستوں میں سے ایک صاحب ایسے تھے جن کا ذوق سب سے نرالا تھا۔ دن میں یہ حضرت تن پرور (باڈی بلڈنگ) میں مصروف رہتے مگر علی الصباح جب چاروں طرف مؤذن کی صدا گونج رہی ہوتی اور ہاسٹلوں کے لڑکے کالج کی خوبصورت مسجد کی طرف جا رہے ہوتے ان حضرت کے کمرے سے چھن چھن کر روشنی آ رہی ہوتی اور ہاسٹل کی فضا میں دھیرے دھیرے بنگلہ ملک کا کوئی نغمہ تیر رہا ہوتا۔

؎ جب چاند میرا نکلا چھائی تھیں گھٹائیں!

پروفیسر بشیر الدین صاحب سے ہمیں ہمیشہ یہ گلہ رہا کہ انہوں نے ہفتہ وار روم انسپکشن کے موقع پر پہلے تو کہا کہ تمہارے کمرے میں آکر تمہارے نفیس بستر پر لوٹ جانے کو جی چاہتا ہے اور پھر روایتی تحمل سے کام لے کر فرمایا (چار نمبروں میں سے) تھری اینڈ تھری کوارٹرز!

اسلامیہ کالج کی داستان ایک دفعہ چھڑ جائے تو اسے آسانی سے ختم کرنا کسی اولڈ بوائے کے بس کی

نہیں تاہم ہم نے جناب شفیق الرحمٰن کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے کہ

LEAVE WHEN THE GOING IS GOOD

بادلِ نخواستہ اپنی "تقریر دلپذیر" کو اختتام تک پہنچایا اور طلبہ سے رخصت ہو کر اپنے ایک مشفق استاد کی کار میں گئی رات گھر پہنچے۔ آہ! بقول حضرت نادر کاکوری۔

اکثر شبِ تنہائی میں
کچھ دیر پہلے نیند سے
گزری ہوئی دلچسپیاں
بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمعِ زندگی
اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دلِ صد چاک پر!

مجیب الرحمٰن

سفر خوشگوار

خدا جانے کیوں آجکل ہوائی جہاز میں داخل ہوتے ہی زمانہ جاہلیت یاد آجاتا ہے۔ کیا کیا تواضع ہوتی تھی مسافروں کی۔ سو روپے کا ٹکٹ لیکن صاحب کیا بڑے افسر اور کیا عملہ سبھی بچھے جاتے تھے۔ فضائی میزبان خواتین کے چہرے بشاشی اور اس بات پر چمک رہے ہوتے تھے کہ ہم انہیں خدمت کا موقع دینے والے ہیں۔ بیٹھتے ہی گرم تولیہ حاضر۔ ہاتھ منہ دھو کر بلکہ نہا کر چلے ہیں لیکن ایسی خوشبودار اور خوشگوار لذت سے کیسے انکار ہو سکتا تھا۔ پھر ٹافی لیجیے یا سونف کا پیکٹ۔ ارادہ نہ بھی ہو تو اصرار اور مسکراہٹ کے ساتھ پیش کی جانے والی شیرینی تو شیریں تر ہو جاتی تھی۔ خاص کر ہم جیسے درویش منش انسان کے لیے جو کسی بھی حسین خاتون کے ہاتھ سے چائے لیتے وقت "چینی کتنی" کا جواب یہی دینا چاہتا ہو کہ

"آپ صرف پیالی میں انگلی ڈبو دیں چینی کی ضرورت ہی نہ رہے گی" خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اس زمانے میں ٹافیاں وغیرہ کی ضرورت کے ضمن میں یہ کہا جاتا تھا کہ ہوائی جہاز کی پرواز کے دوران بلند ہوتے یا اترتے وقت ہوا کے دباؤ میں فرق کے باعث منہ چلاتے رہنا ضروری ہوتا ہے (اب نہیں رہا) پھر بھاگ بھاگ کر جوس تقسیم ہوتا تھا اور وقت اور موسم کی مناسبت سے پرتکلف چائے اور کھانا حاضر۔ اترنے سے پہلے پھر چاپ دیتا خوشبو میں بسا ہوا تولیہ اور جہاز کے دروازہ پر پورا عملہ الوداعی ملاقات کے لیے صف بستہ بیبیاں کے مسکراتے لبوں پر شیریں تر خدا حافظ کے الفاظ... جی چاہتا تھا گھر جانے کی بجائے پھر ٹکٹ لے کر اسی جہاز میں واپس ہو جائیں۔

اب تو جہاز میں بیٹھتے ہی گننا شروع کر دیتے ہیں کہ سو کی بجائے ہزار روپیہ کرایہ دے کر کس کس چیز سے محروم رہے ہیں۔ چنانچہ ایک کے بعد ایک چیز یاد آتی چلی جاتی ہے اور اس گنتی میں جو منہ چلنا شروع ہوتا ہے تو پھر نہ ٹافی اور سونف کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے نہ ہی میزبانی کے دیگر تقاضوں کی۔ ہم تو ویسے ہی ٹھہرے معتدل مزاج۔ اوپر کے طبقات میں جاتے جاتے خود ہی طبیعت کو سکون ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ زمین پر صورت حال کیسی ہی ناگوار محسوس ہو ۳۰ ہزار فٹ کی بلندی پر ہموار پرواز کے دوران ہم سے زیادہ پُرسکون۔ مطمئن اور قانع مہمان ہوائی کمپنیوں کو آجکل ملنا ممکن نہیں۔

تو صاحبو۔ ان بدلے ہوئے حالات میں کویت کا دورہ پڑا تو پہلا مرحلہ راولپنڈی سے کراچی تک تھا۔

اسی کے ضمن میں ــ سیڑھی سے جہاز کے اندر قدم رکھتے ہی دروازہ کے اندر کھڑی ہوئی میزبان خواتین کو دیکھ کر دل دھک سے رہ گیا۔ خدانخواستہ کوئی ناخوشگوار حادثہ ہو گیا ہے۔ اداس چہرے اور اداس [illegible] سے اس کے علاوہ اور کیا تاثر پیدا ہو سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پہلے والی خوش اندام۔ صحت مند خواتین متبسم انداز میں سب مسافروں کو فرداً فرداً خوش آمدید کہتی تھیں اب ہوائی کمپنی میں نایاب ہیں۔ سنا ہے ان خوش والی خواتین کی بھرتی کئی سال سے بند ہے۔ آجکل جو دبی دبی سی اکتائی ہوئی سوگوار مسکراہٹ رائج ہے وہ نہ صرف عام بیزاری کی کیفیت کو چھپانے میں ناکام رہتی ہے بلکہ مسافروں پر جو تاثر پیدا کرتی ہے وہ بھی واضح ہے۔ اس کے علاوہ پہلے تو دروازہ سے آگے قدم رکھتے ہی عملہ کے دوسرے ارکان ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے کہ نشستوں کی سمت رہنمائی کر سکیں، آجکل مگر یہ کارکنان نشستوں کے درمیان بے نیازی سے کھڑے باہم مکالمہ میں مصروف رہتے ہیں تاکہ مسافر از خود اپنی نشست تلاش کرنے کا حق استعمال کر سکیں۔ سو ہم بھی اس حق خود اختیاری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نشست نمبر D-12 تک آسانی سے پہنچ گئے۔ آسانی اس لیے کہ دو ماہ قبل بھی کراچی تک کے سفر میں ہمارا قرعہ فال اسی نشست کے لیے نکلا تھا۔ اس وقت اس نشست کی کرسی کل اس انداز سے خراب تھی کہ ذرا سا ٹیک لگانے کی صورت میں بیٹھنے والے سمیت پیچھے والے مسافر کی گود میں گر جاتی تھی۔ چنانچہ پورا سفر بے حد شعوری طور پر اکڑوں بیٹھ کر کاٹنا پڑا تھا۔ بڑی وجہ اس احتیاط کی پیچھے والے مسافر کے زوردار جوابی دھکوں کا خوف تھا۔ کیوں کہ ان صاحب نے تو تین ہی جھٹکوں میں آنے والے دور کی تصویر واضح طور پر سمجھا دی تھی۔

نشست پر بیٹھتے ہی مزاج پرسی کے طور پر ذرا سا ٹیک لگایا لیکن پورے طور پر مطمئن ہونے سے پہلے ہی پیچھے والے ہمسائے نے جو خاصا ہوشیار بلکہ بیدار معلوم ہوتا تھا کہ مناسب ہی جوابی کارروائی کر کے ہمارا رخ سیدھا کر دیا۔ چنانچہ اللہ کا شکر ادا کیا کہ ہم پھر اس نشست کے حقدار ٹھہرے ورنہ کوئی انجان مسافر ہوتا تو اس کی خصوصیات سے پورے طور پر واقف ہونے سے پہلے ہی ہمسایوں کی برہمی کا حقدار ہو جاتا۔ رہے ہم تو ــ

تم اپنی خو نہ بدلو گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں

کہتے ہوئے نشست پر پرانے تجربہ کے باعث بالکل درست انداز سے قائم ہو گئے۔ [illegible] ہر وقت سوچنے کا [illegible] میں اس بات پر غور کرتے رہے کہ بورڈنگ کارڈ دینے والے حضرات کیسے اندازہ کر لیتے تھے کہ صرف ہم ہی اس خصوصی نشست کے حقدار ہیں شاید ہم سے زیادہ مسکینی کسی اور صورت سے نہیں ٹپکتی ہو گی جو اس [illegible] ہی بالکل سفر کرنے والوں کے سلوک سے [illegible] جاتی تھی۔

[illegible] "پہنچنے" کے بعد جائزہ لیا۔ کھڑکی کی طرف ساتھ والی نشست پر ایک صاحب [illegible] احسان [illegible] کی ملک اور استفہامیہ انداز سے دیکھنے کی عادی [illegible]

کم مائیگی کے سبب بیٹھی تو خیر کیا تھیں بس پھنسی ہوئی تھیں۔ انداز سے سوال پوچھنے کے لیے بے چین۔ چنانچہ جیسے ہی جہاز بلند ہوا نیچے کی طرف دیکھتے ہوتے پوچھنے لگیں۔

"یہ نیچے روشنیاں کون سے شہر کی ہیں؟"

"راولپنڈی اور اسلام آباد کی ہونگی" کھڑکی سے دور ہونے کے باعث ہم نے بغیر دیکھے جواب دیا۔

"جی نہیں" جواب آیا۔ "بلندی سے صرف دور کی روشنیاں نظر آسکتی ہیں"

"وہ کیسے؟"

"میں نے مری سے راولپنڈی کی روشنیاں دیکھی ہیں"

"جی...! ایمانداری کی بات ہے کہ ہم صرف منہ دیکھتے رہ گئے لیکن صرف مروت کے خیال سے عرض کیا۔" خاتون وہ دوسری بات ہے....!"

وہ مجھے ٹوکتے ہوئے بھنائیں۔

"آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے

مؤدبانہ عرض کیا" آپ اس قسم کی باتیں کیوں نہیں کرتیں جو بغیر کوشش کے اپنے آپ سمجھ میں آجائیں"

خدا جانے کیا سمجھیں لیکن واضح طور پر شرما کر چپ ہوگئیں بلکہ مسلسل خاموش۔

کھانا آیا تو ہم نے پرانے تجربہ کی بنا پر انگریزی کھانا طلب کیا اور جب تک کھانا سامنے آتے ہم نے تصور میں چکن روسٹ اور تلی ہوئی مچھلی سے لطف اندوز ہونا شروع بھی کر دیا۔ لیکن قسمت آج یہاں بھی ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ کیوں کہ گوشت کے ناغہ کا دن نہ تھا اس لیے جو کھانا سامنے آیا وہ بزرگ ترین بھینسے کے گوشت اور ادھ پکے آلوؤں پر مشتمل تھا۔ ایک دبا پچکا بند بھی اپنے خالق کے کمال پر نقش فریادی بنا ہوا موجود تھا۔ اس کے علاوہ انگریزی کھانے کے لوازمات میں سے بے حد خوبصورت پیکٹ میں پیٹا از حد تیز زرد رنگ کا بے حد نمکین مکھن بھی شامل تھا۔ شکل وصورت اور ذائقہ کے اعتبار سے یہ گریس نما شئے ہر قسم کے مکھن کے لیے باعثِ عبرت تھی۔ معلوم نہیں یہ ہوائی کمپنیوں والے اتنے قیمتی کاغذ کے ایسے خوبصورت پیکٹوں میں اس قدر گھٹیا اشیاء کہاں سے فراہم کر لیتے ہیں۔ بہرحال کھانا تھوڑا بہت زہر مار کیا باقی چھوڑ دیا یہ دیکھ کر کہ جو سوچا تھا کیا کیا ہو گیا

اس دوران ایک ناقابلِ فہم بھنبھناہٹ کان میں آنے لگی۔ سوچا شاید کوئی یتیم خانہ والا چندہ مانگنے آپہنچا ہے جیسے یہ لوگ ہمیشہ چلتی گاڑیوں اور بسوں میں کرتے ہیں پھر چونکہ حضرت مبلغ -/۱۰۰ روپیہ کرایہ خرچ کر کے کون بھلا آدمی صرف چندہ مانگنے کے لیے سفر کریگا۔ زیادہ غور کیا تو پتہ چلا کہ یہ کپتان بہادر تھے جو بزعمِ خویش ضروری کوائف ہمارے گوش گزار فرما رہے تھے۔ یعنی یہ کہ ہم اتنی بلندی پر اس رفتار سے سفر کر رہے ہیں جو زمین پر کی رفتار

ہیر . . . . . .

ہی عرض کر رہے ہیں وگرنہ قسم لے لیجیے جو سمجھ میں ایک لفظ بھی آیا ہو۔ منہ میں تلخی اس خیال سے پیدا ہوگئی کہ کپتان نے ضرور یہ کہا ہوگا کہ "مجھے یقین ہے آپ ہمارے حسن سلوک سے مستفیض ہو رہے ہوں گے"

اس ناگوار تاثر سے ہنوز فارغ نہ ہوئے تھے کہ ہماری ہمسفر کی آواز ابھر آئی۔

"یہ شکارپور کے لوگ احمق کیوں مشہور ہیں؟"

"کونسا شکارپور؟" عرض کیا۔

"یہی جس کی روشنیاں نیچے نظر آرہی ہیں"

کافی سوچ کے بعد عرض کیا "جی ایک تو یہی وجہ ہوسکتی ہے کہ اتنی رات گئے بتیاں چھوڑ کر سو گئے ہیں"

انہوں نے ناگواری سے منہ دوسری طرف کرلیا۔ ہم بخیر گذشت کے تصور سے ابھی پوری طرح لطف اندوز نہ ہو پائے تھے کہ ائر ہوسٹس نے کراچی کے قریب پہنچنے کا اعلان کردیا۔ ذرا ہی دیر بعد روشنیاں نظر آنے لگیں۔ اتنے میں بی ہمسائی نے ایک مرتبہ پھر ہماری طرف رخ کیا اور اس دفعہ اس امر کا انکشاف فرمایا کہ

"جہاز راستہ بھول گیا ہے"۔

"آپ کو کیسے پتہ چلا؟" ہم نے جسارت کی۔

"بار بار ایک ہی جگہ چکر لگا رہا ہے" ارشاد ہوا

"رات کے وقت جب کوئی چیز نظر نہیں آرہی تو آپ کو کس چیز سے اندازہ ہوا کہ ایک ہی جگہ کے اوپر چکر لگا رہا ہے؟"

"میں نے روشنیوں سے اندازہ لگایا ہے" دلچسپ انکشاف!

"وہ تو سب سڑکوں کی ایک جیسی ہوتی ہیں"

"اس کی تصدیق روشنیاں گن کر ہوسکتی ہے" یا اللہ یہ بھی۔ ہم نے سوچا۔ اب انہوں نے گننا شروع کیا۔ جہاز چونکہ چکر کاٹ کر اترنے کی تیاری کر رہا تھا اس لیے بار بار اُن کی گنتی غلط ہو جاتی تھی ان کی مشکل اس طرح آسان ہوئی کہ یکدم ایک جھٹکے کے ساتھ جہاز کے پہیے زمین پر لگے اور اس نے تیزی سے رن وے پر دوڑنا شروع کردیا۔

اتنے میں ائر ہوسٹس کی آواز بلند ہوئی "خواتین وحضرات وغیرہ.... ہمیں یقین ہے کہ آپ کا سفر ہمارے ساتھ خوشگوار گزرا ہوگا .... ہمیں امید ہے آپ آئندہ بھی ہمارے ساتھ سفر کرکے ہمیں خدمت کا موقع دیں گے۔" انگریزی سند یافتہ خاتون نے لفظ "سفر" ایسے انگریزی لہجہ میں ادا کیا کہ یکدم واضح ہو گیا کہ ان بیبیوں کے چہرے پھیکے، افسردہ اور اداس کیوں تھے۔ بیچاری مسافروں کے ساتھ ہی بزبان انگریزی سفر (SUPPER) کرتی ہیں نا!

سلمیٰ یاسمین نجمی

پنڈی نیاں موجاں

مدفن اقبال شہر لاہور ہمیں اپنے حوالوں کی طرح پیارا ہے اس کے ذرے ذرے میں ایک عجیب قسم کی اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔ اگر ہمارا بس چلتا تو ہم اس "اُجڑے دیار" میں ہرگز پیدا ہونے کی غلطی نہ کرتے بلکہ داتا کی نگری میں ہی تشریف لاتے۔ بہرحال پیدا تو اب ہم ہو چکے تھے۔ تاریخ کا پہیہ الٹا نہیں گھوم سکتا تھا بلکہ یہ تو ہمارے دائرۂ اختیار میں تھا کہ ہم اپنی عمر عزیز کی چند گھڑیاں زندہ دلوں کے اس زندہ و تابندہ شہر میں گزار سکتے۔ خدائے مہربان نے یہ آرزو پوری کر دی اور ہم لاہور میں رہائش پذیر ہوئے۔

ہماری آرزو کا غنچہ ابھی پوری طرح کھلا بھی نہیں تھا کہ ہمیشہ کی طرح ہم فلک کج رفتار کی نظر میں آ گئے لہذا شوہر نامدار کے پیر میں کھجلی اٹھی اور انہوں نے کوچ کا نقارہ بجا دیا۔ نیا پڑاؤ پنڈی بنایا۔ ہم بہت کسمسائے خوشامد درآمد کی مگر کچھ بھی برآمد نہ کر سکے ہماری ساری چکنی چپڑی باتیں یوں پھسل گئیں جیسے چکنے گھڑے پر سے پانی کی بوند پھسلتی ہے چنانچہ میر بلکہ خون کے گھونٹ پیئے اور سفر کی تیاری شروع کی۔

پیارے پیارے ساتھیوں کی جدائی کے غم اور چشم نم کے ساتھ عازم پنڈی ہو گئے جوں جوں سفر کی مسافتیں طے ہو رہی تھیں ہمارے نصف بہتر خوشی سے بے حال ہوئے جا رہے تھے گویا پنڈی نہیں کوہ قاف جا رہے ہوں۔ باچھیں کھلی جا رہی تھیں عینک میں سے بھی آنکھیں چمکتی نظر آ رہی تھیں سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں اس وقت وہ قطعی اس روائتی جن کی طرح لگ رہے تھے جو کسی شہزادی کو بنگلا خ قلعے میں قید کرنے لے جا رہا ہو۔ خلاف عادت ہمیں چپ دیکھ کر وہ ذرا تنگ آ کر بولے۔

"بھئی یہ آج کترنی کیوں نہیں چل رہی۔ اللہ خیر کرے، کیا چپ شاہ کا روزہ رکھا ہے۔ وحشت ہو رہی ہے۔ سننے کی عادت پڑ گئی ہے نا کچھ بولو کچھ سنو"۔

"میاں سنئیں کیا بولیں۔ نئی جگہیں بدلتے بدلتے تنگ آ گئے ہیں۔ بمشکل لوگوں سے ملنا جلنا ہوتا ہے۔ تعلقات بنتے ہیں، کچھ دل لگتا ہے۔ درزی، دھوبی اور دودھ والے کی تلاش مکمل ہوتی ہے۔ اچھے اور سستے سٹور ملتے ہیں۔ سڑکوں گلیوں اور راستوں کا پتہ چلتا ہے تو آپ کوچ کا نادر شاہی حکم جاری کر دیتے ہیں۔"

کیسے اسے تم تم درزی دھوبی اور دودھ والے کے فراق میں آنسو بہا رہی تھیں، بچ۔۔ بچ۔۔ میرا خیال ہے پنڈی میں بھی یہ مخلوق رہتی بستی ہو گی"

ہمیں کس قدر گراں گزرا، اب تو اپنا پورا بیان آپ ہی کو اٹھانی پڑیں گی آپ کا کیا ہے فیصلہ سنا کر خود مزے سے خاموش ہو گئے دیکھا بکھرا پڑا سامان۔ بی بی سی سنا اور لمبی تان کر سو گئے۔ آپ کو تو چائے کی پیالی چاہیئے آپ کو اس سے کیا کہ ... فراہم

[illegible]

"جی ہاں یا پھر۔ صرف کہا مجھے نہیں جاتے پہلے بنی جاتے ہیں اور پھر بچوں کے اسکولوں کے داخلے۔ کبھی سوچا ہے آپ نے کہ ہر مرحلہ
نکل ایسا ہی ہے جیسے اگلے وقتوں کے بادشاہ ہاں پکڑ سیمنٹ کو ایسے میں بلوا دیتے تھے یوں ہمارا تیل نکلے گا آپ کے پاس کیا تو وقت
ہی نہ ہو گا۔"
"مجھے چھوڑ دو ان مرحلوں اور مسئلوں کو۔ ایک شہر ایک سی باتیں ایک سے مناظر دیکھ دیکھ کر تمہارا جی نہیں اکتا جاتا۔ جو مزہ نئے شہر
ہر نئی چیزیں دیکھنے ایکسپلور کرنے میں ہے وہ پرانی گھسی پٹی اور دیکھی بھالی چیزوں میں نہیں"
"آپ کی یہی عادت تو ہمیں زہر لگتی ہے، کل کلاں کو کہیں گے کہ تم بھی پرانی ہو گئی ہو تمہیں دیکھ دیکھ کر جی اوب گیا ہے لہذا
اب نیا ماڈل تلاش کرنا چاہیے۔"
"وہ بیٹ لگ اثر ہے سمجھی ہے چارے مناظر اور شہر تو بے زبان ہوتے ہیں تمہاری طرح دو دھاری تلوار کے مالک نہیں ہوتے۔"
"ہمیں تو بس اتنا پتہ ہے کہ لاہور لاہور ہی ہے۔"
"جناب پنڈی بھی بہرحال پنڈی ہی ہے آپ کے لاہور میں ہے کیا سوائے گرمی کے۔ انسان جھلس کر رہ جاتا ہے۔ پگھلے ہوئے
کانچ کی طرح کا آسمان تانبے کی طرح سرخ زمین۔ ہر وقت گرمی دانوں پر بعض پہکلے ہیٹ کا پاؤڈر چھڑکتے رہیں یا پھر لو کے تھپیڑے
دہکے رہو۔"
"ہاں جی پنڈی پاکستان میں تھوڑا ہی ہے وہ تو شاید انگلستان میں ہے جہاں گرمی ہوتی ہی نہیں۔ سردی دیکھی ہے پنڈی کی۔ ہر
وقت قلفی جمی رہتی ہے۔ نمونیہ اور برانکائٹس تو جیسے ناک اور سینے پر دھرے رہتے ہیں۔ گرم کپڑوں کی گٹھڑی بنے ڈاکٹروں کے ہاں
دوڑتے رہو۔"
"ایک خوبصورت جگہ نہیں لاہور میں سیر کرنے کو۔ لے دے کر جہانگیر کا مقبرہ ہے یا پھر نور جہاں کی قبر ورنہ میانی صاحب کی سیر
سوائے قبرستانوں کے یہاں اور دھرا کیا ہے۔"
"لارنس گارڈن"
"ہاں چلو ایک لارنس گارڈن کا باغیچہ بھی ہے۔ اور پنڈی کی موجیں دیکھو۔ چار قدم پر اسلام آباد اور شکر پڑیاں کی پہاڑی
ہے۔ ذرا ادھر اُدھر ہوئے تو دامن کوہ یا راول ڈیم پر جا پہنچے کچھ اور آگے بڑھے تو مری آ گیا وہاں سے کھسکے تو مختلف گلیوں سے
ہوتے ہوئے نتھیا گلی جا کر دم لیا ایبٹ آباد بالاکوٹ کس کس کا نام لوں۔"
"ٹالٹن کا۔ اس کا ذکر تو آپ بھول گئے۔ حالانکہ وہ بالکل ہی قریب ہے۔"
انہوں نے صاف صاف ان سنی کر دی "لاہور کی ریت سے تم اکثر شاکی رہتی تھیں۔ ہائے اللہ میں تو صفائی کی ستی پھر ریت ہی
ریت ہو گئی۔ اُف اناستان ہر ایک میں کرکل ہو جاتی ہے" انہوں نے باقاعدہ ہماری نقل اتاری۔
"ہاں جی پنڈی میں تو ریت ہوتی ہی نہیں۔ وہاں کی زمین تو سنگ مرمر سے بنی ہوئی ہے۔"
"ضرور دیکھ لینا بلکہ آزما لینا تھوڑی دیر کی تو بات ہے۔"
"بس کیجئے یہ موازنہ ہم اور برداشت نہیں کر سکتے۔"
وزیر آباد، سوہاوہ۔ گوجر خان۔ ان کی مسرت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میدان کے بعد پوٹھوہاری علاقہ کیسا چمک رہا ہے سرخ

سرخ ٹیلے۔ پہاڑیاں۔ . . . " وہ خوشی سے چہکے۔ ہم نے بات کاٹی "کیا خوبی ہے جی ان ٹیلوں میں؟ نری خاک ہی خاک۔ نہ کوئی گھاس کی پتی نہ ہرے بھرے پودے اور درخت۔ ڈھول اڑتی جھڑبیریاں ہیں یا ببول۔ عجیب ذوق جمال ہے آپ کا بھی"

"یہی تو ہماری مشکل ہے، ہمیں اپنے وطن کی چیزیں پسند نہیں آتیں۔ بالکل اسی قسم کی زمین امریکہ میں ہے تو اسے محفوظ کرکے سیاحوں کے لئے ایک عجوبہ چیز بنا دی ہے اور اس کا نام بیڈ لینڈ (BADLAND) رکھ دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ کروڑوں سال پرانا قطعہ زمین ہے۔ دور دور سے لوگ دیکھنے آتے ہیں۔ اور ایک ہم ہیں۔"

"ساری زمین ہی کروڑوں سال پرانی ہے۔ اسے پوری کو اٹھا کر نہ عجائب گھر میں رکھ دیں۔"

شام ہو چلی تھی۔ مئی کے نیلگوں شفاف آسمان پر ابتدائی تاریخوں کا چاند اپنے ساتھی ستارے کے ساتھ ہمارے ساتھ باقاعدہ دوڑ لگا رہا تھا۔

"وہ دیکھو پنڈی کی روشنیاں نظر آ رہی ہیں۔"

"عام سی روشنیاں ہیں۔" ہم قطعی متاثر نہ ہوئے۔

"میرے لو یہ پریذیڈنٹ ہاؤس ہے۔"

"ہمیں اس سے کیا۔ ہماری کوئی قرابت داری ہے جناب صدر سے۔"

"اب ہم پشاور روڈ پر جا رہے ہیں۔ جسے جی ٹی روڈ بھی کہتے ہیں . . . ."

"اور جس کو کبھی شیر شاہ سوری نے بنوایا تھا یہی بتانے والے تھے نا آپ۔"

"بیٹی میں تو بچوں کو بتا رہا ہوں، تم خواہ مخواہ . ."

"یہ ہم آخر کہاں جا رہے ہیں۔ پنڈی تو پیچھے رہ گیا۔ کہیں پشاور جانے کا ارادہ تو نہیں" وہ ڈرائیور سے مخاطب ہوئے "ادھر بائیں جانب کچی سڑک پر اتر جاؤ۔" موٹر کو نشیب میں اترتے دیکھ کر ہم ہڑبڑا کر چلائے "الٰہی خیر۔ یہ ہم کدھر جا رہے ہیں کیا وہ پیچھے بناسپتی پنڈی تھا اور اب یہ اصلی پنڈی . . . . بات ختم ہونے سے پہلے مٹھی بھر خاک ہمارے حلق میں اتر گئی اور ہم کھانسنے لگے۔ یہ جلدی سے بولے۔ "شیشے چڑھاؤ بھئی فوراً یہ سڑک کچی ہے۔"

"زیادہ کچی ہے" ہم بدستور کھانس رہے تھے۔ "پوری کچی ہے بلکہ اچھی طرح کچی ہے" شیشوں پر سے ریت پھسل پھسل نیچے جا رہی تھی۔

"مطلب یہ ہوا کہ ہمیں ہر بار آتے جاتے یہ خاک چاٹنی یا پھانکنی پڑے گی۔"

"نہیں نہیں یہ سڑک ایک نہ ایک دن مزدریکی ہو جائے گی۔ سڑک کو چھوڑو تم گھر دیکھو گھر" سامنے تکون احاطے کی دیوار کے ساتھ پھلوں کے درختوں کی لمبی قطار چلی جا رہی تھی۔ درختوں میں سے دو منزلہ ذرا ماڈرن قسم کا گھر جھانک رہا تھا۔

"دیکھو بھئی گاڑی ذرا احتیاط سے اندر کرنا۔ اس کچی سڑک کے بائیں جانب بڑا سا پانی کا گڑھا ہے۔ ذرا بد احتیاطی کی اور گاڑی پھسل گئی۔"

سنگِ مرمر کے ستونوں والے پورچ کے نیچے گاڑی کھڑی ہو گئی۔ اور ہم اپنے جوتے تلاش کرنے لگے حسب معمول ننگے پاؤں سفر کر رہے تھے۔

"اب نکلو بھی یا اندر ہی بیٹھی رہو گی۔ آؤ تمہیں گھر دکھاؤں۔ پنڈی کی موجوں کے سامنے اپنا لاہور اور اس کا ٹیپیکل گھر بھول جاؤ گی۔"

حالانکہ وہ گھر بھی ہرگز ٹیپیکل نہیں تھا مگر بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ نئی چیز کو دیکھتے ہی پرانی چیز بالکل نظر سے اتر جاتی ہے اور اس کی کوئی خوبی بھی یاد نہیں رہتی۔ "یہ دیکھو سٹنگ روم، لکڑی کی پینلنگ، وال پیپر، خوبصورت شیڈز، بیڈ، ڈائننگ روم کے فرانسیسی دریچے سنگ مرمر کا فرش بالکل نئے طرز کا باورچی خانہ تمام فٹنگ کے ساتھ۔ ہر وہ چیز موجود ہے جس کا خواب کوئی عورت دیکھ سکتی ہے اور کیا چاہتی ہو۔" انہوں نے کچن کی ساری بتیاں اور ٹیوب لائٹس جلا دیں۔ "دیکھا کتنا روشن اور ہوادار ہے تمہارے لاہور والے فضول سے باورچی خانے میں تو ایک اندھا دھاما بلب لگا ہوا تھا۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ مرچ کونسا ہے اور پتیلی کونسی۔"

وہ خاصے مبالغے سے کام لے رہے تھے۔ اور ویسے بھی فی الحال ہم انہیں یاد نہیں کرانا چاہتے تھے کہ لاہور والے گھر کی تعریف میں بھی خاصے زمین آسمان کے قلابے ملائے گئے تھے۔ اچانک ایک بے ہنگم شور سے ہم اچھل پڑے۔ وہ خوشدلی سے ہنس دیے "ارے ڈر گئیں۔ ارے بھئی یہ ایگزاسٹ فین ہے تاکہ کچن کی گرم ہوا باہر نکلتی رہے۔"

"اب ہم اتنے جاہل بھی نہیں ہیں کہ ایگزاسٹ فین اور اس کی کارکردگی کے بارے میں ذرا دار سا علم بھی نہ رکھتے ہوں۔ مگر آپ تو ہمیں بولائے دے رہے ہیں کبھی ایک بٹن دباتے ہیں کبھی دوسرا۔ کبھی اوپر تکنے کو کہتے ہیں کبھی نیچے، کبھی دائیں طرف رخ موڑتے ہیں کبھی بائیں طرف۔ آخر ہم انسان ہیں گھن چکر تو نہیں ہیں۔"

"بڑی ناشکری خاتون ہو بھئی۔ ایک تو گھر کا انتخاب کرتے ہوئے ہم نے آپ کی تمام سہولتوں اور آرام کا خیال رکھا۔ اور آپ بجائے شکرگزار ہونے کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہی ہیں۔"

انہوں نے ہمارا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔ "آؤ اوپر چلیں وہ حصہ بھی تو دیکھ لو۔"

"یہ ہمارا سونے کا کمرہ ہے یعنی ماسٹر بیڈ" ماسٹر صاحب جھٹ کھڑکیوں سے ہاتھا پائی کرنے لگے۔ "میں ہوا کے رخ پر ہے کیا فراٹے دار ہوا چلتی ہے یہاں"۔ کھڑکیاں ایسی ڈھیٹ تھیں کہ کھلنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ نہ جانے کب سے بند تھیں۔

"اب رہنے دیجئے۔ کہیں پورا فریم ہی نہ ہاتھ میں آ جائے۔"

وہ جواب دیئے بغیر غسل خانے میں ہاتھ دھونے چلے گئے۔ کھڑکیوں سے کشمکش کے دوران مٹی سے اَٹ گئے تھے نلکا کھولا پانی کی بجائے سائیں سائیں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ اندر سے ہی بولے "شاید ٹنکی خالی پڑی ہے۔"

"بہت ممکن ہے ہوائی نلکا ہو۔ آپ دوسرا کھول کر دیکھیں۔ پنڈی ہے نا۔ یہاں کی ہوائیں بہت مشہور ہیں۔ اس لئے شاید ایسے نلکے بھی لگائے گئے ہوں کہ جب کھڑکیوں سے ہوا موصول نہ ہو تو یہاں سے وصول کر لیں۔"

"نہیں بیگم اصل بات یہ ہے کہ یہاں سرکاری نل سے پانی نہیں آتا۔ پچھواڑے کنواں ہے اس میں مشین فٹ ہے۔ وہاں سے پانی اوپر ٹینکی میں چڑھایا جاتا ہے۔"

وہ بڑے اطمینان سے اپنے کپڑوں سے ہاتھ پونچھتے برآمد ہوئے۔ "کپڑے میلے ہو گئے ہیں۔ آخر کل تو دھلیں گے" انہوں

نے کپڑوں سے ہاتھ پونچھنے کا جواز بغیر استفسار کے پیش کیا۔ "ابھی پانی چڑھواتا ہوں۔ تم ادھر باہر آؤ ٹیرس پر۔" وہ ہمیں باہر لے آئے واقعی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بڑے فرحت بخش تھے۔ "ہم لوگوں کے دونوں طرف دو گاؤں ہیں۔ سیدھے ہاتھ پہ نسلے ہاتھ چوہڑ ہڑپال۔ اس وجہ سے شہری سہولتیں قدرے کم ہیں۔ بجلی کا بھی پرابلم ہو جاتا ہے۔ اس لیے جلد ہی ایک دو ڈالا اور موم بتیوں کا پیکٹ خرید لینا۔ میں نے تو حفظ ما تقدم کے طور پر کنوئیں پر چرخی بھی لگوا دی ہے۔"

"وہ کیا مطلب؟" ہم حیرت سے چلائے۔ اور آنکھیں ان کے چہرۂ مبارک پر جما دیں۔ ایسی نظروں سے کیوں دیکھ رہی اب اگر بجلی چلی جاتی ہے اور دیر تک نہیں آتی۔ "کتنی دیر تک" ہم نے پوچھا۔

"یہی دو چار دن یا اس سے کچھ کم یا زیادہ تو پھر پانی کہاں سے بھریں گے۔ پچھواڑے کنواں ہو۔ اور ہم سڑکوں پر پیاسے مارے مارے پھریں۔ وہی مثل لڑکا بغل میں اور ڈھنڈورا شہر میں۔"

"تو گویا آپ نے لڑکے کے سر پر چرخی لگوا دی۔ مگر جناب یہ رسی ڈول سے پانی کھینچے گا کون؟"

"بھئی روز تھوڑا ہی ایسے ہو گا۔ یہ تو محض ایمرجنسی کی بات ہے۔ اور پھر ورزش کی ورزش ہو گئی۔ اور پانی الگ مل گیا۔ نہیں گاؤں کی عورتیں پانی بھر بھر کر کیسی مضبوط اور جفاکش ہو جاتی ہیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر بجلی پر کیا آفت ہے جو وہ یوں دنوں کے لیے چلی جایا کرے گی۔"

"بجلی پر کیا بھروسہ۔ اس لفظ کے ساتھ ہی ترت پھرت اور لپک جھپک کا احساس ہوتا ہے۔ ایسی چیز جو ٹک کر نہ رہے۔ اور جاتی رہے۔"

"عجیب منطق ہے"

"بھئی تم اس وقت یہ ساری فکریں چھوڑو۔ ہوا دیکھو کیسی خنک ہے۔ پنڈی کی خوبصورت شاموں کے مقابلے میں لا حبس زدہ شامیں! اُف توبہ جیسے کسی ہاٹ کیس میں بند ہوں۔"

"تمہیں آسمان کے نیچے سونے کا کیسا شوق تھا۔ اب جی بھر کر سونا۔ کیا بے پردہ ٹیرس ہے۔" بے پردہ کیسے نہ ہوتا۔ ہو کا عا ویرانے میں اس گھر کے علاوہ آس پاس اور کوئی گھر نہ تھا۔ پردہ تو غالباً آدم زادوں سے ہوتا ہے اور ان کا یہاں گزر نہ تھا۔ لے یہ بیچارے چاند ستارے یا شجر حجر تھے۔ سو یہ قطعی بے ضرر تھے۔

"اُف فوہ ایک چیز تو دکھانا بھول ہی گیا۔ ذرا نیچے آؤ۔"

ہم بھی چونک پڑے۔ جیسے یہاں کوہ نور ہیرا کہیں دھرا تھا۔ جو دکھانا بھول گئے۔ دگڑ دگڑ کرتے سیڑھیاں اتر سیڑھیوں کے نیچے سر بچاتے ایک دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا جو بڑی سعادت مندی سے ہاتھ ہی کی آغوش میں دو سے باہر آ گیا۔ اسی کو دوبارہ سوراخ میں گھما کر دروازہ کھولا گیا۔ "یہ لائبریری ہے۔ اب اس میں وہ تمام کتابیں بھجوا دی جو لائبریری کے انتظار میں پیٹیوں میں پڑی بوسیدہ ہو رہی ہیں۔"

نیچے اور اوپر کے چکروں میں ہمارا سانس پھولا جا رہا تھا۔ ہم بمشکل ان عجائبات کی زیارت کر رہے تھے۔ منی سی لائبریری سے ملحق تھی۔ بلکہ غسل خانے کا روشندان لائبریری میں کھلتا تھا۔ غالباً یہ بعد کی تعمیر تھی۔ سیڑھیوں کے نیچے کی جگہ کو لا تبدیل کر دیا۔ نمی کی وجہ سے سارے شیلف اور دیواریں سیلی سیلی سی تھیں۔

ہمارا خیال ہے کتابیں پیٹیوں میں ہی زیادہ محفوظ رہیں گی۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ نچلے خانوں میں جو مٹی کی دھاریاں نظر آ رہی ہیں۔ یہ دیمک کی ہیں۔"

"اوہ" ان کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی ہم فکر مند ہو گئے۔

"کوئی بات نہیں ہم اس کو کارآمد بنا لیں گے۔ گھر میں الم غلم بے شمار کباڑ ہوتا ہے۔ ہم اس میں رکھ دیا کریں گے۔"

انہیں ہماری یہ تجویز شاید پسند نہیں آئی مگر چپ رہے۔

ہم بری طرح تھک چکے تھے۔ مانا کہ وہ ہمارے شریک زندگی تھے مگر اس سے زیادہ شرکت کی ہم میں تاب نہ تھی۔ ہم سامان کے کریٹ پر بیٹھ گئے۔ وہ ملازموں کو ساتھ لے کر چیزوں کی اٹھا پٹخ میں معروف ہو گئے۔ ہم شاید اونگھ گئے تھے۔ انہوں نے آ کر خوشخبری سنائی۔۔ "لو بھی باہر ٹیرس پر چارپائیاں لگوا دی ہیں۔ کمرے ویسے بھی گندے ہیں۔ اب کل ہی صفائی ہو گی۔"

ہم قدم گھسیٹتے ایک بار پھر اوپر تشریف لے گئے۔ ٹھنڈی ہوا تھپکیاں دے رہی تھی۔ آسمان پر لاتعداد ستاروں کے چراغ روشن تھے۔ ایک کونے میں حضرت چاند بھی جلوہ افروز تھے۔ لو بھی آج ہم بھی ستاروں کی مدھم روشنی میں چاندنی کی زرد چادر لپیٹ کر سوئیں گے۔ یہیں نیچی سفید چھتوں سے ٹکرانے کی بجائے کائنات کے حسن سے چار ہو گئیں۔ پہلی بار لاہور کے چھٹنے کے غم میں قدرے افاقہ محسوس ہوا۔ اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے بستر پر دراز ہو گئے۔ یہ ابھی تک باہر سونے کے انتظامات میں معروف تھے ایک عدد پانی کی گھڑیا چاندی کے کٹورے سے ڈھک کر ہمارے سرہانے رکھی گئی۔ صرف موتیا کے ہار کی کمی رہ گئی تھی۔ ایک عدد پیڈسٹل پنکھا بھی لایا گیا۔ میٹھی میٹھی نیند ہمارے ذہن میں گھسنے لگی۔ ہم گہری نیند میں ڈوب گئے۔ مگر یہ کیا عجیب سی بھنبھناہٹ ہمیں سنائی دی۔ جیسے کسی نامعلوم سیارے کے جہاز اور ٹ ہماری ہی چھت پر لینڈ کرنے والے ہوں۔ اور پھر اسی خلائی مخلوق نے ہماری آنکھوں ناک اور کان میں گھسنے کی کوشش شروع کر دی۔ پھر جیسے ہزاروں انجکشن ہمارے جسم کے ہر مسام میں اترتے چلے گئے۔ ہم نے کروٹ بدل کر ان کے شانے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ ایک زوردار چپت ہمارے ہاتھ پر پڑا۔

"ہم مچھر نہیں ہیں۔" ہم بلبلا کر بولے۔

"اوہ! معاف کرنا" انہوں نے چادر کے خیمے میں سے سر باہر نکالا۔ بچے بھی اپنے بستروں پر کروٹیں بدل رہے تھے۔ ہم نے ڈٹ کر سب کو ڈھکا۔ مگر نیچے بھی کبھی ٹھکے رہ سکتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد پھر رونا کراہنا شروع کر دیتے تھے۔ پنکھا بھی لگا یا مگر اس مخلوق کی دیدہ دلیری اور سخت جانی کے سامنے بے چارے پنکھے کی کیا اوقات۔ پنکھا تھا کوئی مشین گن تو نہیں تھا۔ باہر سونے کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ کہاں کا چاند، کس کے ستارے۔ کیسی ہوا اور کیسی فضا ہر چیز زہر لگ رہی تھی۔ اپنا تکیہ چادر گھسیٹا اور دوسرے ہاتھ سے سال بھر کے بلال میاں کو سنبھالا اور گردے اٹھے کمرے میں جا کر دم لیا۔ معاملہ یہاں بھی دگرگوں تھا۔ مگر اتنا بھی نہیں جتنا کہ انسان مچھر کھانے کی مشین بن کے رہ جائے۔ بلال کو لٹا کر ہم بقیہ دونوں کو بھی لانے کے لئے اٹھے تاریک گیلری میں اچانک ایک سفید پوش چیز سے زبردست ٹکر ہوئی۔ سر چکرا کر رہ گیا۔ ایک چیخ ماری اور ہم بھوت بھوت چلانے لگے۔ یہی سنا تھا کہ بے آباد گھروں میں بھوت پریت اور آسیب کا بسیرا ہو جاتا ہے۔ ہائے ہائے بلکہ ہائے جان گھبرا کر بولی "بڑی خبط الحواس ہو۔ بھوت نہیں میں ہوں۔ چھوٹو کو اٹھا کر اندر لا رہا ہوں۔ تمہارا شکر ہے تم نے تو مجھے بھی ڈرا دیا۔ شکر ہے بچے نہیں ڈر گئے۔"

اور یوں ہم بال بچوں سمیت بہ تصدقات ہٹی سے بھرے عرشِ پر گزاری۔ مصلحتاً پنڈی کی موجوں کا تذکرہ کرنا اس وقت ہم نے مناسب نہیں سمجھا ظاہر ہے شکست خوردہ جرنیل اپنی شکست کا تذکرہ اتنا پسند نہیں کرتا۔

چند روز اور گزر گئے۔ ہم پر اپنے اڑوس پڑوس اور گھر کے مزید اسرار منکشف ہونے شروع ہوئے۔ گھر کے آس پاس پانی کے جوہڑ تھے جن میں بھینیس سوئمنگ کرتی تھیں۔ مچھر اور مکھیوں نے اپنے زچہ بچہ سنٹر قائم کر رکھے تھے۔ جہاں سے ہر روز تازہ دم فوج ہم پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہوتی تھی۔

رہا گھر تو اس میں من جملہ اور باتوں کے ایک خوبی یہ تھی کہ ہر دروازے پر غسل خانے سمیت تالا موجود تھا۔ اور ہر تالے کے ساتھ اس کی دو شریکِ زندگیاں یعنی چابیاں تھیں۔ ان چابیوں کی حفاظت اشد ضروری تھی کیونکہ گھر چھوڑتے ہوتے چابی کا حساب دینا تھا۔ ہم نے ساری چابیاں جمع کر کے الماری کے ایک خانے میں رکھ دیں کہ کہیں بچے اِدھر اُدھر نہ کر دیں۔

شام کو نہا دھو کر ہم اطمینان سے چائے پینے بیٹھے۔ بلال میاں اندر کمرے میں سو رہے تھے۔ ندی سے چلتی ہوئی ہوا نہ جانے کیا ہوا کہ اچانک زوردار آندھی میں تبدیل ہو گئی۔ چٹاخ چٹاخ شیشے چٹخنے لگے۔ دھڑ دھڑ دروازے بند ہونے لگے۔ سب حواس باختہ ہو کر دائیں بائیں اوپر نیچے دوڑ رہے تھے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ دھلے ہوئے کپڑے الگنی پر سے اُتر کر فضا میں لہرا رہے تھے۔ بچے کپڑوں کے پیچھے دوڑ رہے تھے اُن کو تو ایک شغل ہاتھ آ گیا تھا۔ کاغذ پکنک کے لیے جو ہر ال استعمال ہوئی تھی سب اُڑ رہی تھی۔ اِدھر ہم اپنے بیڈ روم کے دروازے کا کان مروڑ رہے تھے۔ کیونکہ بلال اندر چنگھاڑ رہے تھے۔

"چابی لاؤ جلدی سے۔ یہ خودکار تالے ہیں۔ بغیر چابی کے نہیں کھلیں گے"

"چابیاں تو اندر ہیں الماری میں"

"الماری میں چابیاں کیا کر رہی ہیں۔ یہ دروازہ اب کیسے کھلے گا۔ اور باقی دروازے بھی بند ہو گئے ہیں۔ آج تو ایک کمرہ نہیں بچے گی"

"آپ کو کمروں کی پڑی ہے یہاں بچہ رو رو کر ہلکان ہو رہا ہے"

"میں کیا کروں پھر۔ تمہیں نہیں پتہ تھا کہ یہ خودکار تالے ہیں"

"آپ نے کیا بتایا تھا۔ ہم کون سا تالوں کی سیرت و کردار کی ماہر ہیں۔ آئے بڑے وہاں سے"

"کوئی کامن سینس بھی ہوتی ہے کہ نہیں۔ چابیاں الماری میں رکھنے کے لیے ہوتی ہیں"

"آپ کا خیال ہے کہ ان من بھر کی چابیوں کو ہم اپنے کمر بند سے باندھ لیتے"

"کمر بند کے علاوہ بھی کئی جگہیں ہوتی ہیں" وہ جھنجھلا کر بولے۔

"اس کے علاوہ پراندہ ہوتا ہے اور کوئی جگہ ہمیں نہیں معلوم۔ سوائے اس کے کہ ہم ان کی چھاگلی بنوا کر گلے میں پہن لیتے"

بچے کے رونے سے ہمارا دل خون اور اوسان خطا ہوئے جا رہے تھے۔ "خدا کے لیے کوئی ترکیب سوچئے" وہ تو

سر ختم ہو جائے گا:

اور پھر سارے گھر کی بتیاں بجھ گئیں۔ ایک اور نئی مہم شروع ہو گئی۔ اب سب موم بتیوں، ماچس اور ٹارچ کی تلاش میں لگ رہے تھے۔

"تو بھئی یہ بھی ہونا تھا" یہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ نیم تاریکی میں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ یہ بھاگ دوڑ کیوں اور کس لیے ہو رہی ہے۔ بلال کو باہر سے پچکار رہے تھے۔ تسلیاں دے رہے تھے۔ اچانک ایک تجویز ہمارے ہی دماغ میں بجلی کے کوندے طرح چمکی۔ "سنیے! وہ جو دیوار میں ائرکنڈیشنر کے لیے سوراخ ہے، اس میں سے کسی کو کمرے میں اتارا جائے تو دروازہ کھل سکتا ہے!"

فوراً کچھ لوگ سیڑھی لینے دوڑے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت سرد ہوا کے جھونکے ہیں جہنم کی لپٹیں اور بوندے نگاریاں لگ رہی تھیں۔ باہر سیڑھی لگائی گئی اور ڈھونڈ ڈھانڈ کر سب سے پتلے بچے کو اندر گھسیڑا گیا۔ اس طرح مظلوم ن میاں کو رہائی نصیب ہوئی۔ اور چابیاں برآمد ہوئیں۔

"کسی کمبخت نے مالک مکان کو مشورہ دیا تھا کہ ہر دروازے میں آٹومیٹک تالے ٹھونک دے۔ چٹخنیاں بھی لگائی سکتی تھیں۔ ہم دیہاتیوں کا ایسی جدیدیت کے ساتھ گزارہ مشکل ہے۔ سیدھے سادے گھر ہی اچھے ہوتے ہیں!"

"ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا!"

"چار گھنٹے ہو گئے ہیں سارے گھر کو ناچتے ہوئے آنگن ہی ٹیڑھا ہے۔ چاہے آپ مانیں یا نہ مانیں۔ اس سے یادہ ناچنے کی ہمیں ضرورت نہیں۔"

اور پھر تو ایک آدھ دن چھوڑ کر روز ہی آندھی بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلے جھونکے کے ساتھ ہی سب بھاگیں مارتے روازے کھڑکیاں بند کرنے کوئی لالٹین اور ماچس لینے دوڑتا تو کوئی فریج ٹی وی کے بٹن بند کرنے۔ کیونکہ ہوا کے ساتھ ہی [illegible] بلی بھی جھومنے لگتی تھی اور مشینوں کی زندگیوں کے چراغ بھی بجھا جاتی تھی۔ اور پھر خود بھی ایسی غائب ہوتی کہ دنوں خبر نہ لیتی۔ پھر غریب بارش ہی کے پانی سے غسل کرتے۔ کپڑے بھی اسی پانی سے دھلتے۔

پینے کا پانی بھرنے کو ہم بھی ذرا اپنے پنگھٹ تک جاتے۔ چرخی گھما گھما کر ہتھیلیاں سرخ ہو جاتیں مگر ڈول کھینچ کر نہ دیتا جانے وہ حسین نازک اندام گوریاں کیسے پانی بھر لیتی تھیں بلکہ مسافروں کو بھی جی بھر کر پلا دیتی تھیں۔ اس قدر جان لیوا کام ے ساتھ رومانی گیتوں کا تصور ہمارے ذہن میں تو نہیں آ سکتا تھا۔ ایک فٹ رسی کھینچنے ہی میں رومان کو یوں ہوا ہو جانا چاہیے تھا جیسے دمشق کے قحط میں عشق فراموش ہو جاتا تھا۔ پنگھٹ سے پانی بھرنے یا بھروانے کی بجائے ہم نے بہتر سمجھا۔ فائر بریگیڈ والوں سے پانی خرید لیا جائے۔

امیر الاسلام ہاشمی

قطعات

یقینِ عاقبت

اپنے جوتوں کو نہ پاکر شیخ بولے ساتھیو	مل گئے ہونگے بہت سے ہیں یہاں مل جائینگے
آئی مسجد سے صداصاحب عاقبت پر ہے یقیں	ایک جوتے کے عوض ستر وہاں مل جائینگے

مسخرے

دو مسخروں نے گھیر لیا مجھ کو ایک دن	شاید انہیں گمان تھا میں بے زبان ہوں
ہنس کے انہوں نے پوچھا کہ احمق ہو یا گدھے	میں نے کہا کہ " دونوں کے اب درمیان ہوں "

چارہ گر

اِک قریب المرگ ہنس کر مجھ سے یہ کہنے لگا	میں تو یوں زندہ ہوں اب تک چارہ گر چھٹی پہ ہیں
اب میں سمجھا ہوں کمی کیوں آگئی اموات میں	مرنے والے منتظر ہیں ڈاکٹر چھٹی پہ ہیں

آب و ہوا

بدلنے کے لئے آب و ہوا بیٹے کو بھیجا تھا	مگر اُس نے ولایت میں بدل لی اصلیت اپنی
وہ گھر لوٹا تو کچھ بدلا ہوا اتنا نظر آیا	کہ جیسے رکھ کے آیا ہو وہیں پر ولدیت اپنی

صورتِ حالات

وہ مرد و زن تو بیشک تھے مگر حلیہ کچھ ایسا تھا — تمیزِ مرد و زن مشکل نظر آنے لگی مجھ کو
عجب تھا حُسنِ ظن یارو جسے میں مرد سمجھا تھا — وہ اصلی صورتِ حالات سمجھانے لگی مجھ کو

تیز گام

ستم ظریفی تو دیکھیں کہ لولے لنگڑوں کو — ہمارے دیس میں نازک خرام کہتے ہیں
کبھی نہ وقت پہ پہنچے جو اپنی منزل پر — غضب خدا کا اُسے تیز گام کہتے ہیں

شامیں

کچھ ایسی ذہنوں پہ چھائی ہے تیرگی اب تو — کہ دوپہریں بھی راتیں منائی جاتی ہیں
کسی کو داد بھی دیتے ہیں ہیچ فن کی اگر — تو اس غریب کی شامیں منائی جاتی ہیں

نظم

کیا بتاؤں میں کیوں ہوا ٹس مس
ایک گونگے نے چغلی کھائی تھی
ایک اندھا تھا چشم دید گواہ

طیب منیر

چونچلے

ایک زمانے میں کچھ ایسی کہانیاں لکھی جاتی تھیں جن میں جانوروں یا پرندوں کے منہ میں انسانی زبان دے دی جاتی تھی اور وہ بڑی سیانی اور سمجھداری کی باتیں بناتے تھے اس طرح خوفِ فسادِ خلق کا خدشہ بھی ختم ہو جاتا تھا اور من کی بات بھی مفت میں ادا ہو جاتی تھی تو آج اگر انسانوں کے منہ میں جانوروں کی زبان یا چونچ دے دی جائے تو کیا مضائقہ، میڈیکل سائنس کی روز افزوں ترقیوں کا سہارا لے کر یہ کام آسانی سے کیا جا سکتا ہے جانوروں کی زبان تو اکثر کے منہ میں رکھی رہتی ہے جن کے اثرات کا ذکر محن ورنے یوں کیا ہے۔ ؎ کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی۔ یہ سب کرشمے غلط جگہ پہ زبان فٹ کر دینے سے نظر آتے ہیں اگر واقعی یہ ممکن ہو جائے کہ تبدیلیٔ زبان یا چونچ کا مرحلہ آ جائے تو پھر انسانی زبان کے جو زخم لگتے ہیں اور جو بھرتے بھی نہیں ہیں، ان کا خطرہ مٹ جائے گا پھر ناولوں اور افسانوں میں یوں آئے گا کہ زید نے بکر کو ٹھونگا مار کر زخمی کر دیا زخم تو خیر استرے سے بھی آ جاتا ہے جو کلائی کے زور سے چلایا جا رہا ہو اگر چونچ کا زخم لگ گیا تو کیا غم۔ زبان کا زخم نظر نہیں آتا البتہ استرے اور چونچ کا چرکہ ظاہر با ہر جلوہ دے گا۔ ایک اور واضح فرق یہ ہے کہ چونچ کا کرشمہ کچھ عرصہ بعد مندمل ہو جائے گا، زبان کا زخم مٹنے کا نہیں ہوتا، یہ رونا ہے کوئی ہنسی نہیں ہے جب زبان نہ رہے گی تو تماشا نہ رہے گا، ذرا کسی سے تو تو میں میں ہوئی ایک ٹھونگا لگا دیا اور پھر ٹھونگے کا جواب ٹھونگے سے مل بھی جاتا ہے زبان درازی کا جواب تو ہر کوئی دے نہیں سکتا، بعض لوگ ہر کام زبان سے لیتے ہیں ان کو زباندان کہتے ہیں (کبھی ان کا تعلق پاندان سے بھی ہوتا ہے) حتیٰ کہ ان کی روزی کی ڈور بھی زبان سے بندھی ہوتی ہے ان کی زبان کو کوئی نہیں لگتی، دھن سے زبان یوں نکلتی ہے۔

؎ اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی ۔ بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی

چونچ کے چرکے میں منافقت کا دخل نہیں، بس غصہ آیا اور جھڑ دی پہلی ملاقات میں چھیڑی۔ (یہاں چھیڑی سے مراد نے چونچ لی ہے) لیکن زبان کا وار سوچ بچار کا متقاضی ہوتا ہے جس کا اثر دیرپا اور دشمن زیر بار رہتا ہے۔

کبھی آپ مرغی کے ننھے ننھے چوزوں کو چھیڑیں اور ان کو پکڑنے کی کوشش کریں تو پھر چونچ کا کمال دیکھئے، جلال و جمال کی دونوں صورتیں جلوہ گر ہوں گی حالانکہ آپ کی نیت چوزوں کو نقصان پہنچانے کی ہرگز نہ تھی، مرغی کو آپ کی نیت کا کیا علم، نیت بدلتے کوئی دیر لگتی ہے، سارا دن درختوں پر دو دو تولے کے تلیر اور چڑیاں آپ کی غلیل کا نشانہ بنتے رہتے ہیں اگر معصوم چوزے کو بھی لقمہ بنالیں تو کیا اعتبار، اس لئے مرغی احتیاطاً ایک ٹھونگا لگا دیتی ہے وہ بات دل میں کبھی نہیں رکھتی سے یہ حسابِ دلِ طائراں ہے۔

عالمی سطح پر بھی جب بات بڑھ جاتی ہے کمو دیتی ہے تکرار لحاظ کا سلسلہ چل نکلتا ہے، تو ابتدا تو تنکا سا دو ہلکی ٹھونگا بازی سے مشقوں کا آغاز ہوتا ہے، پھر بڑی چونچ والے پرندوں کا تو کچھ بھی نہیں جاتا البتہ ننھے ننھے چرندوں کو وہ ٹھونگے لگتے ہیں کہ ان کی "ماں" بھی کوئی دفاع نہیں کر پاتی وہ پرائن اویں پڑے ہوئے "کھارے" میں جا پناہ لیتی ہے وہاں سے مجسمۂ آزادی صاف نظر آتا ہے یہ ٹھونگے کی کرامتیں ہیں کہ دنیا میں لڑائی کے امکانات روشن اور دشمنی کی حدیں واضح ہوتی چلی جا رہی ہیں، اب لمبی چونچ والے پرندوں کا اعتبار اٹھ گیا ہے، کوّے ہیں سب دیکھے بھالے چونچ کالی دل بھی کالے پرندے اپنی چونچ سے لڑنے کا کام کم ہی لیتے ہیں "چوگ وٹانے" کا کام تو بہر طور ناگزیر ہے وہ اپنی چونچ اور پنجوں سے "کٹر کنے" کا کام لیتے ہیں۔ تاریخ اردو ادب سے یہ بات ثابت ہے کہ انسان کی بھی چونچ ہوتی ہے، البتہ وہ چھری کی طرح چھپائے رکھتا ہے وہ ازراہ تفنن پسماندگان کو چونچ کی انی پر رکھے رہتا ہے۔ چونچ کے بارے میں پہلی تاریخی شہادت میر کے ہاں ملتی ہے۔ میر صاحب بڑے مزے کے آدمی تھے جہاں اپنے ماموں سے خراب تعلقات کا ذکر کرتے ہیں وہاں اپنی چونچ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ ع مدت ہوئی ہماری منقار زیرِ پر ہے، میر صاحب ذرا شریف آدمی تھے ورنہ اگر وہ ہمت سے کام لیتے تو دو چار ٹھونگوں کا اہتمام کر کے اپنی شادی کے امکانات روشن کر سکتے تھے، مگر کیا کام ہمت سے اس اندام طلب کو ان کی طبیعت میں "چچر پن" کا فقدان تھا، وہ ان لوگوں کی طرح نہیں تھے جو خیرات ڈنڈے سے وصول کرنے کے عادی ہیں یعنی اپنی تو جہاں چونچ لڑی پھر وہیں دیکھو۔

اردو ادب میں پرندوں کا کافی عمل دخل رہا ہے، اقبال نے پرندوں کے درویش کی بات بھی کی ہے، درویش اور مومن کی مشترک صفات کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ شاہین بناتا نہیں آشیانہ، اور سبق دیا ہے کہ اے انسان تو بھی اپنا گھونسلہ مت بنا لیکن انسان ماننے کا نہیں ایک کی بجائے دو، دو، تین تین گھونسلے بناتا ہے اور فخر سے پیشانی پر آشیانہ فلاں رقم کرواتا ہے تاکہ بے گھر لوگوں کو زیادہ سے زیادہ احساس محرومی دیا جائے۔ اقبال چونکہ بہت بڑے شاعر ہیں اور امکان بھی نہیں ہے کہ دگر دانائے راز آید کہ نا ید۔ ہمارے ہاں کوئی بڑا شاعر پیدا ہو۔ اب شاعری ٹھگی اور ٹھگی روزگار بن کے رہ گئی ہے اور شاعر نے کہا بھی ہے کہ اس رزق سے موت اچھی۔ اس لئے ہم حوالے کے لئے بڑے شاعر کا کلام بھی پیش نظر رکھیں گے، تو جناب! اقبال کے ہاں کئی جگہوں پر چونچ کا ذکر آیا ہے، ممولے کا تو پتہ نہیں کہ اس کی چونچ ہوتی ہے یا نہیں کیونکہ وہ بہت

معمولی سا جانور ہے، البتہ شاہین، باز، حمام دہنا نے والا نہیں، ہاں گنجشک فرمایہ سا جانور ہے اس کی چونچ بھی نہ ہونے کے برابر ہے باقی جتنے بھی پرندوں کا ذکر اقبال کے ہاں آیا ہے وہ بغیر چونچ کے نہیں آیا، ثابت ہوتا ہے کہ تصور زماں و مکاں کی طرح اقبال کے ہاں چونچ کا بھی خاص تصور ہے جسے ہم طالب علموں کی آسانی کے لئے "اقبال کا تصور چونچ" بھی کہہ سکتے ہیں ایک مقام پہ تو اقبال نے ہمیں وہ بات کہہ دی ہے جس سے ہمیں شرم آنے کا بھی امکان ہے، وہ چونچ کے کارنامے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ؎

تو مرغ سرائی، خورش از خاک بجوئی
ما در صدد دانہ بانجم زدہ منقار

دیکھا آپ نے حکمت اور دانائی کی کتنی بڑی بات بیان کی گئی ہے جو بغیر چونچ کے ادھوری رہ جاتی۔

غالب کے ہاں چند پرندوں کی "چونچوں" کا ذکر ہے، ہمائی چونچ کا بھی بیان ہے۔ ہما چونکہ نہ میں نے دیکھا ہے اور نہ آپ نے اور کھاتا بھی ہڈیاں ہے چونچ یقیناً مضبوط ہوگی اس لئے ہم اس کا ذکر نہیں کرتے، ہڈیاں کھانے والے جانور سے بھلا کس بھلے کی توقع کی جا سکتی ہے، غالب نے فرمایا کہ ع رسیدن ہائے منقار ہما بر استخواں غالب۔ مرزا صاحب نے عنقا نامی پرندے کا بھی ذکر کیا ہے جو اس زمانے میں بھی اور آج کے دور میں بھی تقریروں میں استعمال ہوتا ہے جس مقرر کے ہاں عنقا زیادہ ہوگا اس کی تقریر لوگ بالک آنکھیں کھول کر اور کانوں پر صافہ لپیٹ کر سنتے ہیں اس کی چونچ کے بارے میں تاریخ شعر خاموش ہے اس لئے ہم بھی خاموش ہیں۔ آپ نے دیکھا اقبال کے ہاں حقیقی پرندوں کا ذکر ہے اور غالب ہاں فرضی اور خیالی پرندوں کی بات ہے میرے خیال میں دونوں کے فن اور مقاصد میں بھی یہی فرق ہے۔ ایک کے بال و پر بے حدود و بے ثغور دنیاؤں کی طرف پھیلتے ہیں اور ایک کے پر و بال منظر اک بلندی پہ بنانے کی محدود راہوں کا رخ کرتے نظر آتے ہیں۔ خیر یہ بات برسبیل سخرہ قلم کی نوک پہ آگئی، اقبال نے کمزور چونچ والے پرندوں اور طاقتور چونچ والے پرندوں کا ذکر بھی کئی مواقع پر کیا ہے، میزائل کی صورت لمبی منقاریں، تلوار کی طرح چونچیں جن کا نشانہ چاول جتنی چونچ والے مسکین و مجبور حمام کبوتر بنتے رہتے ہیں ؎

کہیں جرّہ شاہین سیماب رنگ لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ
کبوتر کہیں آشیانے سے دور پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور

تو یہ باتیں غور و فکر، دیانت کے ساتھ چاہتی ہیں جو فی الحال ہمارے پاس نہیں ہے اور راز کی باتوں کے بارے میں شاعر نے فرمایا ہے ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے، مطلب یہ ہے کہ ہمیں پُراسرار باتوں کے کھوج میں نہیں رہنا چاہیے ہم اپنی زندگی کی گاڑی کو بے عملی اور بے عقلی کے دو پہیوں سے چلا رہے ہیں، ہماری شکست و ریخت بڑے پیمانے پر ہو رہی ہے ہماری ٹیکنیک میں تعفن آچکا ہے اور کہوں کیا دل سے شکستیں الجھی ہیں، حکیم مومن خان نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

ع یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن ۔ یعنی کوئی پتہ نہیں مسلمان کیوں زوال آمادہ ہیں؟ شاید ہم نے کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں سے زندگی کے فلسفے تلاش کرنا شروع کر دیئے ہیں، اپنی گردوں وقار روایات کو کہنہ جان کر دل سے اتار دیا ہے بدقسمتی سے اب ہمارے پاس عقابی چونچ نہیں رہی فقط کرگسی چونچ کا سہارا لے کر شکار مردہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں

آپ ابھی تک سوچ رہے ہوں گے کہ میں کسی نہ کسی مقام پہ مختلف پرندوں کی چونچیں لڑاؤں گا۔ لمبی چونچ اور مختصر چونچ کے چونچلے دکھاؤں گا، نہیں بھئی طبیعت میں ابھی چونچالی نہیں آئی۔ ویسے جدید دنیا میں چونچ بہت ضروری شے ہے اس کے بغیر وجود بذات ذرا مشکل ہے، چونچ کو ہتھیار کا استعارہ بنا کر بات سمجھ میں آسکتی ہے اب ہر شے تو میں بتلانے سے قاصر ہوں

ع ٹک چونچ ہلا تو بھی اک بات مشہور ہو جائے

لمبی چونچ سارس کی بھی ہوتی ہے اگر آپ اس کو دعوت دیں تو پلیٹ میں ہرگز کھانا نہ دیں بلکہ کسی صراحی کا انتظام کریں ہمارے معاشرے میں بھی سارس نما حضرات کافی تعداد میں مل جائیں گے جو آنکھیں بند کر کے ایک ٹانگ پہ کسی بڑی مچھلی کے انتظار میں مہینے گزار دیتے ہیں، سارے جال کا گندہ ہونا آپ کو معلوم ہی ہے، مچھلی کے سلسلے میں حلال حرام ذرا کم ہی زیر بحث آتا ہے، اس کو ذبح تھوڑا ہی کرتے ہیں۔ بلخ کی چونچ چپٹی ہوتی ہے وہ گندے اور گہرے پانی میں رزق تلاش کرتی ہے، مقصد پیٹ بھرنا ہوتا ہے۔ کالے پانیوں میں کالا دھندا نظر نہیں آتا۔ اس چونچ کے حامل افراد کی لغت میں ملک یا قوم لفظ نہیں ہوتا۔

کائنات کا پہلا معرکہ جس میں چونچ استعمال کی گئی اور جس کی صداقت پہ گواہی بھی دنیا کی سب سے سچی کتاب نے دی وہ ہے ابابیل کی چونچ، جس چونچ کی زد میں ہاتھیوں کا لشکر بھی بھس کی صورت میں صحرا کی وسعتوں میں بکھر گیا، ظالم حملہ آوروں کے صرف افسانے رہ گئے جو تاریخ کی زبان وقفے وقفے سے دہراتی رہتی ہے۔ واقعات کی یہ جھلک کبھی ہماری انفرادی زندگی میں اور کبھی اجتماعی زندگی میں نظر آتی ہے چونچ کی کارفرمائیاں دور و نزدیک ہمارے امتحان کے درپے ہیں: "شہرستان ہوا کے دلدادگان ہرجائی کی منقار درازیاں" کہاں کہاں ہمارا پیچھا کرتی ہیں ـــ یہ بھی دیکھئے ـــ

وہ حقہ پیتے تھے، شعر نہیں کہتے تھے، طالب علموں کو پیٹتے تھے، سارا دن شیشم کے درخت تلے اپنی توند کے ساتھ قیلولہ فرماتے، جب آنکھ کھلتی، دو چار دھپ اور کش لگاتے پھر آنکھیں موند کر ٹانگیں پسار لیتے۔ سر اقدس قمقمے کی طرح روشن، جس کو سلیٹ کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ ہم نے کبھی ان کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا۔ سوائے مار پیٹ اور ان کی سائیکل صاف کرنے کے کچھ بھی نہیں یاد۔ محکمے کی طرف سے سکول میں شلوار کی پابندی تھی اس کے باوجود وہ دھوتی باندھتے، صدری پہنتے، بڑا سا حقہ پیتے، شلوار عرصہ دراز سے سٹاف روم میں عنکبوت کی کارگاہ ہوئی تھی۔ تین چار سال سے تو میں بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ بغیر استاد کے لٹکی ہوئی ہے جب کبھی کہیں اڑتی سی خبر ملتی کہ افسر قسم کی کوئی شے سکول آنے والی ہے تو وہ شلوار کو دیوار سے جدا کر کے جھاڑتے اور کرسی کی پشت پہ ڈال دیتے کہ

یہاں سے شلوار ٹانگوں کے نزدیک معلوم ہوتی۔ افسر کب آتے ہیں؟ نہ آنے کی وجہ سے شلوار کئی دن کرسی پر بے مصرف پڑی رہتی۔ ایک دن حسب معمول قیلولہ فرما رہے تھے، حقے سے بھی سرگرم سخن تھے کہ کسی نے آواز لگائی، بابو جی آئے افسر بالا صدر دروازے تک پہنچ چکے تھے، استاد صاحب بھاری بھرکم تو تھے ہی، مشکل سے خود کو کرسی سے چھڑایا، اس لئے چلم اُلٹ چکی تھی، حقے کا پانی نے سے نکل چکا تھا، کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب۔۔۔۔۔ وہ شلوار اٹھا کر کمرے کی طرف بھاگے اور جاتے ہی دونوں ٹانگیں ایک ہی پائنچے میں پھنسا دیں، بابو جی دروازے پر کھڑے معائنہ فرما رہے تھے، سب طلبہ کو اس واقعے کی اطلاع مل چکی تھی، ہر کسی کے چہرے پر ہنسی ضبط کرنے کے آثار تھے۔ ایک دن درخت تلے آرام فرما رہے تھے روشنی ان کے سر کا طواف کر رہی تھی کسی شریر کوے نے روٹی کا خشک ٹکڑا ٹھیک نشانے پر پھینکا جو آتے ہی انکے سر کو لالہ زار کر گیا۔ اس زمانے میں ہنسی کا دریا بہہ نکلا تھا لیکن اب چونچ کے چرکے کا خیال دل کو اداس کر جاتا ہے اس سلسلے میں کالی داس کا ایک غیر معروف اور مشہور شعر سنیئے۔

اک دسترس سے تیری کالی بچا ہوا تھا
اس کے بھی سر پہ تو نے چرکا لگا کے چھوڑا

ہماری تہذیبی زندگی جس محور کے گرد گھومتی ہے محاورہ بھی اس کا عکاس ہوتا ہے، مثال کے طور پر "کاٹھ کا اُلو" یہ بھی ایک تہذیبی شناخت کا ذریعہ ہے۔ کاٹھ کے اُلو کی بھی چونچ ہوتی ہے لیکن وہ ضرر رساں نہیں ہوتی، ہمارے ہاں اکثر شاعر اور ادیب کاٹھ کا اُلو ہوتے ہیں یا دوسروں کو سمجھتے ہیں اور مشاعروں میں یہی کچھ سمجھا سمجھایا جاتا ہے کہ کون کس درجے کا اُلو ہے۔ لکڑی کی تلوار بھی ہوتی ہے جس کے بارے میں کسی شاعر نے ہی فرمایا ہے، کام پڑے تو کام نہ آوے لکڑی کی تلوار ہے دنیا۔ دروغ گوئی کی وجہ سے میرا حافظہ کمزور نہیں ہے بلکہ مسلسل شعراء کے دیوان پڑھ کر حافظہ چیزوں کی شناخت کھو بیٹھا ہے، ورنہ چند مزید محاوراتی منقاروں کا ذکر کرتا فی الحال حافظ کے ساتھ خواجہ حافظ کا نام ذہن میں آرہا ہے جس طرح ہم اقبال کو پیار سے 'بالا' بھی کہتے ہیں اس طرح حافظ شیرازی اپنے مقطعوں میں خود کو پیار سے حافظا کے نام سے پکارتے ہیں اس لئے حافظ کے ساتھ حافظا کا ذکر بھی آگیا۔ ہاں تو ان کی شاعری سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا حافظہ عام شاعروں کے برخلاف خاصہ مضبوط تھا، چونچ کے سلسلے میں نہ سمجھ میں آنے والی ایک مزے کی بات فرما گئے ہیں کہ بلبل کی چونچ میں پھول کی پتی تھی اور وہ عاجزی سے نالہ کر رہی تھی۔ کمال ہے کہ چونچ بھی بند ہے اور نالہ بھی کر رہی ہے غور کرنے سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ ضروری نہیں کہ چونچ ہلائی جائے تب ہی نغمہ و نالہ سنائی دے اگر گوش بند و چشم بند و چونچ بند بھی ہو تو اظہار نالہ ممکن ہے، ہر قسم کے شاعروں کے لئے اس میں سبق ہے کہ "لب بندی" کی خموشی بھی ذریعہ اظہار بن سکتی ہے۔ اب حافظ کا وہ شعر بھی سن لیجے جس سے بات چلی تھی۔

بلبلے برگِ گلے خوش رنگ در منقار داشت — و اندراں برگ و نوا خوش نالہ ہائے زار داشت

یک اور مقام پر خواجہ صاحب نے چونچ کی بلاغت پر اظہار فرمایا ہے ؎

آبِ حیوانش ز منقارِ بلاغت میچکد — طوطیٔ خوش لہجہ یعنی کلکِ شکر خائے تو

اس کی بلاغت کی چونچ سے آبِ حیات ٹپکتا ہے، خوش لہجہ طوطی، یعنی تیرے شکر چبانے والے قلم سے)

موجودہ دور کے شعراء نے اپنی چونچ کی اس بلاغت کا بڑا خیال رکھا ہے بلکہ ان کو "بلاغت ربود" پر پورا کنٹرول حاصل ہے جس شاعر کے کلام میں جتنی "بلاغت ربود" ہوگی اتنا ہی بڑا فنکار اس کو سمجھا جائے گا ایک آدمی اگر غصے میں ان کو بودم بے دل کہہ دیتا ہے تو بُرا نہیں ماننا چاہیئے شاعر بہرحال شاعر ہی ہوتا ہے، کاٹھ کا اُلو تھوڑا ہی ہوتا ہے۔

حافظ کے ہاں منقاروں کی وہ بھرمار ہے کہ پریشانی سی ہو جاتی ہے کہ بیاضِ حافظ سے کیا چونچ نکالی جائے؟ ان کے ں مرغانِ قافیہ سنج وبذلہ گو بھی نظر آتے ہیں پھول کے چہرے سے پردہ اٹھتے ہی "شکر دے" پر ندگو گو شروع کر دیتے ہیں اور کہیں ہمارے نالائق شاعروں کی طرح نالائق پرندوں کی چونچ کا ذکر ہے کہ ؎ زاغ چوں شرم نہ دارد کہ نہد بسرِ گل اور کہیں مرغانِ ہرزہ گو کا معاملہ ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے پرندوں کا ذکر کر کے حافظ ہرزہ گو شعراء کی بات رہے ہیں اور کوّے کا ذکر چھیڑ کر بے سُرے گلا باز قافیہ بندوں کا پردہ چاک کر رہے ہیں۔ بڑا شاعر تو آنے والے مانوں کی بات بھی کرتا ہے، حوالے کے لئے اقبال کی پیش گوئیاں دیکھئے یا تذکرہ ہرزہ گویاں از شپرک ردیف آبادی مطالعہ مفید رہے گا۔ حافظ کے مرغان زیرک مثلاً شاہبازِ طریقت، ہدہد خوش خبر، بلبل صبور۔ یہ سب پرندے اپنی منقاروں سے اپنے اپنے مکاتبِ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں خواجہ صاحب کے ہاں بلبل ننھی سی چونچ کے ساتھ لمنت کرتی نظر آتی ہے اور اقبال کے ہاں شاہباز و شاہین بیابانوں میں لمبی لمبی "اڈاریاں" مارتے پھرتے ہیں، اقبال حافظ کو کیوں کر پسند کرتے؟ رگِ گل سے بلبل کے پَر کَس کر باندھ دیں تو وہ ہل بھی نہیں سکتی، کہاں شاہین سارا دن تُند وتیز رتا رہتا ہے۔ لہو گرم رکھنے کے بہانے تلاش کرتا ہے۔ حافظ کی بلبل خالی الدماغ ہے اس نے پھول کے فیض سے بات رنا سیکھی ہے ورنہ یہ اقوال اور غزلیات اس کی چونچ میں چھپے ہوئے تو نہ تھے بلبل خیابانوں سے پرہیز کرے گی تو مر جائے ۔ شاہین نیلگوں آسمانوں میں فطرت راہبانہ کی طاقت سے ضربت غازیانہ کا مظاہرہ کرتا پھرتا ہے، ہم سب ہی بلبل کو پسند تے ہیں، یہ ہماری سہل پسندیاں ہیں، شاہین کی سخت کوشیاں ہیں لرزہ براندام کئے ہوئے ہیں۔

شاعرانِ کرام کی منقار مبارک قابلِ دید و قابلِ شنید ہوتی ہے فضول گوئی میں جتنا کسی کو ملکہ حاصل ہوگا اتنی ہی بڑی س کی چونچ ہوگی۔ آپ نے کبھی دیکھا مہمل شعر پر اتنی زیادہ داد کیوں دی جاتی ہے؟ وجہ ظاہر ہے داد دینے والے نے ی غزل پڑھنی ہے غزل پڑھ چکنے والا شاعر دروغ باقی کے بعد داد دینے کی بجائے چونچ جھکا کر اپنے اعمال وانجام غور کرتا ہے۔ پرندوں کی دنیا میں شہباز و شاہین بڑے جری، محنتی اور مدبر قسم کے پرندے ہوتے ہیں اور زاغ و زغن ا از میر نگری میں جنرل قسم کے مرغانِ بدزبان مائلِ پندار و پرواز رہتے ہیں۔ مو خرالذکر گروہ سے تعلق رکھنے والے ہمارے ہاں شاعر

بھی ہوتے ہیں جن میں نہ عبرت ہے نہ ذوق، جہالت و غباوت کے قریب المرگ بیلوں سے شاعری کی سنگلاخ زمینوں میں ہل چلاتے پھرتے ہیں۔ مرنے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد۔

لمبی چونچ کے کارناموں کا بے شمار پہلوؤں سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے مثلاً بیدل کی نغمہ سرائیوں کا ادراک تو دور کی بات ہے ہم اقبال کی خوشنوائیوں سے نابلد ہیں (اقبال کا ذکر بار بار اس لئے آتا ہے کہ وہ شیر ببر شاعر شیریں مقال ہماری پہچان ہو کر رہ گیا ہے، اس نے ہمیں زندہ قوم ہونے کا شعور دیا) آج کل کچھ لوگ لمبی چونچ کے طفیل اقبال پر اتھارٹی بنے پھرتے ہیں جنہوں نے اقبال کی فارسی تصانیف سوائے سرورق کے مطالعہ نہیں فرمائیں، اسی اتھارٹی کے زور سے اقبال کے یہ مفاد شناس اقبالیات کی خدمت کر رہے ہیں۔

اگر چونچ کی کرشمہ کاری ادب میں ہو تو اس کو معرکہ کہتے ہیں، ہمارے ادب میں بے شمار جنگیں ہوئیں، زمانہ قدیم میں ادبی جنگیں سر بہ طرۃ ہار گلے میں ڈال کر لڑی جاتی تھیں، ادبی جنگوں کی بھی تاریخ ہے جو "ادبی معرکے" کے نام سے معروف ہے یہ ایک مستند ادبی معرکوں کی تاریخ ہے جس میں شرح و بسط کے ساتھ چونچ چلانے والوں کے حیرت انگیز اور کہیں کہیں شرمناک معرکے نقشوں کے ساتھ واضح کئے گئے ہیں۔

کتابوں کی بھی آپس میں منقار درازی ہو جاتی ہے ایک دفعہ کسی افسر نے کتابوں کی جنگ چھیڑ دی تھی، نام اسم حامد اللہ تھا جس میں فریقین کو ناکامی کا ورق دیکھنا پڑا۔ تاریخ کتب کی یہ پہلی جنگ تھی جس میں نہ تو مالی نقصان ہوا اور جانیں تلف ہوئیں البتہ وقت کے زیاں کا احساس ضرور ہوا۔

انسانوں اور پرندوں کی بوقلموں منقاروں کا تذکرہ ذرا طویل ہو گیا۔ یہ دنیا اتنی جاذب توجہ اور از خود رفتہ بنا دینے والی ہے کہ کہیں انسان چونچیں چمکائے اترائے پھرتے ہیں اور کہیں پرندے منقاریں صیقل کئے صید و صیاد بنے پھرتے ہیں، بس نام جدا جدا ہیں حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کر نوری ہو۔ اس ذکر کے لئے بھی ہزار منقاریں درکار ہیں، بیدل کتنی منقاروں کا متمنی ہے۔

زگلگشت حقیقت تر زبانم　　　بصد منقار می بالد بیانم

خالدہ قادر

ہم کچھ نہیں کہتے

بڑے دنوں بعد اماں بی دوبارہ اپنے بڑے سے دوپٹے کو سمیٹ کرتی اور چپل گھسیٹتی آن وارد ہوئیں تو ہم اپنے تمام پچھلے گلے شکوے مٹا کر فوراً ان کے استقبال کو لپکے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ گلہ شکوہ کیا۔ ان کے تمام فضیحتے اور کوسنے ہم ہمیشہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دینے کے عادی تھے۔ اس لیے وہ جب بھی اپنی مرضی اور مارے محبت کے آئیں ہمیشہ ہی اپنی ہی مرضی اور مارے غصے کے گئیں۔

خیر! ہم نے حقیقت میں انہیں خلوص سے زوردار سلام جھاڑا کیونکہ ان کے بغیر بھی اداس ہو گئے تھے۔ پر سبے دھکیلتے ہوئے بولیں۔ "اے ہٹو بھی! تم سے تو اتنا بھی نہ ہوا کہ یہ مُوا منہ ہی دکھلانے آجاتیں" ...... دیکھا آتے ہی وار کر گئیں۔ ہمیں پتہ تھا۔ خفت مٹاتے اور غصہ بھگاتے ہوئے بولے۔ "بس خالہ بی۔ آپ جانیں ہمارے کام۔ منہ دھونے تک کی فرصت نہیں۔ اسے لے کہاں جاتے ——؟" "ہاں" کو لمبا کرتے ہوئے بولیں۔ "تو تم جانو تم یہ بتاؤ کیا کر رہی تھیں" اب وہ باقاعدہ پاؤں پسار چکی تھیں۔ اور اپنی پوٹلی میں سے چھالیا نکالنے میں مصروف تھیں۔ "کچھ نہیں خالہ بی۔ بس نوٹس بنا رہے تھے۔ چھوڑیں، آپ سنائیں" مگر غالباً ان کے پاس سنانے کو کچھ نہ تھا۔ جبھی دوبارہ پیچھے پڑ گئیں۔ "اُسے لڑکی! اب کب تک پڑھو گی۔ اور کیا کیا پڑھو گی۔ یہ مختصر سی جان ہو گئی۔ پر اللہ ماری کتابیں نہ گئیں پہلے کوئی سی تمیز یا عقل آگئی جو اب زیادہ ہو جائے گی۔ چھوڑو کتابیں۔ میری مانو تو اب ھانڈی چولہا سنبھالو۔"

ہم جانتے تھے یہی ہوگا۔ پہلو بدل کر بے چینی سے پہلے خالہ بی کا جائزہ لیا۔ پھر اپنا کہ واقعی ہم اور مختصر تو نہیں ہو گئے استنے میں اپنی بات کا اثر نہ ہوتے دیکھ کر خالہ بی پھر گرجیں۔ "اونٹ کی اونٹ ہو گئیں۔ پر گھر سنبھالنا نہ آیا" ان کی نظریں ہمارے ارد گرد بکھری کتابوں پر تھیں .... "اُسے نو!" ہم نے شکر کا سانس لیا۔ چلو مختصر تو نہ ہوئے اور اونٹ بھی یقیناً نہیں ہوتے۔ ابھی پچھلے سال کے کپڑے بس تھوڑے تھوڑے چھوٹے ہوتے ہیں۔ وہ بھی اس لیے کہ فیشن لمبی قمیضوں کا آگیا ہے۔ ورنہ ہم تو پچھلے دس سال سے اسی قد پر ہیں جس قد پر تھے۔ ہم پھر سوچ رہے تھے۔ اور خالہ بی بغیر جواب کے ہول رہی تھیں۔ دوبارہ ان کا نزول ہوا۔ تو مصالحت بھرے انداز میں بولیں۔ "تم بھی تو دیکھو ..... کیا پڑھ رہی تھیں ..."

ہاں اسے کہتے ہیں "پسپائی" ہمیں خود بخود مشکل لفظ کی تشریح سمجھ میں آگئی۔ جو برسوں سے معمہ بنی ہوئی تھی۔ جان چھڑانے اور رعب جمانے کو ہم نے جھٹ موٹا سا انگلش ناول خالہ بی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جو ان کی جان ناتواں پر بوجھ بن گیا۔ کہنے لگیں۔ "اے بیٹی! ناول کر پڑھتی ہو کیا۔"؟ اب ہم ہنسی دباتے گویا ہوئے۔ "نہیں خالہ بی صفحے گن گن کر پڑھتے ہیں۔" اچھا۔ اچھا۔" انہوں نے جان چھڑائی۔ لیکن صفحے الٹتے پلٹتے جانے اچانک انہیں کیا ہوا۔ کہ جیسے بجلی کے ننگے تار کو ہاتھ لگ گیا ہو۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ہمارا محبوب ناول دو گز دور زمین پر جا گرا۔ اور خالہ بی ہیں کہ توپ کے آخری گولے کی گھن گرج کی طرح "دُر فِٹے منہ" دھاڑ کر خاموش بیٹھی ہیں۔ یہ تو ہمیں اچھی طرح پتہ تھا کہ ان کی پنجابی یہیں سے شروع ہوتی، اور یہیں ختم ہو جاتی تھی لیکن اس گھن گرج کا مقصد سمجھ میں نہ آیا۔ ہم نے فوراً بھاگ کر اپنا ناول اٹھایا اور سیدھا کر کے ٹھیک ٹھاک کر کے گود میں رکھ کر پہلے۔ خالہ بی خیر تو ہے...... طبیعت تو اچھی ہے نا آپ کی؟ : اب کے تو وہ بالکل ہی الف ہو گئیں۔ زمین سے پاؤں اٹھا، پلیٹھے سنبھال، صوفے پر سکڑ کر بیٹھ گئیں۔ اور اپنے جھریوں زدہ ٹیڑھے میڑھے ہاتھوں سے آنکھوں پر۔ چھجا سا بنا کر لرزتی آواز میں بولیں.....

یہ پڑھتی ہو۔ ؟ یہ خرافات۔؟ توبہ۔ توبہ۔ جبھی تو میں کہوں۔ یہ پڑھائی ختم ہونے میں کیوں نہیں آتی....... اللہ کی مار ان کتابوں پر...... ایک ہمارا زمانہ تھا......" لیکن اسی دوران ان کی باتیں اور یادداشتیں پھر ایک عدد خوفناک چیخ پر ختم ہو گئیں۔ اب کے ہم نے مارے پریشانی کے جائزہ لیا۔ ایک نظر خالہ بی کے سرخ پڑتے بلکہ براؤن ہوتے چہرے کو دیکھا۔ اور دوسری نظر اپنی گود میں رکھے ناول پر ڈالی۔ خالہ بی بدستور آنکھوں پر انگلیوں کی جھالر کا پردہ کھینچے ہاتھ کے ایک کونے سے ناول کا سرورق دیکھنے میں مصروف تھیں۔ اب سارا معمہ سمجھ میں آگیا۔ ہم ہنسی دباتے ان کے غصے کو ہوا دیتے ہوئے بولے...... "تو! اس میں کیا برائی ہے۔ بلکہ تعلیم میں اور کتابوں میں تو برائی کبھی ہوتی ہی نہیں۔ یہ تو اتنا عجیب اور سچا سا ناول ہے۔ اس تصویر سے بڑے بڑے سین تو آپ سینما میں بیٹھ کر پاکستانی فلموں میں دیکھ آتی ہیں..... پھر ؟" لیکن ابھی ہماری بات ادھوری ہی تھی کہ خالہ بی اپنے کپڑے جھاڑتی، دوپٹہ سنبھالتیں، چپل میں پاؤں گھسیڑ، سرپٹ کر بی اماں کے کمرے کی طرف چل دیں۔ ساتھ ساتھ ان کی صلواتیں، طعنے اور دنیا سے حیا کے اٹھ جانے کا رونا پورے عروج پر تھا۔ وہ ہماری صورت پرستی پھٹکار کا سبب بھی بتا رہی تھیں۔ اور یہ بھی کہ اس گھر میں رحمت کے فرشتے کیوں نہیں آتے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ نوید بھی سنا گئیں کہ اب بس قیامت آنے ہی کو ہے۔

خالہ بی کمرے سے کیا گئیں۔ بھونچال آ کر چلا گیا۔ ہم نے سکون کا سانس لیا۔ بالوں کو ہمیشہ کی طرح بغیر کنگھی کیے جوڑا بنا کر اس میں پنسل پھنسا کر پھر سنبھل کر بیٹھ رہے۔ ابھی ناول پڑھتے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ خالہ بی۔ اماں سمیت دوبارہ آ دھمکیں۔ اب کے طوفان شدید تر تھا۔ گھن گرج کے ساتھ بجلی بھی کڑک رہی تھی۔ جھٹ ناول سنبھال ایک طرف رکھتے ہوئے

- موڈ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ چہرے پر ازلی مسکینی اور نقلی معصومیت طاری کرتے ہوئے دونوں کو بیٹھنے کو جگہ دی اور خود کھسکنے ہی کو تھے کہ اماں کی آواز نے دروازے میں ایسے ہی آ لیا۔ جیسے بھاگتے سپاہی کو آخری موڑ پر دشمن کی گولی بیچ کمر میں آ لگے۔ کوئی راستہ نہ پا کر نہایت احترام سے بولے۔ جی اماں... ؟ یہ بھابی کیا فرما رہی تھیں۔ اماں ہمیشہ خالہ بی کو بھابی کہتی تھیں۔ دل میں خالہ بی کو ہزاروں کوسنے دے ڈالے۔ "دیکھا ایسا ہوتا ہے اونٹ۔ جل تب بھی مخالف کو دانتوں میں چبا ڈالے۔ یہیں سب محاورے اور ان کے مطلب خود بخود سمجھ میں آ گئے۔ دانت کچکچاتے خالہ بی کی طرف دیکھا۔ اور پھر اماں کی طرف دیکھ کر تو گویا دم ہی نکل گیا۔ کیونکہ جب اماں مورچہ سنبھال لیں تو سمجھا کارن پڑا۔ ایسے میں قریبی خندق میں پناہ لینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہم ہمیشہ اپنے کمرے کی طرف دوڑ لگاتے ہیں۔ جس کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر دی جائیں تو یہ خندق ساؤنڈ پروف ہو جاتی ہے۔ اور سنا پڑنے والی صلواتوں اور پھٹکار کی گھن گرج سے کان اور دروازہ محفوظ رہتے ہیں۔ البتہ ایک قدم اور آگے ہم یہاں اپنا پسندیدہ کیسٹ بھی بجاتے ہیں۔ چنانچہ خیالات کا ناتا باہر کی دنیا سے بالکل کٹ جاتا ہے۔ ابھی ہمارے ارادے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے۔ کہ اماں کی گرجدار سوالیہ لمبی "ہوں" سنائی دی۔ دوبارہ ہمت جمع کر کے پوچھا.... "جی اماں کیا... ؟ بجائے اماں کے خالہ بی کی غصے سے کانپتی آواز سنائی دی۔ "ہائے لو..... بن گئیں معصوم۔ یہی تو لچھن ہیں۔ آج کل کی پڑھائی نہ دہ لڑکیوں کے۔" یقین آ گیا کہ آج خالہ بی پرانے پورے حساب چکا کر دم لیں گی۔ دعا شکر کہ اماں نے بات اچک لی۔ ورنہ صلواتیں خالہ بی کو گن گن کر کم و بیش چھتیس تو ضرور ہی آتی تھیں۔ کیا پڑھ رہی تھیں۔ دکھاؤ ذرا.....؟ جرنیل کی طرح حکم صادر ہوا۔ اور ہم جو اماں کے ساتھ ہمیشہ بے سوچے کر مصالحت پر تیار رہتے تھے کہ سمندر میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں رکھا جا سکتا۔ پھر اپنے لیے دفاعی مورچہ سنبھال بیٹھے۔ قریب پڑی تنقید کی وہ موٹی سی کتاب اٹھائی جس میں سے واقعی ہم خالہ بی کے آنے سے پہلے نوٹس بنا رہے تھے۔ وہ تو انہیں چڑانے کی خاطر ناول ان کے ہاتھ میں تھا کر دشمن کے نرغے میں آ گئے تھے۔ اب جو اماں نے لے دیکھا تو الٹ پلٹ کر کے حیرت سے بولیں۔ "بھابی جان اچھی خاصی کتاب تو ہے۔" عینک درست کر کے نام پڑھتے ہوئے انہیں مزید تسلی ہو گئی۔ شکر کہ اماں اخبار کی سرخیاں پڑھنے کی حد تک تعلیم یافتہ تھیں۔ یعنی تو بڑے موٹے حروف میں کتابوں کے نام اور قرآن شریف پڑھ لیتی تھیں ورنہ تفصیلی خبریں اور خط پڑھ کر سنانے کا عذاب ہمیں ہی سہنا پڑتا تھا۔ اب کے خالہ بی کی بار تھی۔ انہوں نے ٹوٹے چشمے سے بندھے ہوئے دھاگے کو اپنے کان کے گرد مضبوطی سے گھمایا اور سرخ پڑتی گھورتی آنکھیں ہم پر گاڑ دیں۔ "اے لڑکی۔ واہ واہ! چکر دیتی ہے ہم کو ان بوڑھی گناہ گار آنکھوں کو (یہاں تک تو ہم ایمان لے آتے) وہ کہاں گئی وہ رنگین والی موٹی والی دوسری کی خرافات۔ (خالہ بی کی گرائمر ہمیشہ غلط ہوتی تھی۔ ہم پھر سوچ کر جھنجھلاتے۔ آخر یہ اور کتنی بڑی ہوں گی جب انہیں صحیح بولنا آتے گا) اور ہم ناول کو صوفے کے کشن کے نیچے دبا کر اس

پرسکون سے بیٹھ چکے تھے۔ آرام سے حیرت طاری کرتے ہوئے بولے: "کون سی کتاب خالہ بی۔ یہی تو ہے۔ یہ لیں! دیکھیں۔
اس وقت سے بیٹھی نوٹس بنا رہی ہوں۔" ہم نے جھٹ اپنی کاپی آگے کر دی اب تو اللہ دے اور بندہ لے والی بات ہو گئی۔
خالہ بی کی زبان دو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی تھی۔ وہ ہماری پوری پچھلی سات نسلوں میں سے اس شخص کو ڈھونڈ رہی
تھیں جس کے گناہوں کی سزا کے طور پر ہمیں اس خاندان میں بھیجا گیا تھا۔ انہیں شریف شرفاء کے خاندان میں ہمارا وجود بہت
کھٹک رہا تھا۔ اماں بے چاری چپ تھیں۔ انہیں ہمارے معصوم ہونے پر شک گزر رہا تھا کیونکہ ہم اکثر ان کے ساتھ بھی
ڈنڈی مار جایا کرتے تھے۔ لیکن وہی بات کہ اپنے مار کر سائے میں پھینکتے ہیں۔ اماں بی خاموش تھیں۔ غنیمت اسی میں تھی کہ کمرے
سے نکل پڑتے۔ چنانچہ کتابیں اٹھائیں۔ ہاتھوں کی مہارت دکھاتے ہوئے کشن کے نیچے سے ناول نکال، کتابوں کے بیچ
سنبھال کر چل دیئے۔ باہر نکلتے نکلتے اب جو خالہ بی کی طرف دیکھا تو بالکل یوں لگا جیسے کہہ رہی ہوں ....
آدھر تو آ بیل مجھے مار دوں! جان بچاتے، دانت کچکچاتے اور دل ہی دل میں جل تو جلال تو کا ورد کرتے اب جو باہر کی راہ لی
تو کوریڈور میں آ کر ہی دم لیا۔ تازہ ہوا میں لمبے لمبے سانس بھرتے تہیہ کیا کہ آج چاہے دس گھنٹے تک بیٹھی رہیں خالہ بی۔ ایک
گلاس سادے پانی کو بھی نہ پوچھیں گے ..... انشاء اللہ۔ گھنٹے بھر تک پہلے دونوں بزرگوں کی آوازیں فل سپیڈ پر آتی رہیں۔
پھر گویا موم بتی جلتے جلتے ختم ہونے لگی۔ ہم نے شکر کا سانس لیا۔ اور ایک بار پھر بے خیالی میں کرسی اور میز کو ملا کر پاؤں پسار
کر کوریڈور ہی میں بیٹھ رہے۔ ناول ہمارے ہاتھوں میں تھا۔ اور ہم زور و شور سے چیونگم چباتے اور پاؤں ہلاتے اس
کے مطالعے میں غرق تھے کہ دو آنکھیں قریب ہی گھورتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اب جو دیکھا تو سانس حلق میں اٹک کر رہ گیا۔
اس سے پہلے کہ خالہ بی جھپٹتیں۔ ہم ناول مضبوطی سے ہاتھوں میں دبائے مصالحانہ انداز میں زبردستی مسکراتے کھڑے ہو گئے
اور خطرہ ٹالنے کو بولے: "ارے خالہ بی۔ چلدیں آپ۔ اتنی جلدی۔ بیٹھئے تو۔ آپ کو چائے پلائیں۔" (درمیان
میں زیادہ نہیں تو دس دفعہ ہم نے تھوک نگلا) لیکن پیچھے سے ہی اماں جو ان کے گھنٹہ بھر بولنے سے عاجز آ چکی تھیں۔ سر
ہلاتے بولیں: "نہیں کوئی بات نہیں۔ بھابی جان کا گھر دور تھوڑی ہے۔ کل پھر آ جائے گی۔ ہیں نا۔ بھابی..."
اور بھابی تھیں کہ خشمگیں نگاہوں سے ہمیں گھورے جاتی تھیں۔ ہم دل ہی دل میں گزشتہ روز پڑھے ہوئے
داغ کے شعر کو یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ خالہ بی سلام جھاڑتیں باہر چل دیں۔ جب باوجود ذہن پر زور دینے کے
کامیاب نہ ہوئے تو اپنے حافظے پر تین حرف بھیجے اور قوتِ شعر گوئی کو کام میں لاتے ہوئے ایک دم ہی گنگنا اٹھے .....

"دیکھو تو ذرا چشمِ ستم گر کے اشارے
پھر تم کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے"

شاعری

تلوک چند محروم

رباعیات

ہر سانس اُسی کے حُکم پر چلتی ہے
یہ زیست اُسی کے رحم پر پلتی ہے
شاداب اگر نہ ہو کرم سے اُس کے
کب شاخِ حیات پھولتی پھلتی ہے

(۲)

ہے گرچہ نہاں منبعِ انوار ہے وہ
مہر و مہ و انجم پہ ضیا بار ہے وہ
ہے شمعِ حیات اُسی سے روشن اپنی
جب چاہے بجھا دے اِسے مختار ہے وہ

(۳)

رزّاق سے سب ہیں رزق پانے والے
مہمان اُس کے ہیں آنے جانے والے
نازاں نہ ہو اور کو کھلا کر انساں
اِک خوانِ کرم سے سب ہیں کھانے والے

دل خوش نہ ہوا ملال پیوستہ رہا
بدحال رہا خراب اور خستہ رہا
بے سود ہوئیں اِدھر اُدھر کی باتیں
سربستہ جو راز تھا وہ سربستہ رہا

(۵)

کیوں جرأتِ الحاد کا اظہار کریں
ابلیس کو کس لیئے نگو نسار کریں
توفیقِ رضائے حق سے عاری ہیں اگر
کیوں ہستیِ ذاتِ حق سے انکار کریں

(۶)

خالق نے بسا کے دہر کی بستی کو
مفہوم دیئے بلندی و پستی کو
ہر ذرّے کے نقطے میں نہاں ہے نکتہ
مہمل نہ سمجھ نگارشِ ہستی کو

جوہر نظامی

ڑا ہے میرا مقسوم نہ جانے کیوں
ھ سے آج بھی ہوں محروم نہ جانے کیوں

م خوار و تم میرا غم کیوں کھاتے ہو
ں تو رہتا ہوں مغموم نہ جانے کیوں

چھ رہا ہوں انجانے انداز کے ساتھ
جھ سے تیرا ہی مفہوم نہ جانے کیوں

دل کرے یا اب کوئی احسان کرے
ے کو رہنا ہے مظلوم نہ جانے کیوں

بروں سے بھی تیرا اب تک باقی ہے
ب تعلق نا معلوم نہ جانے کیوں

تل جس کو ایک زمانہ کہتا ہے
س کی نظروں میں معصوم نہ جانے کیوں

دے سے بیچ کو دنیا جوہر کہتی ہے
ں اُس نام سے ہوں موسوم نہ جانے کیوں

دل میں تپش و سوزِ تمنا بھی نہیں
لب پر کوئی بیدار تقاضا بھی نہیں

جی بھر کے ابھی آپ کو دیکھا بھی نہیں
آنکھوں نے جو کھایا ہے وہ دھوکا بھی نہیں

معلوم ہے اب تک نگہِ شوق مری
میں واقفِ آدابِ تماشا بھی نہیں

پھر دل میں ہے برباد بگولوں کا ہجوم
اس دشت میں رعنائیِ صحرا بھی نہیں

"پھر گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا"
قطرہ بھی نہیں آنکھ میں دریا بھی نہیں

ہر چند نہیں تجھ سا زمانے میں کوئی
اس دور میں لیکن کوئی ہم سا بھی نہیں

کس سمت گیا جوہر بیتابیِ شوق
اب دل کو تڑپنے کا سلیقہ بھی نہیں

غلام جیلانی اصغر

چاند کی ارتھی تارے لے کر صبح سے جب گھر جائیں گے
میرے سارے نرمل سپنے، مجھ کو واپس کر جائیں گے

تُو تو بھول چکا بھی ہوگا، اُن راتوں اُن باتوں کو
زہر بھرے جگراتے لیکن میری آنکھیں بھر جائیں گے

ہجر کا موسم یوں گزرے گا، جیسے پچھلا ساون گزرا
آنکھوں کے تالاب، تتلیاں سب کو جل تھل کر جائیں گے

دل میں جب تک امیدیں ہیں، جینا سہل لگے ہے کتنا
جب امیدیں مر جائیں گی، ہم بھی شاید مر جائیں گے

ہم نے اپنے آپ سے چھپ کر دن تو اصغرؔ کاٹ دیا ہے
اپنے سارے دُکھ سہنے کو شام ہوئی تو گھر جائیں گے

ایک اجنبی چہرے سے ملاقات

اُس کے ہونٹوں کی خفی سی مسکراہٹ
کتنے اچھے موسموں کا، خوش دنوں کا
تذکرہ کرتی رہی

میری آنکھوں کے دریچوں کو
ہوا سے، روشنی سے، رنگ سے بھرتی رہی

اُس کے گالوں سے پھسلتی چاندنی
سرف میں جیسے دُھلا ہو پیرہن

یا چنبیلی ـ موتیا ـ چمپا کا،
اک کھلتا چمن!

اُس کی آنکھوں کی وہ نیلاہٹ
دُور تک جیسے سمندر میں گُھلا ہو نیلا رنگ

آسماں نکھرا ہوا بارش کے بعد،

یا کوئی ایسا ہی رنگ، ایک نامعلوم رنگ

اُس کے سب یہ روپ ہیں
یا سب میری آنکھوں کے رنگ؟

ابوالفطرت میر زیدی

دیتے ہیں سبھی لوگ حوالے دل کے !
ہے کوئی جو طوفان سنبھالے دل کے

ہم گوشہ نشینوں کو نہ چھیڑو صاحب
ورنہ ابھی پڑ جائیں گے لالے دل کے

اچھا ہوا تم نے بھی نہ مانی دل کی
ہم نے بھی تقاضے کئی ٹالے دل کے

زیدی نے زباں اپنی ہلائی نہیں اب تک
اور چھوڑ لئے آپ نے چھالے دل کے !

فوق لدھیانوی

وہ حسیں بھی ہے دلربا بھی ہے
دوستو درد آشنا بھی ہے

میں نہیں دل، کسی کا ہو جاؤں
ذہن ہوں ذہن سوچتا بھی ہے

دوستوں سے خلوص رکھتا ہوں
دوستوں سے مگر گلا بھی ہے

یہ جہاں خیر و شر کا سنگم ہے
کوئی اچھا کوئی برا بھی ہے

زندگی اک لطیف شے ہی سہی
عرصۂ صبر آزما بھی ہے

تو ہی مجرم نہیں فقط تنہا
حسن والے مری خطا بھی ہے

ایک مفہوم ہے انا گیری
ایک مفہوم التجا بھی ہے

اُس کی عادت بھی کچھ عجیب سی ہے
مجھ سے راضی بھی ہے خفا بھی ہے

سارے اندیشے نہیں یہاں لے فوق
جس کی آنکھیں ہیں دیکھتا بھی ہے

رفعت سلطان

عظمتِ اوجِ دار بھول گئے
زندگی کیا ہے، یار بھول گئے

اپنے بے نور گھر جو یاد آئے
لوگ جشنِ بہار بھول گئے

جبر ناپائدار ہوتا ہے
صاحبِ اختیار بھول گئے

میرا قاتل تو میرا بھائی تھا
جانے کیوں میرے یار بھول گئے

وقت آیا ہے وہ کہ اہلِ ہنر
اپنے سب شاہکار بھول گئے

میرا غم کائنات کا غم ہے
یہ مرے غمگسار بھول گئے

زرد چہروں کو دیکھ کر رفعت
ذکرِ رخسارِ یار بھول گئے

پرتو روہیلہ

ڈھلتی رات کہاں جاؤ گے بتلاؤ بابا
بھور پھٹے تک اس کٹیا میں سو جاؤ بابا

میرے پیار بچھونے کی سی میٹھی میٹھی تپ
ساری دنیا گھومو تب بھی نا پاؤ بابا

لمحے لمحے جینے والے کل کو کیا جانیں
میری مانو آج یہیں پر رہ جاؤ بابا

جیون میلے میں بچھڑ جائے کب مل پائیں ہم
ہاتھ چھڑا کر اتنی جلدی مت جاؤ بابا

اس ضدی بالک نے خوں رلوایا جیون بھر
چندا مکھ والو کچھ تم ہی بہلاؤ بابا

یادوں کی پروائی اندر کیسے رِستے ہیں
آشا کے چھالے محرومی کے گھاؤ بابا

کس نے کھینچی ہے جو پرتوؔ تم کھیو گے
اشکوں کی ندیا میں کاغذ کی ناؤ بابا

پرتو روہیلہ

برہا

۱۔ سوچ تو کیوں ندی مچلے رہ رہ کیوں بل کھائے
جس ساگر سے بچھڑی اس سے ملنے بھاگی جائے

۲۔ ساگر رہ رہ ٹھاٹھیں مارے پھینکے چاند پہ جال
میں برہن کچھ ایسی بچھڑی بن گئی گھاؤں کی تال

۳۔ کھاد بنا کر ڈالے مجھ کو مالی تیرے تھالے
جس برگد کی ٹہنی تھی میں اپنے انگ لگا لے

۴۔ برہا پیڑ سے ہر پل مچلے تڑپے اور چلائے
برگد سے جو ٹہنی ٹوٹی پیڑ سے کب مل پائے

۵۔ پل پل تیری چاپ سنوں میں من مسوس رہ جاؤں
پانچوں رستے بند ہیں ساجن کیسے باہر آؤں

۶۔ تیرے انگ سے لگنے لاگوں بیچوں تن آ جائے
میں وہ مورکھ جس کو ساجن اپنا آپ ہی کھائے

۷۔ برہ میں تیری یاد کو اپنے من میں لاکھ بساؤں
تیرے بنا یہ جیون سانول جیسے اجڑا گاؤں

بریگیڈیئر جنرل ڈاکٹر محمود الحسن

جان دینے پہ جو آمادہ نہیں
وہ یقیناً تیرا دلدادہ نہیں

کیوں نہ اہلِ کارواں ہوں ناامید
سامنے منزل، مگر جادہ نہیں

وہ نہ پائے گا کبھی تسکینِ جاں
آپ کے در پہ جو اُفتادہ نہیں

ایسے میخانے بہت آباد ہیں،
جن میں ساقی ہے مگر بادہ نہیں

اُن کی محفل میں سبھی موجود ہیں
ہاں فقط اک دُور اُفتادہ نہیں

سادگی واعظ کی دھوکا دے گئی
ہے، مگر اتنا بھی وہ سادہ نہیں

اُن سے اے محمود کیا کہیے جو لوگ
بات سننے پر بھی آمادہ نہیں،

صحرا کی ہے تلاش نہ گلزار چاہیے
ہم عاشقوں کو کوچہ دلدار چاہیے

سمجھوں گا میں کہ دولتِ کونین مل گئی
پروردگار مجھ کو غمِ یار چاہیے،

درمانِ غم نہیں نہ سہی موت ہی سہی
کچھ تو علاجِ خاطرِ بیمار چاہیے

آ کر ملے گی منزلِ مقصود خود بخود،
اے رہ نوردِ برق کی رفتار چاہیے

ہیں اہلِ قافلہ تو بہت مستعد مگر
اس قافلے کو قافلہ سالار چاہیے

وہ جاں کہ ہو جو سوزِ محبت سے بہرہ ور
وہ دل کہ جو ہو مہبطِ انوار چاہیے،

ہم تجھ کو چاہتے ہیں مگر شیخ و برہمن
کہتے ہیں اُن کو سبحہ و زنار چاہیے

میجر جنرل ڈاکٹر محمود الحسن

اُن کے کوچہ میں نہ کیوں جا کے صدا دی جائے
مجھ کو نا کردہ گناہوں کی سزا دی جائے

دل میں اک جوت محبّت کی جگا دی جائے
اور پھر زیست کی ہر شمع بجھا دی جائے

اب ہے لے دے کے یہی تیرگیٔ غم کا علاج
غم کے چہرہ کو تبسّم کی ضیا دی جائے،

جس نشیمن میں میسّر نہ ہو پل بھر آرام ،
اس نشیمن کو نہ کیوں آگ لگا دی جائے

پہلے اِک شعلۂ اُلفت ہو فروزاں دل میں
پھر اُسے آپ کے دامن کی ہوا دی جائے

پھر سکھایئں دلِ مضطر کو وفا کے آداب
پھر اُسے دعوتِ تسلیم و رضا دی جائے

دیکھ لوں میں بھی ذرا اہلِ ہوس کا انجام
اتنی مہلت تو مجھے میرے خدا دی جائے

میرے آقا نے یہی درس دیا ہے مجھ کو
گالیاں کھا کے بھی دشمن کو دعا دی جائے

خم اُس کی بارگاہ میں جس کی جبیں نہیں
اُس بندۂ خدا کو خدا پر یقیں نہیں

مانو تو یار ہے رگِ جاں سے قریب تر
ڈھونڈو تو کائنات کے اندر کہیں نہیں

سر ہے مزارِ عشق جنوں سے ہے گر تہی
دل ہے مثالِ سنگ اگر وہ حزیں نہیں

وہ تمکنت جو تیرے گدا کو نصیب ہے
شاہوں کا اقتدار بھی اس کے قریں نہیں

کیا وہ بشر بھی لائقِ تعظیم ہے بھلا !
جس کی کمندِ شوق میں عرشِ بریں نہیں

دُنیا میں آپ سب سے زیادہ ہیں خوبرو
دُنیا میں کوئی آپ سے بڑھ کر حسیں نہیں

تیرے بغیر رُوح کو تسکیں غلط غلط
تیرے سوا کسی سے محبّت نہیں نہیں

محمودؔ کچھ نہ پوچھ محبّت کی تلخیاں،
یہ جا بجا فروزاں آگ تو ہے آبگیں نہیں،

سید عطا حسین کلیم

چہرے (زیرِ ترتیب مجموعہ)

سید عطا حسین کلیم نے اپنے ادیب دوستوں کو خلوص و محبت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اس کا عکس شعر و سخن کے آئینے میں قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ان قطعات میں نقد و نظر کی چاشنی بھی ہے اور دوستوں کی محبت کا نور بھی۔ آپ بھی دیکھئے۔ (ادارہ)

عزیز ملک

کبھی عزیز ملک پرنیاں، کبھی فولاد مثالِ شبنم و آہن ہیں اس کی تحریریں
سکندرانہ ادائیں، قلندرانہ جلال ادیب بھی ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں

ہے بزم بزم کو علم اس کا شمعِ راہِ ادب اُفق اُفق کو سجاتا ہے جو سحر کی طرح
یہ شہرِ علم کا حاتم ہے جو کھلے ہاتھوں گُہر ادب کے لٹاتا ہے سیم و زر کی طرح

کمالِ جاہ و حشم ہو کہ دولتِ دنیا جہاں میں علم سے بڑھ کر تو کوئی چیز نہیں
یہ شہریارِ ادب بے نیازِ دنیا ہے اسے ہُنر کے سوا اور کچھ عزیز نہیں

ادب میں حسنِ عقیدت سے یہ مقام ملا — عزیز وصفِ علیؑ و بتولؑ لکھتا ہے
دل و زبان و دماغ و قلم کا یہ مومن — ادب برائے خدا و رسولؐ لکھتا ہے

نثار طرزِ نگارش پہ نوبہارِ ادب — عزیز حلقۂ یاراں ہے شہریارِ ادب
ہُنر سے اس کے ہے روشن چراغِ عظمتِ فن — فدا ہے اس کی اداؤں پہ خود نگارِ ادب

شفیع منصور

ادیب خوار تھے زلفِ ادب تھی ژولیدہ — کمالِ فن سے جسے تو سنوارتا ہی رہا
کئی ادیب شکارِ ہوس ہوئے لیکن — تو اپنی دھن میں انا الحق پکارتا ہی رہا

ملا انہیں کو شبلی، تجھے جو مل جاتا — ترا سخن بھی چمن زارِ بے خزاں ہوتا
ترے کلام کی جنّت سدا سجی رہتی — ہر ایک نقش ترا نقشِ جاوداں ہوتا

ترا کلام درخشاں کمالِ فن سے ہوا — تو باکمال بھی ہے اور خوش مزاج بھی ہے
بٹھائیں کیوں نہ سرآنکھوں پہ تجھ کو اہلِ نظر — کہ تیرے سر پہ جہانِ سخن کا تاج بھی ہے

تیری ادا ادا میں ہے خود آگہی کا روپ — صدق و صفا کا نور تری بات بات میں
ہے سوز تیرے دل میں وفا ہے خلوص ہے — کیا وصف آشکار ہوئے تیری ذات میں

لبِ شیریں محبت سے شکر ریز — نگاہیں کیف و مستی سے بھرا بود
زمانہ مصلحت کا ہے و لیکن — انا الحق آج بھی کہتا ہے منصورؔ

پروین فنا سیّد

لہو سرخرو ہے۔!

میری مٹی ۔۔!
جو میرے لہو میں رواں ہے
امانت ہے اجداد کی
ایک اِک اینٹ پر ثبت ہیں
میرے سجدوں کے گہرے نشاں
ذرّے ذرّے کو روشن بناتا ہوا
میری نسلوں کا تازہ لہو
آج بھی سرخرو ہے ۔۔!
کہ میں نے
صداقت کا زہراب پی کر
عَلم تھام کر
سر ہتھیلی پہ رکھ کر
عدو کے مقابل
فقط اپنے ایقان کی قوتوں پر
بھروسہ کیا ہے
یہ مہتاب کی نرم کرنوں کو
قدموں تلے روندتے
میری مٹی سے تازہ ابھرتی ہوئی نرم کونپل کو
کیا روند پائیں گے
اگر آج تیرہ نصیبوں کی تقدیر بن کر
ہر اِک حرفِ حق کو مٹانے کے درپے
یہ ہر سچ سے آنکھیں چُرا کر گزر جانے والے
کبھی وقت کی گردشوں میں
کہانی لکھی جائے گی
حرفِ حق کی
تو میرا لہو
ذرّے ذرّے میں میرا دھڑکتا لہو
بول اُٹھے گا

سیف علی

پہلے تو اک سر پھرا دیوانہ تنہا جل گیا
آتشِ خاموش میں پھر شہر سارا جل گیا

تیرا سایہ تھا تو چاروں سمت ٹھنڈی چھاؤں تھی
پھر ہوا ایسی چلی کہ تیرا سایا جل گیا

بند ہے تشنہ لبوں پر آج بھی آبِ فرات
آج بھی صحرا میں جو گاڑا تھا خیمہ جل گیا

آگ کے شعلے اٹھے دھرتی کے سوکھے جسم سے
رات بادل اس طرح برسے کہ جو تھا جل گیا

آنکھ ہے اب صورتِ صحرائے بے آب و گیاہ
آگ پانی میں لگی ایسی کہ دریا جل گیا

سرخیٔ رخسار کا شعلہ بڑا بے باک تھا
لب پہ آ کر میرا اظہارِ تمنا جل گیا

کون سا منظر نظر کے سامنے پھرتا ہے سیفؔ
میری آنکھیں بجھ گئیں میرا کلیجہ جل گیا

حنیف فوق

ذرہ ذرہ کی عجب انجمن آرائی ہے —!
شش جہت صورتِ آئینہ تماشائی ہے

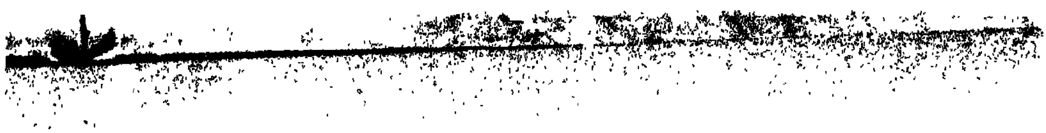
ایک ہی حرفِ تمنا کی یہ گیرائی ہے
وسعتِ چرخِ بریں دامِ تمنائی ہے

شب کی تاریک خموشی کا تو لوٹتا ہے فسوں
اک صدا گونجی ہے، اک برق سی لہرائی ہے

شیوۂ چاکِ گریباں ہے نہ رسمِ زنجیر
دشت و زنداں کی خموشی بھی تو رسوائی ہے

سینہ چاکانِ چمن شق ہوئی دیوارِ چمن
ہو نہ ہو فصلِ بہاراں کی پذیرائی ہے

ابر پاروں سے بھٹکنے کی حکایت نہ سنو
جاگتے تاروں سے پوچھو کبھی نیند آئی ہے



قیصر قلندر

کنارِ آبِ خاموشی.....!

کنارِ آبِ خاموشی
نہ جانے کتنی صدیوں سے کھڑا ہوں
شکستہ ساعتوں
فرحت فزا گھڑیوں
زندہ لمحوں کی ردا اوڑھے
فکروں کے سہارے
بیتی یادوں کا عصا تھامے
آنے والے مرحلوں کی گھورتی شکلیں
مرے افکار کو گھیرے ہیں لینے کے لئے ہیکل
صنور کی کیفیت ہے میرے اندر !
سکون آمیز ہے کتنے برس سے جھیل کا پانی
کنارِ آبِ خاموشی ! ؟

یہ سطحِ آب پر مرغابیاں بے فکر ہو کر تیرتی جاتی ہیں
شکارے سینۂ آبِ خموشی چیر کر
منزلِ مقصود کی جانب رواں ہیں
ان گنت لرزش بکف لہریں
کنارے چوم کر پھر لوٹ جاتی ہیں
سکوں کو مرتعش موجیں بہت سنجیدہ کرتی ہیں

شکستہ ساعتیں کیا ہیں ؟
وہ جب رعنائیاں پیراہنوں میں جلوہ دکھلاتیں
دریدہ گرد خوردہ اپنے کپڑوں پر نظر جاتی
جمالِ جسم و پیراہن نشاط انگیزیاں کرتا
میں اپنی نارسا خواہش کی تہہ میں ڈوب جاتا تھا
مہک کی تازہ دم دیوی خرامیدہ چلی آتی
دہکتی بھوک میرے جسم و جاں کو بھسم کر دیتی
فلک کی نیلمی دنیا میں اُگ آتے مہ و انجم
تو زخموں کے لئے مرہم فلک لاتا نہ شب لاتی
ہوائیں زمزموں کے دوش پر آنگن تلک آتیں
دریچے، بام و در، دیوار، نوحے پھونک دیتے تھے !
لبِ غنچہ سے شبنم تازگی لاتی تبسم کی.
اچانک زردیاں موسم کی بے مہری کی لہرائیں
ہجومِ ہوشاں، شگفتہ گلرنگوں کے عالم میں
میرے ہاتھوں سے نازک فکر کی زنجیر کٹ جاتی ـــ
گھوڑے کے سہارے لوریاں جھولا جھلاتی ماں
تو نومولود فریادوں کے سینے میں چھپا دیتا.
سحر آتی تو شب کی تیرگی کافور ہو جاتی
تمازت جستجو کے بیکراں صحرا کی ڈس لیتی !

شکستہ ساعتوں کے کارواں فریاد کرتے ہیں !
کنارِ آبِ خاموشی
یہ ہیجاں خیزیاں کیا ہیں

چلو فرحت فزا گھڑیوں کی کوئی بات ہو جائے !
وہ اِک حساس آہٹ دل کے پردوں کو جو چھو آتی۔
نہ جانے کتنی خوشبوؤں کے پیمانے چھلک اٹھے ·
ہر اِک تارِ نفس میں روپ کے سنگیت کے سرگم
مجسم گُل کی صورت حرفِ شیریں بن کے نکلے ہیں
وہ اثر و دھان کے پودے، مرادوں کی وہ تصویریں
ثمر وہ عرق ریزی کے نشاں وہ عزمِ پیہم کے
ہوا جب چھیڑتی ہے سرسراتے گیت بجتے ہیں
بڑی آسودگی کی روشنی پھر پھیل جاتی ہے
نکھرتے تیرتے بادل کی چھلنی سے ٹپکتے ہیں
عجب دوشیزہ رنگوں کے طلائی ابرتی جلوے !
زمیں کے ریشے ریشے سے لہو صورت مہک اٹھتی
درختوں سے ستاروں تک طلسمی کیفیت طاری
دھنک کے سات رنگوں کی کماں تھامے
کنارِ آبِ خاموشی
کھڑا ہوں !

آنے والے وقت سے دل کانپ جاتا ہے

تمنا کی ہری وادی کا کیا ہوگا ؟
خنک بادِ صبا وہ صبحِ فردا کی
مگر وہ سرد خوشبو آمے وا لے سخت لمحوں کی
صلیبیں مصلحت کی گھر سے ایوانِ حکومت تک
کھڑی کر دی گئی ہیں اس ارادے سے
کہ ان پر حوصلوں کے سب مسیحاؤں کو لٹکا دیں
اگر تارِ نفس کے ٹوٹنے میں کچھ درنگی ہو
تو سنگ و آہن و آتش کے ڈھیروں میں ہی دفنا دیں
نگاہِ عقل کو خیرہ کیئے جانے کی اسکیمیں
دلوں سے نرم گرمی چھیننے کی سازشیں جاری
مصیبت آسمانوں سے مگر نازل نہیں ہوتی !
ہوس کے عالمِ بالا میں اس کی کاشت ہوتی ہے
میرے معصوم ارمانو، تمہارا حال کیا ہوگا ؟
میری سرسبز اُمیدوں کے مستقبل کا کیا ہوگا ؟
کنارِ آبِ خاموشی
مجھے اب آنے والے مرحلوں کی گھورتی شکلیں
ڈراتی ہیں کہ ان کی آتشیں آنکھیں
ہوا اور آگ کی دنیا کے شعلوں کو جگاتی ہیں !
کنارِ آبِ خاموشی
مجھے اپنے سکوں آثار پہلو میں چھپا لینا۔

سید مظفر حسین رزمی

سوزِ الفت کی کہانی سیکھو — اور بہ ہنگامِ جوانی سیکھو
چاندنی رات کا احساسِ جمال — حسن والوں کی زبانی سیکھو
کیسے اُڑ جاتی ہے خوشبو پل میں — موسمِ گل کی زبانی سیکھو
لمحے آغاز بھی انجام بھی ہیں — انہی لمحوں سے روانی سیکھو
ذات کے خول سے باہر نکلو — وقت سے ریشہ دوانی سیکھو
آئینہ خانوں سے باہر آؤ — اور اندازِ زمانی سیکھو
کشتِ ویراں میں مطالب ڈھونڈو — خشک پتوں سے معانی سیکھو
کچھ جو لکھا ہے تو چہروں کو پڑھو — اُن سے پھر شیوۂ بیانی سیکھو
چوٹ لگتی ہے تو برداشت کرو — خاک سے لالہ فشانی سیکھو
کیوں مرو پھوڑ کے دیوار سے سر — کیوں روایت کی کہانی سیکھو
عزم و ہمت سے مسائل کتنے — کیسے ہو جاتے ہیں پانی سیکھو
جو صحیفے ہیں زمانے کے لئے — اُن سے عظمت کی نشانی سیکھو

چپ رہو ٹھہر انا میں رزمی
بے زبانی سے زبانی سیکھو

شفیق ہاشمی

سرِ شاخِ تمنّا

مرے مُنّے
ابھی گھر میں رہو
باہر نہیں کھیلو
ٹریفک تیز ہے
کاریں سڑک پر دندناتی مست ہاتھی کی طرح
آ جا رہی ہیں
اور کسی ہاتھی کو کیا معلوم
کتنی چاہتوں سے
کتنے ارمانوں، تمناؤں سے
شاخِ آرزو پر پھول کھلتا ہے — !

ٹریفک تھم بھی جائے تو
تمہیں حسّان کیا معلوم
سڑکوں پر
کسی سنسان گوشے میں
گلی کوچوں میں
یا مصروف چوراہوں پہ
بچوں کے لئے
کیا کیا بلائیں
کیسی کیسی آفتیں
پنجے دبائے گھات میں تیار بیٹھی ہیں

مگر گھر سے تمہیں باہر تو جانا ہے
کہ پابستہ نسیمِ خوش ادا ہو کیسے ممکن
نہیں ہے آشیانہ طائرِ آزاد کی دنیا
مسافر بیٹھ جائے تھک کے خیمے میں تو منزل
تو پھر بے خوف جاؤ میرے بیٹے اور باہر
جہاں تم جیسے ننھے پھول سے بچے
تمہارے ہم نفس
ماؤں کے اپنی لاڈلے
باپوں کے شہزادے
نمو کی فصل کا مژدہ
نئی رت کی بشارت بن کے
ہر جانب فروزاں ہیں — !

ید احمد فائق

کیسے جشنِ طرب منائیں خوں آشام زمینوں پر
بے ہنگم تحریر لہو کی لکھی چاند جبینوں پر

کتنی نسلیں چاٹ چکا آسیب بلند مکانوں کا
کتنے پتھر برس چکے ہیں صبر شعار مکینوں پر

ہر اک فرد پہ لرزہ طاری خوف اَن دیکھے خوابوں کا
سانس کی ڈوری اٹکی جیسی گِنے چُنے تخمینوں پر

آنے والے موسم اوڑھیں شال بسمل ہریالی کی
پیڑوں نے پت جھڑ کے سارے وار سہے ہیں سینوں پر

خوشبو خوشبو تیر رہا تھا کنول مہکتی یادوں کا
شبنم شبنم اترا کوئی میرے دل کے زینوں پر

راسخ عرفانی

غم کے پتوں پہ رہ گئی شبنم
کیسا بدلا ہے ناگہاں موسم

خوں کا بیوپار پیٹ کی خاطر
روگ جاں کا ہے مفلسی کا غم

بن گھٹا کے برس پڑی برکھا
آنکھ یوں بھی ہوئی کبھی پُرنم

ہم فقیروں کو کیا غرض اس سے
کاسۂ خاک ہو کہ جامِ جم

عمر بھر ہم نے ایڑیاں رگڑیں
کوئی پھوٹا نہ چشمۂ زمزم

منزلوں سے رہی وہی دوری
گرچہ برسوں رہے سفر میں ہم

یوں کھنچاؤ رگوں میں ہے راسخ
روح جیسے بدن سے ہو برہم

وفا براہی

عہدِ خزاں میں سوتے بیاباں کبھی کبھی
جاتے ہیں رقص کرتے غزالاں کبھی کبھی

کیوں گلشنِ بہار کی تزئین کے لئے
ہو طائرِ نگاہ پر افشاں کبھی کبھی

ایسے بھی کچھ مقام ملے راہِ شوق میں
چشمے اُبل پڑے سرِ مژگاں کبھی کبھی

تارِ نظر حجابِ تمنا نہ بن سکا
دیکھا ہے میں نے حسن کو عریاں کبھی کبھی

کوئی مجھے بتائے فضائے بسیط میں
کیا ڈھونڈتا ہے دردِ پریشاں کبھی کبھی

احساس ناتمام کی تکمیل کے لئے
کھلتا ہے خود بخود درِ زنداں کبھی کبھی

فصلِ بہارِ نو کی لطافت کو جانچنے
جانا پڑے گا مجھ کو بیاباں کبھی کبھی

تاریکیٔ حیات سے گھبرا کے اے وفاؔ
دل ڈھونڈتا ہے مشعلِ عرفاں کبھی کبھی

چانگ شی شوئن عالم

چینی اور پاکستانی عوام کے روابط صرف زبانی حد تک نہیں ہیں بلکہ یہ روابط دلوں کی گہرائیوں میں بھی موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی اور چینی دانشور، شاعر اور ادیب ادبی اور ثقافتی طور پر بھی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ چینی شاعر لوہسون نے تو بابائے قوم قائدِ اعظم محمد علی جناح کو منظوم خراجِ عقیدت بھی پیش کیا تھا۔ آج کل "چین باتصویر" کے ادارتی شاف کے ایک رُکن چانگ شی شوئن اردو زبان و ادب کی تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں اسلام آباد میں مقیم ہیں۔ وہ اردو زبان و ادب کے مزاج داں ہیں اور اردو میں شاعری بھی کرتے ہیں وہ عالم تخلص کرتے ہیں انہوں نے پاکستان کے یومِ آزادی کے موقع پر منعقدہ سی۔ ڈی۔ اے کے مشاعرے میں ایک اردو غزل پڑھی جو قارئین "نیرنگِ خیال" کی نذر ہے

—— ادارہ ——

نہیں ہے شاخ مگر خوابِ آشیاں تو ہے
زمیں نصیب نہیں خواہشِ مکاں تو ہے

جو گل بہار میں بے فکر کھل رہے ہیں یوں
انہیں خبر ہی نہیں سامنے خزاں تو ہے

دلِ غریب میں جھانکو تو پیار کے پیاسو
کہ اس میں درد کا اک بحرِ بیکراں تو ہے

وہ بے نیاز کبھی روز دیکھ لے شاید
دلِ اسیر پہ اک بے نشاں نشاں تو ہے

ہوا نے مجھ کو دیے آہٹوں کے دھوکے بہت
کبھی کے آنے کا لیکن کوئی گماں تو ہے

یہی بہت ہے غنیمت ضمیرِ لرزاں میں
اگرچہ آج کی یہ زندگی گراں تو ہے

زباں کے زور سے مجھ کو ہرانے والے سُن
کہ لگ رہا ہے خموشی بھی اک زباں تو ہے

جو ماہتاب نہیں تو شہاب بن عالم
مدام ٹوٹتا رہتا ہے ضو فشاں تو ہے

شوکت ہاشمی

لفظ کی سچائی کا ادراک برسوں میں ہوا
جب ہُوا الہام سے بھرپور لمحوں میں ہوا

ڈھونڈ لائی میری پاگل سوچ روشن شہر بھی
ایک یہ بھی واقعہ پُرہول راتوں میں ہوا

جبر کے موسم میں سچّی شاعری کا حوصلہ
سایۂ اسمِ محمّدؐ کی پناہوں میں ہوا

درد موسم کی اذیّت میں گھری مخلوق کو
زندگی سے عشق میرے سبز خوابوں میں ہوا

اے زمیں تجھ پر کوئی آتش فشاں پھٹ کر گرے
روشنی کا قتلِ ناحق تیرے شہروں میں ہوا

اِک کھلے شاداب منظر اِک نئے موسم کا کشف
ہاشمیؔ مجھ پر غزل لکھنے کے لمحوں میں ہوا

مرے لہو کی تمازت ہے اور اکیلا میں
اندھیری شب کی مسافت ہے اور اکیلا میں

مرے قبیلے میں بھی سچ کا قتل ہوتا ہے
وہی پرانی روایت ہے اور اکیلا میں

نئے شعور کا احساس مجھ میں زندہ ہے
زمانے بھر کی ملامت ہے اور اکیلا میں

میں اپنی جنگ میں ناکام ہو نہیں سکتا
مرے خیال کی طاقت ہے اور اکیلا میں

تلاش کا یہ سفر اتنا سہل بھی تو نہیں
کوئی بَلا کوئی دہشت ہے اور اکیلا میں

مری غزل یہ مرا فن یہ شاعری شوکتؔ
نئے دنوں کی بشارت ہے اور اکیلا میں

شوکت ہاشمی

اِک نئی خوشبو ہوا تازہ نیا منظر گلاب
خواب میں بھی دیکھتا رہتا ہوں میں اکثر گلاب

ایک مدت سے ہے میری روح کچھ شاداب سی
ایسا لگتا ہے مہکتے ہیں میرے اندر گلاب

اِک پُرانی نسل کے برگد اکھڑنے چاہئیں
آنے والے موسموں میں تو کھلیں گھر گھر گلاب

اس کا اظہارِ محبت بھی تھا کتنا دلنشیں
رکھ گیا سوتے میں اک دن میرے ہونٹوں پر گلاب

جب تمہارے شہر میں آئیں بہاریں ہاشمیؔ
لڑکیوں میں بانٹ دینا جھولیاں بھر بھر گلاب

شاعر تھا مرا رُخ درِ ابجد کی طرف تھا
میں اپنی طبیعت میں محمدؐ کی طرف تھا

اِک کھیل تھا اور رنگ زمانہ مرے نزدیک
سرمد کی طرح تھا میں ہاں سرمد کی طرف تھا

شب زاد روایت تو نہیں میری روایت
سورج میرے ادراک کی سرحد کی طرف تھا

اے حاکمِ کم ظرف مجھے سخت سزا دے
ہاں ہاتھ مرا بھی تری مسند کی طرف تھا

کل شب تھا چمکتا ہوا موسم مرے گھر میں
میں سبز چمکتے ہوئے گنبد کی طرف تھا

سچ بولنا شوکتؔ کو تو دشوار نہیں ہے
ظالم تو کسی اور ہی مقصد کی طرف تھا

شوکت ہاشمی

اپنی گم گشتہ محبت کے لئے زندہ ہوں میں
جانے کب آجائے گا وہ جاگتا رہتا ہوں میں

کہہ گیا تھا وہ کہ میں ہنستا رہوں ہنستا رہا
اس کی خواہش تھی کہ میں زندہ رہوں زندہ ہوں میں

میرے ہونٹوں سے لگا کر ہونٹ مجھ میں ڈوب جا
تو مجھے سیراب کر اک عمر کا پیاسا ہوں میں

اپنی حیرت سے نکل جی بھر کے مجھ کو چوم لے
لمحے بھر کو پھر تری دہلیز پہ آیا ہوں میں

اس زمیں پہ زردیوں اور سرخیوں کے درمیاں
ایک موسم میرا بھی ہے جس میں لہراتا ہوں میں

ٹوٹ جائیں گی فصیلِ شب! تری ساری حدیں
نقطے کے اندھے بدن میں روشنی بوتا ہوں میں

سہما سہما سا وہ لمحہ اس کے پہلے لمس کا
ہاشمی برسوں سے اس کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں

میں اپنے خواب میں زندہ ہوں اپنے گھر میں رہتا ہوں
کھلے منظر کا شاعر ہوں کھلے منظر میں رہتا ہوں

جو سچے حرف لکھتا ہے انوکھے شعر کہتا ہے
میں اس اک ناپیمبر شخص کے پیکر میں رہتا ہوں

مجھے تو شہر بھر میں روشنی پھیلائے رکھنا ہے
چمکتی خواہشوں کے خانۂ صد در میں رہتا ہوں

نہیں ہے فرق کوئی میرے ظاہر میرے باطن میں
نمو کا رنگ ہوں اور خاک کے پیکر میں رہتا ہوں

مجھے محسوس و نامحسوس رشتے سب برابر ہیں
ہوا ہوں اور مکانِ بے فصیل و در میں رہتا ہوں

جہاں کے لوگ سچ کے قتل پہ ایمان رکھتے ہیں
مجھے دیکھو میں اس شہرِ ستم پرور میں رہتا ہوں

ملازم آدمی ہوں اور سب سے مختلف شوکت
میں یا دفتر میں رہتا ہوں یا اپنے گھر میں رہتا ہوں

ابرار احمد

تھکن زدہ امانت کی واپسی

دور تک پھیلے آفاق میں سنسناتی ہوا؟

تیری سانسوں کی چاہت میں ہے ۔

تو میری سانس کیوں کھینچنا چاہتا ہے ؟

اجنبی ۔!

میں نے تاریک گلیوں میں

برفیلے لمحوں کو

آنکھوں سے چھوتے ہوئے

عمر جھیلی ہے ۔

مری آنکھ نم ۔ نیند ہی زندگی ہے یہاں۔

اجنبی !

یوں ہوائیں ۔ نمی سے اُڑیں گی

تو مری آنکھ میں تیرتے خواب ۔

پلکوں سے چن لے

کہ میں یہ امانت

بہت دیر تک تھام سکتا نہیں ۔!

حجاب عباسی

تم سے بچھڑے صدیاں بیتیں آج تو خواب میں آ جاؤ نا
ترس گئے ہیں نین ہمارے ان کی پیاس بجھا جاؤ نا

ننھی ننھی کومل کلیاں پھول بنی ہیں گھر آنگن میں
بادِ سحر کا جھونکا بن کر تم ان کو مہکا جاؤ نا

ریزہ ریزہ ٹوٹ کے بکھری تنہائی کے صحراؤں میں
کون چنے گا ان کرچوں کو یہ آ کر بتلا جاؤ نا

کتنی گھڑیاں گن گن کاٹیں کتنے موسم بیت گئے ہیں
آنکھیں رستہ تک تک ہاریں آؤ اب تو آ جاؤ نا

جانے والے لوٹ کے آئیں دنیا کی یہ ریت نہیں ہے
ناداں دل کب کہنا مانے تم آ کر سمجھا جاؤ نا

اہلِ جہاں کی بات الگ ہے مجھ سے کوئی حجاب نہیں
جو کچھ دل پر بیت رہی ہے مجھ کو تو بتلا جاؤ نا

وزیری پانی پتی

شعاعِ اوّلیں

ظلمتوں کے مہیب سناٹے
ڈس چلے تھے دلوں کی تابانی!
حلقۂ کفر میں تھا مدّت سے
موِ حیرت خلوصِ ایمانی!

ایک صحرائے یاس تھا اور ہم
کوئی منزل، نہ کارواں کوئی
ولولے تھے نہ عزمِ مستحکم
جذبِ صادق نہ امتحاں کوئی

دفعتاً صبحِ آرزو کی کرن
مسکرانے لگی فضاؤں میں!
ایک تازہ گلاب کی خوشبو!
بس گئی دشت کی ہواؤں میں

حوصلوں میں کھلا شعور کا رنگ!
تیز تر ہو گئی حرارتِ دل!
چاندنی کھل گئی صداقت کی!
سامنے آ گئی نئی منزل!

گردِ خیال

ترا دیار ہے ملتاں مرا وطن تو نہیں
یہی فریبِ یقیں تجھ سے دور لے آیا
اسی خیال نے بھٹکا دیا ہے منزل سے
اسی ہوا نے بجھائے ہیں آرزو کے چراغ،
اسی اک آگ نے اکثر دھواں دیا دل سے

اسی شکست نے قربت کو فاصلے بخشے
تعلقات بھی اس سحر کو نہ توڑ سکے
مرا خلوص کہ تیری نگاہ کے تیور!
جہاں کی تند ہواؤں کا رُخ نہ موڑ سکے
اگرچہ دور بہت دور آ گیا تجھ سے!
بجھا بجھا ہوں مگر دل کے داغ روشن ہیں
مرا ضمیر سلامت کہ غم کے صحرا میں
کہیں کہیں پہ وفا کے چراغ روشن ہیں

مجھے یقیں ہے کہ زلفِ جہاں سنورنے تک
ترا خلوص، ترا پیار، تیری طرزِ وفا
مرے فریب کے ہر نقش کو مٹا دے گی
کہ پھر کبھی نہ یہ میری زباں پہ آئے گا
ترا دیار ہے ملتاں مرا وطن تو نہیں

عذرا وحید

چشمِ بینا

بہت دنوں کے اُجاڑ لمحے
گزر گزر کر ٹھٹک ٹھٹک کر
ڈرا رہے ہیں
ہزار راتیں کفن پہن کر
چراغ سے کر
گئے دنوں کے سراغ میں ہیں
تلاشِ خوابِ سراب میں ہیں
حقیقتوں کے عذاب میں ہیں
تمام نا معتبر ہوائیں
خزاں کے غم گود میں سمیٹے
بہار کی جستجو میں بوسیدہ پیڑ سے آنگن میں سرنگوں ہیں
اِدھر نہ دیکھو کہ جس نے دیکھا
وہ سنگ بن کر ابد کے اونچے مکاں کی چھت سے ٹنگا ہوا ہے
جو دیکھنا ہے تو آنکھ کھولو
وہ چشمِ بینا
جو روح کے بادلوں کے پانی سے دید کی تشنگی بجھائے
وہ آنکھ کھولو
جو دل کی شفاف روشنی سے
شبیں گلابوں کی پتیوں کو
پلک سے چھو کے امر بنا دے
نگاہ کو سرفراز کر دے
بیاض کو دل نواز کر دے

بازگشت

اے چارہ گرو کچھ چارہ گری بھی رسمِ کہن ہے بستی کی۔
یہ سچ ہے یہاں تپتی ہے زمیں
اور آگ فلک برساتا ہے
اور شاخوں پہ ادھ کھلے شگوفے خاک کی بھوک مٹاتے ہیں
یہاں رات ہے اک بے انت سفر
جو تھک کر گر جاتی ہے
تشنہ سے دنوں کے پہلو میں
دن اپنے دریچے کھولتا ہے
خوابوں کی اسی وادی میں جہاں
سبزے کی جگہ اُگتے ہیں شرر
اور دھوپ کی ملکہ ایک نویدِ درد و الم بن جاتی ہے
اور دور تلک شاخوں پہ شگوفے اُگتے ہیں تنہائی کے
پھر ہاتھ بیتے لمحے آتے ہیں
زخموں کی فصل اٹھانے کو
اور آنکھ کے چشمے پھوٹتے ہیں
اس کوہِ قدیم کے دامن سے
صدیوں پہلے جہاں چٹکی تھی
کسی شاخِ نمو پہ دل کی کلی
یہ سچ ہے دریدہ دامنی کا
اک کھیت اُگا ہے بستی میں
تم بھی تو رفوگر ہو کیسے
اے چارہ گرو کچھ چارہ گری [illegible] کسی ہے بستی کی

سحر صدیقی

خالی بٹوے میں خواب

رنگ، پانی، چاندنی سے جگمگاتے راستے
کونپلوں کی انگلیوں پہ برف کی
گنگناتے اور اٹھلاتے ہوئے لمحات کی باتوں کا عکس
دل کی دھڑکن
سر کی جنبش
چاپ کی لمحہ بہ لمحہ بنتی مٹتی اک لکیر
ایک چہرہ جس کے خد و خال کی پہچان اب ممکن نہیں

دھند میں لپٹے ہوئے دیوار و در
کھڑکیوں سے جھانکتے مدقوق چہروں کا علاج
ٹہنیوں سے ٹوٹتے پتوں کی آئندہ قطار
زرد مٹی کی خوراک۔!!

"حوصلہ دلانے والی ایک بات"

سیاہ رنگ کے بادل سمٹ گئے یارو،
بہت عجیب سی شاخیں ہیں اب درختوں کی
گریزاں دھوپ سے ہونے لگی ہے شام کی ذات
ہوا کے پاس تو فرصت نہیں ہے رکنے کی
اور اس سے بات تو صدیوں تلک نہیں ہوگی
چلو بکھرتے ہوئے پھول، پھل اٹھا لائیں
عجب نہیں کہ ملے یونہی موسموں کا سراغ
کسی بدن کا چراغ
میں ریزگی کا عمل بھی قبول کرتا ہوں
مجھے یقیں ہے
کبھی تو دشت میں آندھی کا بخت جاگے گا

احمد شریف

کیا مرضِ آشنا ملا ہم کو
زخم کاری لگا گیا ہم کو

کھل گیا اس کی سادگی کا بھرم
یوں تکلف سے وہ ملا ہم کو

ہم کو تو رہبروں نے لوٹا ہے
رہزنوں سے نہیں گلہ ہم کو

کیوں کیا ادعائے عہدِ وفا
یہی دینا تھا گر صلہ ہم کو

کس وفا پہ ہوئے وہ چیں بہ جبیں
کس خطا کی ملی سزا ہم کو

ہم ہیں مونس سیاہ زلفوں کے
شبِ ہجراں نہ تو ڈرا ہم کو

احمد رئیس

اُڑتی خوشبو کو شجر ہم نے کیا
خود کو دریائے ہنر ہم نے کیا

پتھروں سے ہم نے مانگی روشنی
خشک دریا میں سفر ہم نے کیا

الجھنیں جب نت نئی پیدا ہوئیں
گفتگو کو مختصر ہم نے کیا

سب کے دروازے مقفل دیکھ کر
ختم خوابوں کا سفر ہم نے کیا

جو کہا وہ حرفِ آخر ہو گیا
خود کو کتنا معتبر ہم نے کیا

آپ کو یہ عظمتیں ہم نے ہی دیں
آپ کو افلاک پر ہم نے کیا

رُک گیا تھا زندگی کا کارواں
پھر سے آغازِ سفر ہم نے کیا

ریگ زاروں پر جلائیں مشعلیں
دشت کو خوشبو کا گھر ہم نے دیا

نجمی صدیقی

دل کشی اب وہ بام و در میں نہیں
کون ہے جو کسی سفر میں نہیں

آبگینوں میں بٹ گئی تصویر
تیری صورت بھی چشمِ تر میں نہیں

اپنی صورت دکھائی دے جس میں
آئینہ وہ کسی کے گھر میں نہیں

لئے پھرتے ہیں راہرو آس کو
شوقِ منزل کا راہبر میں نہیں

کون دے گا جواب دستک کا
شہر میں کوئی اپنے گھر میں نہیں

روز سورج وہی نکلتا ہے
کوئی جدت کسی سحر میں نہیں

تو نہیں تیرا انتظار نہیں
اور کیا عمرِ مختصر میں نہیں

پھیر لی اس نے بھی نظر نجمیؔ
اب یہ سودا بھی اپنے سر میں نہیں

شعورِ حسن دیا ہے تو بانکپن بھی دے
اجاڑ شاخوں کو پتوں کے پیرہن بھی دے

عطا ہوئی ہیں مجھے راحتیں محبت کی
اذیتیں مجھے دن رات میرا فن بھی دے

اٹھائے پھرتا ہوں کب سے میں یہ بدن کی صلیب
عذاب میں ہوں مجھے جرأتِ سخن بھی دے

ترے خیال کی آسودگی تو حاصل ہے
مگر یہ لطف کبھی تیری انجمن بھی دے

مکان کیا کہ جس میں کوئی چراغ جلے
جو دل دیا ہے تو احساس کی کرن بھی دے

میں صبح و شام اسی سوچ کے سفر میں ہوں
متاعِ عشق جو دی ہے تو راہزن بھی دے

میں اپنی آگ میں کب تک یونہی پگھلتا رہوں
سخن دیا ہے تو پھر کوئی ہم سخن بھی دے

حصارِ ذات سے نجمیؔ رہائی دی جس نے
دکھائی کاش کہیں اب وہ گلبدن بھی دے

سید عبدالرحمٰن ریاض خوارزمی

نظر اُن کی قاتل ادا کیا ہوئی
…ہوئے ہم جو ہم سے خطا کیا ہوئی

…آ جائے میخانے میں پی کے جائے
…بیرِ بد و پارسا کیا ہوئی

…نے وہ بھی نالے جو دل میں رہے
…فریاد بھی نارسا کیا ہوئی

…ثمائل سے ان کی اداؤں سے عشق
…ئی بات پھر ناروا کیا ہوئی

…را نہیں ہے اگر نیشِ عشق
…را سوچیئے نا دوا کیا ہوئی

…نہیں ختم ہوتی حیاتِ الم
…انے تمہاری جفا کیا ہوئی

…ینہ کنارے پہ ڈوبا ہے جب
…کوتاہیِ ناخدا کیا ہوئی

…آپ خود دار پر آئے تھے
…قامت خوں بہا کیا ہوئی

انہیں بھی مجھ سے ہو جائے گا پیار آہستہ آہستہ
بسا لیں گے مجھے پہلو میں یار آہستہ آہستہ

ہمیں فیضِ محبت نے عطا کی صبر کی عظمت
سو پہنچے بزم میں یہ جاں نثار آہستہ آہستہ

ترے لطف و کرم کے گو نہ تھے انوار قسمت میں
ہوئے ظلم و ستم بھی سازگار آہستہ آہستہ

نہ چلنے کی سکت تھی اور نہ واضح راہِ منزل ہی
اشارہ تھا چلے بے اختیار آہستہ آہستہ

جوانمردی نہیں کرتے رہیں اب بھی گلے شکوے
ہوئے کم ظرفیوں پہ شرمسار آہستہ آہستہ

تصورِ جیت کا اور ہار کا دونوں اضافی ہیں
خزاں پر آئے گی غالب بہار آہستہ آہستہ

اُجاڑا جب بھی گلشن بجلیوں نے پھر بھی آیا ہے
چمن میں کشتِ ویراں پر نکھار آہستہ آہستہ

مجھے کیا ہو گیا ہے یہ تو سودائے محبت ہے
یہ ہے سنگِ گراں سر سے اُتار آہستہ آہستہ

بدی کو شیشے میں کیسے اُتارو گے ریاض آخر
کرم [illegible] آہستہ آہستہ

شہپر رسول

ہم زندگی شناس تھے سب سے جدا رہے
بستی میں سیل آیا تو جنگل میں جا رہے

پھر آج میرے درد نے مجھ کو منا لیا
کوئی کسی عزیز سے کب تک خفا رہے،

کمرہ میں میرے دھوپ کا آنا بوقتِ صبح
آنکھوں میں کاش! ایک ہی منظر بسا رہے

بابا! یہ مجھ حقیر کو اتنی بڑی سی دعا۔
تو بات کا دھنی ہے ترا قد سوا رہے

پہلے تو سربلند تھا ہر پیرہن زبان
جب وقت آپڑا تو سبھی بے صدا رہے

شہپر صدائے وقت سے کر لو مصالحت
محرومیوں کے در پہ کوئی کیوں کھڑا رہے

شاہد نعیم

بن کے منظر کے دھوئیں کا کبھی سایہ ہم نے
دھوپ کو وقت کی ظلمت سے بچایا ہم نے

دل کو سنگینیٔ حالات کا احساس بھی تھا،
مشورہ لے کے قدم پھر بھی بڑھایا ہم نے

زندگی کرب سہی، درد سہی، کچھ بھی سہی
بوجھ اپنا تھا، بہ ہر حال اٹھایا ہم نے

جب بھی سوچا ہے کبھی، بھیگ گئی ہیں آنکھیں
خود کو بھولے تو، تمہیں دل سے بھلایا ہم نے

اس طرف سے تو کبھی ملنے کی خواہش نہ ہوئی
اپنی جانب سے قدم آگے بڑھایا ہم نے

حادثے اتنے ہوئے ہیں کہ ہمیں یاد نہیں
ہمسفر پھر بھی ترا ساتھ نبھایا ہم نے

ایک سپنا تھا گلستاں کی بہاروں میں قرار
ایسے پایا تھا کہ جیسے نہیں پایا ہم نے،

مصلحت ہے کہ سیاست، ہمیں معلوم نہیں
بات جب اُن کی سنی، سر کو جھکایا ہم نے،

اتنی تفصیل سے باتیں نہ ہوئی تھیں شاہدؔ
بے خطا شخص پہ الزام لگایا ہم نے

نیرّ جہاں

بے خوابی

کالی چادر کے مانند ہے آسماں
اس پہ تارے نہیں
اے خدا کیا کروں ـــــ کیا گنوں
اپنے بستر کی شکنوں کو گنتی ہوں میں
جسم میرا تڑپتا ہے چادر پہ یوں
جیسے چادر تلے آگ ہی آگ ہے
کیسے کہہ دوں اسے نرم تکیہ بھلا
جس پہ تنہا ہو جلتا ہوا سر مرا
اس کو بستر سے پھینکوں، رکھوں کیا کروں
ہر طرف سے چٹختی ہوں میں اس طرح
جیسے پیاسی زمیں
جسم کا ایک اک عضو دکھتا ہے یوں
جیسے کوٹا گیا ہو مجھے رات بھر
اے خدا کیا کروں اے خدا کیا کروں
تیرے احکام بن
ایک پتہ بھی کہتے ہیں ہلتا نہیں
تیرے احکام میں دیر کیا ہے بھلا
دیر کیوں ہے بھلا
میری بے خواب راتوں کی تقدیر میں
نیند کب تک نہیں آئے گی یہ بتا!

منظر امکانی

بے حرف رُتوں کا نوحہ!

بھول گئے بے حرف رُتوں کے ساتھی مجھ کو
باراں کے سائے میں ان سے خواب کی باتیں
دیواروں سے راتوں کو مہتاب کی باتیں
رنگوں کے سائے میں شاخِ گلاب کی باتیں
مجھ کو یاد ہیں اور یہی بے نام سی یاد
اک ٹوٹے کشکول کی صورت ہاتھ میں ہے

خاموشی کے باطن میں الفاظ کا دریا
بہتا تھا اور ہر منظر چپ رہتا تھا
لفظ کے تیشوں سے اب باطن اُجڑ گئے
بیس برس پہلے جب منظر بچھڑ گئے
ان لفظوں کی سُولی پر میں لٹک رہا ہوں
مجھ کو کون اتارے

بشیر سیفی

کیا میں اور کیا تحریر مری
اِک حرفِ غم جاگیر مری
بے ربط سہی ہر خواب مگر
بے ربط نہ ہو تعبیر مری
میں خود اپنی تکریم کروں
اتنی بھی نہیں توقیر مری
میں کن لفظوں کی قید میں ہوں
ہر سطر ہوئی زنجیر مری
میں کون ہوں کیا ہوں کس کو خبر
خود مجھ تک ہے تشہیر مری
بس پیار کی اک میٹھی سی نظر
آساں ہے بہت تسخیر مری

نسیم نازش

تیرے دل سے اگر اُتر جائیں
تو ہی بتلا کہ ہم کدھر جائیں

میں ہوں، تنہائی اور حیرانی
یہ بلائیں بھی کس کے گھر جائیں

زندہ تیرے بغیر رہ لیں گے!
رنج ایسے نہیں کہ مر جائیں

تو نہ رکھے سنبھال کر جو ہمیں
ریت کی طرح سے بکھر جائیں

میں نئے موسموں میں سوچتی ہوں
شاید اس بار زخم بھر جائیں

یہ سفر وہ ہے ماہرو جس میں
اپنی پرچھائیوں سے ڈر جائیں

میرے ہمراہ وہ رہے نازش
سارے موسم یونہی گزر جائیں

رعنا ناہید رعنا

آنکھوں میں محبت کی چمک چھپ نہیں سکتی ۔۔۔!
ہو دھوپ میں بارش تو دھنک چھپ نہیں سکتی

جھنکار دلوں کی ہے نگاہوں کا تصادم
ٹکرائیں جو شیشے تو کھنک چھپ نہیں سکتی

مژگاں ہوں کہ رخسار ہوں دامن ہو کہ آنکھیں
سیّال ستاروں کی چمک چھپ نہیں سکتی

چہرے پہ بکھر جاتے ہیں ہر لحظہ کئی رنگ
پیدا ہو اگر دل میں کسک چھپ نہیں سکتی

انسان نے کیا ہے جسے صدیوں میں فراہم
یہ روشنی اب حشر تلک چھپ نہیں سکتی

کرتا نہیں بے روپ غبارِ رہِ منزل
ہو عزم تو چہروں کی دمک چھپ نہیں سکتی

پھولوں میں نمائش کا جنوں عام ہے رعنا
پھولوں میں پھولوں کی مہک چھپ نہیں سکتی

گھنگھور گھٹاؤں میں یہ بجلی کے چھماکے!
پرتو نظر آتے ہیں مجھے کرب انا کے

میں موج ہوں میری کوئی منزل ہی نہیں ہے
لے جاؤ یہ ساحل بھی کہیں اور اٹھا کے

تمغات کی تزئین کا تم جشن مناؤ!
ہم داد نہ چاہیں گے وہاں زخم دکھا کے

آئینے سے خوش عکس بہرحال نہ ہوتا
احساں کیا آپ نے نزدیک نہ آ کے

تحقیق کے ایواں میں ہو جاتی ہے مشکوک
جو بات کہی جاتی ہے ماحول بنا کے!

دیکھا نہ کسی آنکھ میں ہم نے کوئی آنسو
مایوس ہوئے درد کا افسانہ سنا کے

خاموش کہاں ہے یہ مری ذات کا صحرا
ہوتے ہیں شب و روز تغیر کے دھماکے

رعنا ہمیں جینے کا سلیقہ نہیں آیا
احساں اٹھاتے ہی رہے آب و ہوا کے

نورجہاں ثروت

ایک نظم

سفر طویل ہے
نہیں ہے جائے مستقر
جہاں میں کوئی دم رکوں
پکڑ لوں اپنی یاد کے
گلابی پنچھیوں کو
اور باندھ لوں
رفاقتِ قلیل کی اس ایک ڈور میں
کہ جس کا کوئی بھی سرا
نہیں ہے میرے ہاتھ
سفر طویل ہے

ادراک

تلخیاں جب بڑھیں
سارے رشتے نہ جانے کہاں کھو گئے
قربتیں جب بڑھیں، ذہنِ خلّاق کی
ایک تصویر اُبھری
اور اک مٹ گئی
قربتیں —
فاصلے — !
چاہتیں —
نفرتیں !!
ذہن سادہ میں پلتی ہیں
اور پھر ایک دن
سارے رشتے سبھی قربتیں
جانے کس موڑ پر
کس اندھیرے کی گہرائی میں کھو گئیں

سیّد عارف

غبارِ راہ تا حدِّ نظر ہے
خدا جانے ابھی کتنا سفر ہے

ابھی سے ہی سحر کا تذکرہ کیا
ابھی تو رات کا پہلا پہر ہے

تجھے افسانۂ دل کیا سناؤں
ترا ذوقِ سماعت مختصر ہے

ابھی تخلیق کی منزل میں ہے جو
وہ لمحہ بھی مرے پیشِ نظر ہے

ہمیں حالات سے غافل نہ جانو
ہمیں ایک ایک لمحہ کی خبر ہے

مزاجِ یار کیا بدلا کہ عارفؔ
نظامِ جسم و جاں زیر و زبر ہے

ہر اک جانب لہو بکھرا ہوا ہے
یہ عہدِ نو کی تازہ کربلا ہے

کچھ اب کے یوں سمِ آلودہ فضا ہے
دمِ ہستی اکھڑتا جا رہا ہے

ابھی تک لوگ ماتم کر رہے ہیں
وہ کیسا شخص تھا جو مر گیا ہے

درِ انصاف پہ دستک تو دوں میں
مرا منصف وفا ناآشنا ہے

تو کس کس درد کا درماں کرے گا
غمِ دل سلسلہ در سلسلہ ہے

نہ جانے کس گھڑی لٹ جائیں عارفؔ
اندھیری شب ہے دروازہ کھلا ہے

خاور اعجاز

شہرت کی گونج وہ تھی کہ دربار گر پڑا
عزت ملی تو صاحبِ دستار گر پڑا

آخر یہی ہوا کہ زمانے کی دھوپ میں
سایہ بھی شک کے صورتِ دیوار گر پڑا

تصویر دیکھ کر تو بہت خوش ہوا تھا دل
خبریں پڑھیں تو ہاتھ سے اخبار گر پڑا

تشہیرِ شخصیت تو بہت کی گئی مگر
بے جان فصیلِ حرف سے فن کار گر پڑا

پھر یوں ہوا کہ تم بھی ستارہ نہ بن سکے
جھرمٹ سے میں بھی ٹوٹ کے بیکار گر پڑا

منزل پہ قتل ہو گئی جن قافلوں کی نیند
لے جائیں گے اٹھا کے کئی راستوں کی نیند

دہقاں نے اپنے ساتھ جگائی تھی جو زمیں
اُس میں اُگی ہے اب کے گئے موسموں کی نیند

شوکیس میں لگی ہوئی گڑیا جھپک لے آنکھ
پلکوں پہ جم نہ جائے کہیں رت جگوں کی نیند

سونے لگے تھے رات کی چادر لپیٹ کر
بتی جلی تو اُڑ گئی سب قمقموں کی نیند

جاگے تھے اتنا عہدِ اسیری میں ہم فقیر
آنکھوں میں اب بھی قید ہے پچھلی رُتوں کی نیند

یمین الدین رئیس

سحر کے خواب لُٹا شب کے گھر سے واپس آ
نکل غبارِ طلب سے سفر سے واپس آ

خلوص و خیر کے سِکّے کا وزن گھٹنے دے
پیامِ امن بہ لب شہرِ شر سے واپس آ

ملے ہیں دشتِ مشقّت کو انگنت چھالے
کہ اب تو قہرِ مقدّر کے در سے واپس آ

پلٹ رہے ہیں پنہارے بھی دن تمام ہوا
نمودِ شام ہے اب تو سفر سے واپس آ

حقیقتوں کے اُجالے بلا رہے ہیں تجھے
خیال و خواب کی اندھی ڈگر سے واپس آ

خود آگہی کا جنوں وحشتِ خامشی دے گا
مکانِ ذات کے ویراں کھنڈر سے واپس آ

نہ ٹوٹ جائے کسی کا غرورِ تشنہ لبی
سمندر آ! کہ درِ کوزہ گر سے واپس آ

طالب قریشی

یہ ایک قطرہ، یہ ایک منظر خیال رکھنا
بنے گا اِک دن یہی سمندر خیال رکھنا

حدودِ بچپن میں کھیلتے ہیں جُدا جُدا سے
ابھی سے بھائی ہیں کتنے خود سر خیال رکھنا

رہیں گے کب تک یہ خوشنما موسموں کے آنچل
نہ جانے کیا ہو خلاء کے اندر خیال رکھنا

یہ ہلکی ہلکی ہوائیں طوفاں بن نہ جائیں
کہ فاختائیں نہ پھر ہوں بے گھر خیال رکھنا

اسیر ہو کے رہو نہ راہوں کے پیچ و خم میں
چھپے کھڑے ہوں کہیں ستمگر خیال رکھنا

سدا نہ آشوب کی یہ چادر تنی رہے گی
بدل رہی ہیں فضائیں تیور خیال رکھنا

خود اپنی ہی ذات میں نہ گم ہو کے رہنا طالب
نظر کی حد پہ ہیں کیسے منظر خیال رکھنا

فرحت شہزاد

بھٹکا بھٹکا پھرتا ہوں
گویا سوکھا پتّا ہوں

نام ہی اپنا بھول گیا
تجھ میں ایسے کھویا ہوں

ساتھ تمہارے رہ کر بھی
تنہا تنہا رہتا ہوں

عام سی اِک لڑکی کے لئے
دریا دریا رویا ہوں

تم پر حرف نہ آجائے
دیواروں سے ڈرتا ہوں

دھڑکن دھڑکن زخمی ہے
پھر بھی ہنستا رہتا ہوں

مجھ پر تو کھل جا شہزادؔ
میں تو تیرا اپنا ہوں

سکون ڈھونڈنے نکلے تھے خود کو کھو بیٹھے
دیارِ غیر کی رعنائیوں کے ہو بیٹھے

شراب پی کے سبھی مستیوں میں ڈوب گئے
بس ایک ہم تھے کہ نس نس میں دُکھ سمو بیٹھے

ترا وصال تو یوں بھی خیال و خواب رہا
ترے فراق کی شب سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے

اے زندگی! بھلا اب تجھ سے کیا شکایت ہو
کہ ایک عمر ہوئی ہم تو تجھ کو رو بیٹھے

کسی طرح بھی کٹے یہ سیاہ رات کٹے
کہانیاں ہی شبِ وصل کی کہو — بیٹھے!

خبر تھی ہم کو ہے بنجر زمینِ دل - لیکن
نہ جانے کس لئے چاہت کا بیج بو بیٹھے

چلے تھے پار لگانے سفینۂ اُلفت
خود اپنا آپ ہی شہزادؔ جی ڈبو بیٹھے

یوسف عزیز

عشق و آزادی کا مکالمہ

عشق و آزادی میں اک دن بحث یونہی ہو گئی　　کائناتِ رنگ و بو میں کون ہے کتنا اہم
مسکرا کر عشق نے یہ پیش کی شرحِ دلیل　　ہر نگاہِ ناز کا مجھ کو تو جلوہ ہے بہم

میں ہی تڑپا تھا دلِ یزداں میں روزِ اولیں　　مجھ سے سیکھے ہیں جہاں والوں نے اسرارِ مبیں
میری ہستی سے عدم غیب بن گئے ظاہر وجود　　یہ محبّت کی حرارت، یہ تمنّا کا صعود

میرے دم سے ہے ظہورِ معجزاتِ زندگی　　سوز و سازِ اضطراب و درد کی پائندگی
جذبۂ صادق ہوں میں اور جرأتِ پیکار ہوں　　شعلۂ بیتاب ہوں میں تیغِ جوہر دار ہوں

عشق کی جولانیوں کے سن کے قصّے کُو بہ کُو　　انقلابِ دہر کی خوگر نے کی یوں گفتگو
اے حریفِ امنِ عالم کیا تری اوقات ہے　　زرد چہرے منحنی تن، یہ تری سوغات ہے

حریّت کی روح سے شاید نہیں تُو باخبر　　عالمِ اقوام پر شاید نہیں تیری نظر
بندۂ حُر کو دیا ہے میں نے تاجِ خسروی　　ملّتِ آزاد کو میں نے عطا کی رہبری

غور سے سن لے یہ کہتا شاعرِ رومان ہے　　عشق و آزادی "بہارِ زیست کا سامان ہے"
عشق پر کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی　　لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

حسین بانو

دوسرے لوگ جہنم ہیں

راہ و رسم وفا آشنائی
اُس نے چہرے پہ اپنے سجائی
زخم کیسے بھریں گے ہمارے
بے وفا ـــ ماتم بے وفائی

اس کے نام

گرم لبوں کے ٹھنڈے بوسے
جسموں پر برساؤ تو
لیکن اتنا جان بھی لینا
ہر لڑکی ہرجائی ہے

بازگشت

ہزار برسوں کی بارشوں میں
وہ بھیگی بھیگی سی سوچتی ہے
عروسِ جاں میں گلاب آئے سحاب آئے
برس سکے ہیں نہ کھل سکے ہیں۔

رئیس فروغ

کے لئے ایک نظم

"رات بہت ہوا چلی"
اور ہم سب غم میں ڈوب گئے
چاندی بکھرے بالوں میں
ساون بھیگ چلا تھا
اُجلے اُجلے چہرے پہ
نُور بکھر گیا تھا
آ ــــ نا تھی
آنسو رُت تھی
اور خدا نے ہم پر
قطرے بھی برسائے تھے
ہم پر غم کے سائے تھے
مانگ اُجڑی تھی
اور آنچل بھی بھیگ چلا تھا
آنکھیں ہماری ڈوب چکی تھیں
آنسو اور سمندر ــــ میں
"رات بہت ہوا چلی"!

بلو بخاری

سلیم کیا ہم نے خطا کار ہمیں ہیں
ماں کی محبت کے طلب گار ہمیں ہیں
موں پہ لئے پھرتے ہیں اخلاص کی قندیل
رم بھی ہے تو سزاوار ہمیں ہیں
مر کی محفل میں بھی دیتے ہیں اذانیں
بات جو کرتے ہیں سرِ دار ہمیں ہیں،
تے سے ہٹا دے کوئی سولی پہ چڑھا دے
کے لئے آہنی دیوار ہمیں ہیں،
رہیں، شاعر ہیں، محبت کے امیں ہیں
عظمت آدم کے علمدار ہمیں ہیں،

شاہد چودھری

درست سوچ کی جس دن بھی سمت ہو جائے
مرا ضمیر ہمیشہ کو مست ہو جائے
ہر ایک بات قلم کی زباں سے کہتا ہوں
خیال رکھتا ہوں لہجہ نہ سخت ہو جائے
میں اُس کے سائے میں بیٹھوں گا لازماً لیکن
میں چاہتا ہوں وہ پودا درخت ہو جائے
بڑے ہی شوق سے نکلا ہوں آج میں گھر سے
کہ شہرِ دل کے محلّوں کی گشت ہو جائے
یہ بات آج بھی ہے اختیار میں شاہدؔ
کہ جب بھی حکم دوں دریا کو دشت ہو جائے

نسرین گلؔ

زندگی زہر کا پیالہ ہے
ہر بشر اس کا پینے والا ہے

گھپ اندھیرا ہے ذات کے اندر
گو بظاہر بڑا اجالا ہے

رونقیں کیسے آئیں چہروں پر
جب دلوں پر غموں کا ہالہ ہے

دل کو صد رنگ کر دیا غم نے
غم کا ہر رنگ ہی نرالا ہے

کس طرح اس کے سچ کو جھوٹ کہوں
اس کا چہرہ تو بھولا بھالا ہے

چاند کو دور ہی سے پیار کرو
چاند کے دل میں کالا کالا ہے

پھر لو کانٹوں سے دامنِ دل کو
موسمِ گل گزرنے والا ہے

گلؔ تجھے انتظار ہے کس کا
سچ بتا کون آنے والا ہے

عظیم الوقار فرحان

جانے کب کب اور کس کس سے مرا سودا ہوا
سو کے اٹھا ہوں تو زنجیروں میں ہوں جکڑا ہوا

ہوں منافق میرے اندر ظلمتوں کی جھیل ہے
پھر رہا ہوں دوسروں کو روشنی دیتا ہوا

میں خدا معلوم کس فرعون کی تقدیر ہوں
میں یہاں تک آ گیا ہوں جھیل میں بہتا ہوا

وہ بھی مجرم ہے سزا اس کو بھی ملنی چاہیئے
وہ جو کل پکڑا گیا تھا ظلم پر روتا ہوا

یہ غزل کہہ کر مرا دل اس طرح ہلکا ہوا
جس طرح بادل کوئی ہو رات بھر برسا ہوا

کوریائی شاعری

کوریائی تہذیب و تمدن کی کہانی پانچ ہزار سال پرانی ہے۔ چین کے کوریائی تہذیب پر گہرے اثرات ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوریا کی اپنی انفرادیت قائم نہیں۔ کوریائی عوام نے ہر دور میں تہذیبی طور پر اپنا امتیاز برقرار رکھا ہے، ادب، مصوری، شاعری اور فنونِ لطیفہ کے دوسرے تمام میدانوں میں کوریائی فنکاروں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے اور وہ کسی طور ان شعبوں میں باقی ممالک سے پیچھے نہیں۔ کوریائی شاعری کی اپنی انفرادیت ہے۔ لطیف جذبات کا خوبصورت انداز میں اظہار اور عوامی جذبات کی ترجمانی کوریائی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔ ذیل میں مختلف کوریائی شعراء کی نظمیں شامل اشاعت ہیں جنہیں پڑھ کر کوریائی شاعری کے رجحانات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

ترجمہ اقبال نواز

LEE TAN

روشنی کی بے دخلی

شگوفے گرتے جاتے ہیں
باغ برہنہ ہو کے رہے گا
خالی باغ میں روشنی بانٹتے
لیمپوں کے پھولوں کو ہوا اُڑا کر لے گئی ہے
میرا دل! محراب کی طرح خالی ہو گیا ہے
آؤ!! تمام خطاؤں کی معافی مانگیں!
آؤ! تمام گناہوں کی معافی مانگیں!
اگرچہ خالی باغ میں کوئی بھی پھول
باقی نہیں ہے۔
پھر بھی سورج کی روشنی آہستہ آہستہ
پھیلا کر رہا ہے۔

وعدہ

آنکھ کے ڈھیلے کے سمندر!
کیا تم نے گھومتے چرخے کو روشنی
کاتنے دی ہے؟
کیا تم نے پردوں کو چمکنے کا وقت
دیا ہے؟
کیا تم نے چاندنی چاندنی اور ستاروں کی روشنی کو
خوشبودار پتھروں اور پتوں پر پھیلنے دیا ہے؟
لیکن مجھے خود بھی یقین نہیں ہے کہ میں نے ایسا کیا ہے
سوچو
آؤ!! کہ ہم اپنی حاجت سے
خشک وقت کو تر کر دیں
تاکہ ہریالی کی کونپلیں پھوٹ سکیں

LEE HYUNG

میری شاعری

یری شاعری واقعی بیکار ہے
یب میں اپنے لامتناہی سفر میں
بھر کے لئے گھاس پر سستاتا ہوں۔
بیکار اُبلتی ہوئی ندیا !!
پر سفید بادل !!
یری شاعری شام کے کہرے کی طرح بیکار ہے
رات پڑتے ہی پہاڑی علاقے کے ارد گرد منڈلا رہا ہو
!! ہ
متناہی سفر میں دیکھے ہوئے لینڈ سکیپ میں
شی اور غم بنفشی کہرے سے کفنائے جاتے ہیں
یں اپنے ہمسایوں کی خوشی کے لئے دُعا کرنا چاہتا ہوں
جو رات گئے اپنے واپسی کے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔
میں کسی گوشہ نشین کی بے نور کھڑکی میں
چاند کی سرد چاندنی کی طرح داخل ہونا چاہتا ہوں
میں نغماتِ نو سے الفت کرنا چاہتا ہوں
جنہیں وقت کی تنہائی
پانی کی طرح اٹھائے لئے جاتی ہے۔

سرِ راہ

مجھے روانگی کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے
یہ گاؤں کی جھلملاتی روشنیاں
دیہاتی کھانوں کی میزوں پر
یقیناً فرحاں و شاداں ہوں گے۔
اور اب میں پہاڑی سے نیچے اتر رہا ہوں۔
ہوا میرے پھیپھڑوں میں دہکتے لہو کو
لرزا سی گئی ہے۔
میں ایک اُداس و تنہا گرتے ہوئے پتّے کی طرح صابر شاکر ہوں
میں جونہی آنکھ بند کرتا ہوں۔
راستوں کے ساتھ ساتھ
میرے ذہن کے جنگل میں بھی خزاں آن بستی ہے
جہاں ایک بار کسی سے چپکے چپکے سسکیاں
بھرتے ہوئے بچھڑا تھا
یہ لپکتی ہوئی خزاں
یہ مرعوب کن خزاں
ہر طرف سے میری طرف امنڈ رہی ہے۔

MOON DUK SOO

گھاس کی پتیاں

میری اور کوئی خواہشیں نہیں ہیں
ماسوائے !!
تمہارے دل کے گلاب گلشن کے کسی پنہاں گوشے میں
گھاس کی شعبدہ باز پتیوں کی طرح جنم لینے
اور ایک ہزار برس تک تمہاری سانسوں میں رہنے کے
میری اور کوئی خواہشیں نہیں ہیں۔
آنسوؤں کے قطروں سے بھیگا
میں تمہارے یکٹکی باندھ کر دیکھنے سے چمک اٹھوں گا
اور تب میں کہیں کسی روز موسم خزاں میں
بے سراغ ہو جاؤں گا۔
میری اور کوئی خواہشیں نہیں ہیں۔
میں ہوا کے دوش پہ ایک برق
صفت دھارا ہوں
میں اپنی نئی تجسیم کی تبدیلیوں میں سرگرداں
ایک بیج ہوں جو تمہاری بانہوں میں
گوشہ گزیں ہونے کے لئے بیتاب ہے

خط

فرشتے کے خفیہ کاغذات میں سے
پھاڑا ہوا ایک ٹکڑا !!
اس سے گلِ صد برگ کی طرح خوشبو کی لپٹ آتی ہے
یہ سرنگوں ہوتا ہے۔
کہ جیسے سُرخ سفید کف وقت پر ٹپکا ہو
یہ ایک زخمی تتلی کی طرح تھرتھراتا ہے۔
اگرچہ زخم بھر چکے ہیں۔
یہ منڈلا رہا ہے کہ جیسے تاریخ کی اندھی
شاخوں پر بیٹھنا چاہتا ہو۔
یہ اک گلِ صد برگ کی طرح
جو اندھیرے کی کھڑی چٹان کے ساتھ ٹکراتا ہے
اور پاش پاش ہو جاتا ہے
افسوس !! افسوس !!
صد افسوس !!

CHUNG HAN MO

سحر

صدائیں اندھیرے میں دبی حسیات میں سرایت کرتی ہیں
اور پلاٹینم کے دمکتے پترے بن جاتی ہیں ۔
ایک پرندہ تمام رات اکٹھا ہونے والے اندھیرے کو
منتشر کرنے کے لئے گاتا ہے
میں جب ایک چھوٹا سا لڑکا تھا
تو صبح کے وقت چڑیاں اپنے گھونسلوں سے نکل کر
امنڈتی لپکتی ہوئیں بادِ نسیم سے بلند تر
آواز میں گاتی تھیں ۔
ان کی چہچہاہٹ سے پہاڑ کی چوٹی کا قد
کچھ اور بڑھ جاتا تھا ۔
اور اب
تمام صداؤں کے درمیان دُور سے ایک پرندہ آتا ہے
اور میرے اندر کی دیوار پر ایک لکیر نقش کر جاتا ہے ۔
صدائیں متین حسیات میں داخل ہوتی ہیں ۔
تہہ در تہہ تاریکی کی چھال کو اتارتی ہیں ۔
اور ایک دکھتا ہوا زخم سا لگا جاتی ہیں ۔

CHUNG GONG CHAE

شاعری شراب ہے

جب میں شاعری پڑھتا ہوں
جام ہولے سے لبالب بھر جاتا ہے
جب میں شاعری پڑھتا ہوں
گرم روشنی کی چمک بڑھ جاتی ہے ۔
جب میں شاعری پڑھتا ہوں
چرمراتے ہوئے ویگن کے پہیے
خزاں لاتے ہیں ۔
اس شبِ سیاہ میں تاروں کے نیلے چہرے !!
اور کسی بھولے ہوئے شہر کی رات کا آسماں
جب یہ تمام شاعری پڑھتے ہیں ۔
تو میرے پاس بس تنہائی کی شراب ہوتی
تنہائی کی سفید شراب !!

فن اور شخصیّت اور خاکے

ڈاکٹر انور سدید

عزیز احمد: ایک سچے عالم، سچے ادیب

شہابِ ثاقب یا قطب تارہ

[م]۱۹۷۸ء کا سال (جو) حسن عسکری اور ابنِ انشا کی وفات سے شروع ہوا تھا اُردو[ن] ادب کے لیے کتنا منحوس ثابت ہوا۔ انتہائے سال پر عزیز احمد بھی منہ موڑ گئے۔[ر] آج جب اُن کی وفات کی خبر آئی ہے تو بدن کا سارا خون سمٹ کے آنکھوں میں سما گیا ہے اور اب بے اختیار بہہ رہا ہے۔ [ن] ٹورنٹو یونیورسٹی کینیڈا میں پروفیسر عزیز احمد کا سانحۂ ارتحال ہوا تو ساعت چالیس (بھر) کے لیے رُک گیا۔ ہسپتال کے کمرے کے باہر شعبۂ علومِ اسلامیہ کے طلبا جمع تھے، ان کے چہرے سوگوار تھے اور آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ صبح کی خبروں میں اُن کی وفات کو سرِفہرست نشر کیا گیا اور اُسے علمی دنیا کا ایک اہم حادثہ قرار دیا گیا۔ اُن کی تدفین میں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے ڈین شامل ہوتے اور آخری رسوم ادا ہو چکیں تو وائس چانسلر نے اُن کے سرہانے پھولوں کا ایک گل دستہ رکھا اور موم شمع جلا کر دو منٹ کے لیے سر جھکائے رکھا۔ یہ اس بات کا اظہار تھا کہ عزیز احمد کا جسدِ خاکی زمین کے سپرد کیا جا چکا ہے لیکن اُن کے علم کی خوشبو پھیل رہی ہے اور اُن کے ادب کا اجالا قائم ہے۔ [ر]اُردو ادب کے مطلع پر عزیز احمد ایک شہابِ ثاقب کی طرح نمودار ہوئے تھے لیکن وہ دور تک روشنی کی لکیر چھوڑ کر غائب نہیں ہو گئے بلکہ ایک ساکن ستارے کی طرح قطب پر آویزاں ہو گئے اور ادب میں نئے آنے والوں کو زندگی بھر راستہ دکھاتے رہے۔ جب اُن کی تصنیفات پر نظر دوڑاتا ہوں اور ان کے ادبی اثاثے کا جائزہ لیتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ عزیز احمد اب بھی اُفق پر چمک رہے ہیں اور ایک راہ نما ستارے کی طرح روشنی کی لکیر کو ادب کے راستے پر بکھیرتے چلے جا رہے ہیں ——— [ن]کیا وہ شمع جو عزیز احمد کی لحد پر روشن کی گئی ہے اب تک اپنی روشنی نہیں پھیلا رہی ہے؟ [ر]آج جب وہ رخصت ہو گئے ہیں تو اُن کا جسدِ جسمانی تو واقعی ہم میں موجود نہیں لیکن وہ روشنی جو ان کے ادبی کارناموں سے چھن چھن کر آ رہی تھی ابھی تک اجالا پھیلا رہی ہے اور جب تک اُردو زندہ ہے اُس کی تابانی قائم رہے گی۔

(م) "مشرق" (ن) "نوائے وقت" (ج) "جسارت" (ر) رسالہ "ماہِ نو" میں مطبوعہ نگارشات سدید

عزیز[م] احمد اپنے وطن کی مٹی سے دُور دیارِ غیر میں رحلت فرما گئے۔ لیکن کسی نے ان کی افسانہ نگاری کا ذکر نہیں کیا، (شاید اب کے لوگوں کو یہ بات بھول گئی۔ عزیز احمد نے اُردو ناول کو نئی جہت دی تھی، یہ بات بھی نظر انداز کر دی گئی۔ "نیا دور" کے اولین دور میں اُن کی نظم "مہمانِ عزیز" جس[ن] میں حریت پسندی کی تحریک کو موضوع بنایا گیا (اور) جس[م] سے کشمیر میں مجاہدینِ آزادی کا جذبۂ حُبّ الوطنی اجاگر ہوتا ہے شاید اُردو ادیبوں کی یاد سے محو ہو گئی ہے۔ زندگی کے آخری دور میں عزیز احمد نے اسلامی تاریخ و تہذیب کے موضوع پر لازوال تصنیفات پیش کیں، اُن[ع] کی اس اسلامی خدمت کو کون نظر انداز کر سکتا ہے ؟ افسوس[م] ! آج عزیز احمد کی اس قومی خدمت پر بھی کسی کی نظر نہیں گئی۔ ان کے تخلیقی تجربات نے اُردو ناول اور افسانہ کو نئی جہت دی۔[م] اُردو ادب اُن کا شکر گزار ہے کہ انہوں نے "ایسی بلندی ایسی پستی" اور "گریز" جیسے ناول تخلیق کیے۔ اُردو ادب بجا طور پر عزیز احمد کا احسان مند ہے کہ انہوں نے مدن سینا اور صدیاں" "زرِ خرید" "ستا پیسہ" "زرّیں تاج" اور "تصورِ شیخ" جیسے افسانے لکھے۔

مَیں[ن] اُن کی موت پر سوگوار ہوں، بے حد سوگوار۔ عزیز احمد کی موت ایک سچے عالم کی موت ہے۔ اُن کی وفات سے دنیا پر اندھیرا چھا گیا ہے۔ میں آج بے حد سوگوار ہوں کہ ہمارے درمیان سے ایک سچا ادیب اُٹھ گیا ہے۔ وہ ادبی سیاست سے بے نیاز تھے۔ انہوں نے شہرت حاصل کرنے کے لیے نہ تو رسالہ جاری کیا اور نہ ہی اپنے جلو میں کاسہ لیس اور خوشامدی ادیبوں کی فوجِ ظفر موج جمع کی۔ وہ[ر] شہرت سے بے نیاز ادبی کارنامے سرانجام دینے میں مصروف رہے۔ [م] نام و نمود کی منزل کو عزیز احمد بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ (تاریخِ ادب[ر] کا یہ واقعہ آج ہم سب کے لیے خاصہ سبق آموز ہے، کہ وہ ادیب جس کے ساتھ ایک شام بھی نہیں منائی گئی جس کی کسی کتاب کی تقریبِ رونمائی منعقد نہیں ہوئی اور جس کے اعزاز میں ادبی رسالے کی ایک اشاعت تک وقف نہیں کی گئی آج بقائے دوام کی مسند پر متمکن ہے۔ شہرتِ عام کی منزل کو بہت پیچھے چھوڑ کر عزیز احمد راہیٔ مُلکِ عدم ہو گئے ہیں۔ اس زاویے سے دیکھیے تو مجھے عزیز احمد دوسرے محمد حسن عسکری لگتے ہیں۔ عزیز احمد (اور) محمد حسن عسکری میں بہت سی قدریں مشترک ہیں۔ مثال کے طور پر اوّل اوّل دونوں نے کہانی کی صنف میں تخلیقات پیش کیں پھر تنقید کی طرف آئے اور آخر آخر مابعد الطبیعاتی موضوعات اور اسلام کی لگن میں مگن ہو گئے۔ دونوں کی ادبی فکر اور مہارت میں نمایاں فرق موجود ہے۔ لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ دونوں نے اردو ادب کو کس طرح جدیدیت کے ساتھ قدم ملا کر چلنے پر آمادہ کیا۔ نمائش اور شہرت سے دونوں کو نفرت تھی۔ لیکن کیا اس سے عزیز احمد کی ادبی عطا میں کسی طرح کمی واقع ہو جائے گی اور وہ ستارے جو اپنے جھوٹے نگینوں سے آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہے ہیں زیادہ عرصے تک اپنی جگمگاہٹ کو قائم رکھ سکیں گے ؟ افسوس ہے کہ تاریخ اس سلسلے میں مثبت شہادت پیش نہیں کرتی اور یہ حقیقت اُن لوگوں کو لمحۂ فکریہ مہیا کرتی ہے جو تخلیق کی طرف کم توجہ کرتے ہیں لیکن شہرت سمیٹنے کے لیے ہر حربہ استعمال کر ڈالتے ہیں۔

ناول نگار عزیز احمد کی نمود

ادب میں عزیز احمد کی نمود دو غیر معروف ناولوں سے ہوئی تھی، یہ ناول "مرمر اور خون" اور "ہوس" تھے۔ انہیں عزیز احمد نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں لکھا تھا اور ایک ناول کا دیباچہ مولوی عبدالحق نے لکھا تھا۔ "ہوس" اور "مرمر اور خون" خاصے مقبول ہوئے۔ عزیز احمد کے ناولوں میں ذہنی آزادی کا ایک خاص پرتو موجود تھا (اور) اُن کے ناموں میں ایک مخصوص قسم کی جاذبیت تھی۔ اس دور میں ناول کی صنف پر کرشن چندر اور عصمت چغتائی کی حکمرانی تھی اور ادبی رسائل میں "شکست" اور "ٹیڑھی لکیر" پر جو خیال افروز تبصرے شائع ہو رہے تھے اُن کی گونج میں عزیز احمد کے تجربوں کو اہمیت نہ مل سکی۔ بلاشبہ ناول ان کی اوّلین محبت تھی اور انہوں نے "گریز" "آگ" "ایسی بلندی ایسی پستی" اور "شبنم" جیسے ناول تخلیق کیے۔ "گریز" جیسا معرکہ آرا ناول اب بھی جدید ناول کے پیش روؤں میں شمار ہوتا ہے۔

"گریز" کا مرکزی کردار نعیم اپنے عہد کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نمائندگی کرتا ہے اور بیک وقت دو دنیاؤں میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ اس صنوبر کی طرح ہے جس کے پاؤں زمین کے گہرے پاتال میں گڑے ہوئے ہیں لیکن جو بلند اور آزاد فضاؤں میں پرواز کرنے کا آرزو مند ہے۔ اور جب وہ اپنی دھرتی سے قطع تعلق کر کے لندن چلا جاتا ہے تو دوبارہ دھرتی اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ اس ناول کی ہیروئن بلقیس اس ہندوستانی دھرتی کی ہی علامت ہے۔ چنانچہ جب وہ نعیم کی مراجعت کے بعد اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے تو اس ناول کا اساسی المیہ ابھرتا ہے۔ اور نعیم کے دل میں زیاں کا احساس بیدار ہو جاتا ہے۔ "گریز" پیچیدہ ذہنی کیفیات کا ناول ہے اور ایک مخصوص اخلاقیات میں مصنف کے ایقان کو اجاگر کرتا ہے۔

عزیز احمد نے اجتماعی زندگی پر انسانی استحصال کو اپنے ناول "آگ" میں بڑی خوبی سے موضوع بنایا ہے اور (اُس) آگ کو جو دوسری جنگِ عظیم کے دوران ڈوگرہ راج میں کشمیر میں سلگ رہی تھی اسے بڑی فنکاری سے سماجی پس منظر میں پیش کیا۔ عزیز احمد نے اساسی طور پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا یہ آگ مہاجنی نظام اور جاگیرداری ماحول کو بھسم کرنے میں معاونت کر سکے گی؟ چنانچہ کشمیر میں اصل لڑائی طبقاتی سطح پر سامنے نہیں آتی بلکہ عزیز احمد نے سرمایے کو انسان کا دشمن قرار دیا۔ وجہ یہ ہے کہ سرمایہ فرقہ واریت پیدا کرتا ہے اور طبقاتی تضاد کو عمل میں لاتا ہے۔ ناول "آگ" اشتراکی تصورات کا فکری زاویہ پیش کرتا ہے۔ اس سے ذہن میں شدید کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ترقی پسند ناقدین نے اس "ناول" کا سب سے زیادہ بائیکاٹ کیا اور اس کی انقلابی حقیقت کو پاسنگ کے برابر بھی اہمیت نہیں دی۔ حالانکہ ترقی پسند نظریے کو جس مثبت انداز میں "آگ" میں پیش کیا گیا ہے اس کی مثال تو ترقی پسند ناول نگاروں کے ہاں بھی نہیں ملتی۔

عزیز احمد نے زندگی کی تنقید زندگی کی عکاسی کے اندر کی ہے۔ انہوں نے حقیقت نگاری کو ہمیشہ فوٹوگرافی کے مماثل

سمجھا اور اصلی اور حقیقی کے فرق کو ملحوظِ خاطر نہ رکھتے ہوئے مصنف کی غیر جانبداری کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ عزیز احمد کے ناولوں میں واحد متکلم بے حد اہم ہوتا ہے۔ لیکن یہ انفرادیت صرف انہیں حاصل ہے کہ واحد متکلم عزیز احمد کے ذاتی پرتو کا شائبہ تک پیش نہیں کرتا۔ بلکہ وہ "میں" کے ذریعے ایک ایسے کردار کو سامنے لاتے ہیں جو اپنی الگ شخصیت رکھتا ہے اور کہانی کے تانے بانے کو اپنے تاثرات کے تار و پود سے بنتا ہے۔ عزیز احمد افراد میں گہری دلچسپی لیتے ہیں، اور ان کے شخصی المیوں کو بڑی خوبی سے ابھارتے ہیں۔ تاہم خوبی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے صرف شخصی المیوں میں ہی دلچسپی نہیں لی۔ بلکہ ہیئتِ اجتماعیہ کی زوال پذیری کو بھی ناول کا موضوع بنایا۔ ان کا ناول "ایسی بلندی ایسی پستی" اجتماعی زندگی کی چھوٹی چھوٹی تصویروں سے مرتب ہوا ہے اور ایک ایسے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے جو رو بہ زوال ہے۔ مرحوم حیدر آباد اب ہماری یادوں کا حصہ بن چکا ہے، لیکن عزیز احمد کے اس ناول میں وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

عزیز احمد کا آخری ناول "شبنم" ایک الجھے ہوئے کردار کا نفسیاتی تجزیہ ہے لیکن اس کی اس خوبی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ عزیز احمد نے اس ایک ناول میں تکنیک کے متعدد تجربے کیے ہیں اور یوں شبنم کے مرکزی کردار کو ابھارنے کے لیے اسے رنگا رنگ آئینوں سے منعکس کرنے کی سعی کی ہے۔ عزیز احمد نے اسی ناول میں دھرتی کو زنگ، متلون اور تنوع پسند دکھایا ہے۔ اور شبنم کی ہنگامہ آرا شخصیت سے بے حس زندگی کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ یہ تجربہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد تھا۔ جنس اور جذبات کا ایک واضح نظریہ اس کے بین السطور موجود ہے۔ اس ناول کا بیانیہ خاصہ بیرنگ ہے۔ لیکن عزیز احمد نے مقصد یا نظریے کو چیخنے چنگھاڑنے کا موقعہ نہیں دیا اور ناول کی دلچسپی میں کمی نہیں آنے دی۔

افسانے کی طرف رجوع

(۱) عزیز احمد کے ناول اور ان کی تنقید نے اہلِ ادب کو اس قدر متاثر کیا کہ اب وہ پہلے ناول نگار اور پھر نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں، چنانچہ ان کی افسانہ نگاری اس شہرت میں کچھ دب سی گئی ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے جو تجربے اردو افسانے میں کیے ہیں ان کی قدر و قیمت کسی طرح بھی ان کے ناولوں سے کم نہیں۔ (عزیز احمد نے افسانے کی طرف رجوع کیا تو "مدن سینا اور صدیاں" "رقصِ ناتمام" "آبِ حیات" "جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" "بستی نہیں یہ" "ستاپسیہ" "زرخرید اور" "نموشکا" جیسے افسانے لکھے۔ مجموعی طور پر یہ کہنا کافی نہیں کہ عزیز احمد اردو افسانے کا اہم نام ہے بلکہ میں یہ باور کرانے کا آرزو مند ہوں کہ عزیز احمد نے اردو افسانے کو نئے موضوعات اور نئے اسالیب سے شناس کرایا۔ انہوں نے افسانہ نگار کو افسانے سے لذت حاصل کرنے کے بجائے غیر جانبداری سے حقیقت کی عکاسی کا سبق دیا

[ت]عزیز احمد کے افسانوں میں نفسیات زندگی کی ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آئی ہے لیکن وہ نفسی صورت کو بدن کا ارزاں تقاضہ نہیں بننے دیتے اور یہی وجہ ہے، کہ وہ لذتیت پیدا نہیں کرتے۔ ان کے افسانوں کے پس پردہ ایک ایسی شخصیت موجود نظر آتی ہے جس کا مطالعۂ ادب کئی زمانوں پر محیط ہے اور جو ان زمانوں کو ایک تخلیقی لڑی میں پرونے کا سلیقہ جانتا ہے۔ اس لحاظ سے عزیز احمد نہ صرف پرانے افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے بلکہ وہ نئے لوگوں کے لیے نئے تجربوں کا محرک بھی ہے۔

[د]عزیز احمد کا موقف یہ ہے کہ وقت کبھی نہیں مرتا، انسان کا اور قوموں کا اور تہذیبوں کا ماضی زندہ رہتا ہے اور یہ حال کے لمحے میں باقاعدہ سانس لیتا ہے۔ [ج] انہوں نے اپنی تخلیقات میں تسلسلِ وقت کا (یہ) تصور پیش کیا کہ ماضی کبھی نہیں مرتا اور ہر حال میں زندہ رہتا ہے۔ اُن کا یہ تصور ترقی پسند نظریے کی نفی کرتا ہے جو حال کے فروغ کے لیے پہلے ماضی کو کھنڈر کرتا ہے اور روایات کو توڑ دیتا ہے۔ [د] اس موقف کو انہوں نے "مدن سینا اور صدیاں" اور "آبِ حیات" میں بڑی خوبی سے پیش کیا۔ ان افسانوں میں، یہ زمانہ مرجاتا ہے لیکن اس کے بطن سے ایک اور زمانہ پیدا ہو جاتا ہے جو جذباتی اور واقعاتی طور پر پہلے زمانے سے مختلف نہیں ہوتا۔ چنانچہ شیریں فرہاد، مدن سینا اور ڈورگین آرے لیس کی کہانیاں بدلے ہوئے ماحول کے باوجود ایک جیسا جذباتی تاثر پیدا کرتی ہیں اور زمانی اعتبار سے ایک بڑے دائرے کو مکمل کرتی ہیں۔ "رقصِ ناتمام" میں اس تصور کو ایک خیالیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے، اور ایک ننھی سی جان کی پیدائش کو باپ کی بے چینی اور پریشانی کے ساتھ یوں وابستہ کیا گیا ہے، کہ پوری زندگی کا عرصہ اس ایک لمحے میں سما جاتا ہے۔ (غرض عزیز احمد نے ان افسانوں میں [ن]حقیقت کی بدلتی ہوئی صورت اور وقت کی دوامی گردش کو پیش کیا۔ [س]"ستا پیسہ" اور "زر خرید" میں عزیز احمد نے مادے کی فراوانی سے زندگی کا انتشار نمایاں کیا۔ عزیز احمد کے بیشتر افسانوں پر یورپ اور جنس دونوں چھائے ہوئے ہیں تاہم خوبی کی بات یہ ہے کہ عزیز احمد یورپ سے مرعوب نہیں ہوئے اور جنس کے بے باکانہ اظہار نے اُن کے ہاں لذتیت کی کیفیت پیدا نہیں کی۔ "گڑیا ننّدی" کی ماں دوان جنسی لحاظ سے برانگیختہ لڑکی ہے اور آزاد اس سے ن م راشد کی نظموں کے غلام کی طرح انتقام لینے پر آمادہ ہے۔ لیکن جس بے لاگ انداز میں عزیز احمد نے اس سارے عمل کو پیش کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کا مقصد کردار کے داخل سے قوت اور روشنی کے ماخذ کو بیدار کرنا ہے اور انہوں نے ڈی ایچ لارنس کی طرح جنس کو مذہب کا درجہ دینے کی کوشش نہیں کی۔

نظریاتی تنقید میں ایک اہم کتاب : [ت]"ترقی پسند ادب" نظریاتی تنقید میں عزیز احمد کی ایک اہم کتاب ہے۔ انہوں نے یہ کتاب اس زمانے میں لکھی جب ترقی پسند تحریک فتح و یلغار کے دور سے گزر رہی تھی۔ ہر نیا لکھنے والا ایجاب و قبول کی منزل سوچے سمجھے بغیر طے کرتا اور اس تحریک میں شامل ہو کر بقائے دوام تلاش کرنے لگتا۔ عزیز احمد نے ترقی پسندی کے مفہوم کو مروجہ سیاسی معانی سے الگ کیا اور انصاف اور بے باکی سے اس کے منفرد زاویے [ما]ابھار دیے۔ عزیز احمد ترقی پسند تحریک کے دورِ عروج میں منظرِ عام پر آئے۔ وہ ذہنی اور فکری طور پر ترقی پسند تھے لیکن انہوں نے مارکسی نظریات کو مدد

سیاسی معانی میں کبھی قبول نہیں کیا۔ ترقی پسند تحریک نے ایک عرصے تک انہیں اپنا ہم سفر قرار دیا اور ان کے ایسے افسانوں کو جن میں آزادہ فکری کا ایک مخصوص رجحان موجود تھا، ترقی پسند ادب کی نمائندہ تحریروں میں شمار کیا گیا۔ عزیز احمد کا پہلا افسانہ[۱] "پگڈنڈی" ترقی پسند ادب کے ترجمان "سویرا" میں شائع ہوا تو اس کا استقبال ترقی پسندوں نے کھلے بازوؤں سے کیا کہ اس سے جنس کا جسمانی پہلو زندگی کی ضرورت بن کر سامنے آتا تھا اور یہ افسانہ اخلاقی قدروں اور جذباتی رابطوں کو شکستگی سے ہم کنار کر دیتا تھا۔ چنانچہ ترقی پسند ادبا نے عزیز احمد کو چونک کر دیکھا اور اس شخص کو جو کبھی حیدرآباد کی شہزادی دُرِّ شہوار کا سیکرٹری رہ چکا تھا اور عثمانیہ یونیورسٹی میں ایک اعلیٰ تدریسی عہدے پر فائز تھا بغیر کسی تامل کے اپنی صفوں میں شامل کر لیا۔ عزیز احمد کی کتاب "ترقی پسند ادب" دیکھیں تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ الحاق یکطرفہ تھا اور عزیز احمد کی ذہنی وابستگی اس میں شامل نہیں تھی۔ چنانچہ عزیز احمد نے خود کو[۲] انقلابی تحریک کے ساتھ وابستہ کرنا ضروری نہ سمجھا۔

(ع) بلکہ بند ترقی پسندوں کی راہیں نہ صرف عزیز احمد سے الگ تھیں بلکہ ادبی مسلک کے لحاظ سے بھی ان میں خاصہ فرق موجود تھا اور یہ فرق واضح طور پر اس وقت سامنے آیا جب عزیز احمد نے ترقی پسند تحریک پر، نظریاتی بحث کا آغاز کیا اور "ترقی پسند ادب" جو اس تحریک کے نظریے اور ادب پر مدلل تنقید کا درجہ رکھتی ہے شائع کر دی۔ (ن) عزیز احمد کا خیال تھا کہ ترقی پسندی دو عناصر پر مبنی ہے، اولاً حقیقت نگاری اور ثانیاً انقلابی تحریک۔ حقیقت نگاری کے بارے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ یہ کسی ایک زمانے کی چیز نہیں بلکہ ہر زمانے میں کسی نہ کسی رنگ میں موجود رہی ہے اور زمانہ حسبِ ضرورت اس میں ترمیم و تنسیخ کرتا رہتا ہے۔ انقلاب کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ جب زندگی زنگ آلود ہو جاتی ہے تو انقلاب اس کا آب و رنگ نیا پیدا کرتا ہے۔ اس زاویے سے انہوں نے غالب، مومن، میر، سر سید، حالی اور اقبال کو ترقی پسند قرار دیا اور عصمت چغتائی، حسن عسکری، سردار جعفری اور کرشن چندر کے فنی عیوب کو عریاں کر دیا۔ چنانچہ جب ترقی پسند ادبا نے تنقید کے محاذ پر فتح یاب ہونے اور ترقی پسند ادبا کی تخلیقات پر تحسین کے پھول نچھاور کرنے شروع کیے تو عزیز احمد کی کتاب بھی ان کی جراحت کی زد میں آ گئی۔ (ر) عزیز احمد کا موقف تھا کہ حقیقت نگاری کسی ایک زمانے کی چیز نہیں بلکہ ہر زمانے میں موجود ہوتی ہے اور انقلاب زنگ آلود حقیقت میں اساسی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ ترقی پسندی کے اس فکری پس منظر میں عزیز احمد نے سماجی ضرورتوں کی نئی توضیح کی، جنسی حقیقت نگاری کا غیر مریضانہ رویہ واضح کیا۔ میر، مومن غالب اور اقبال کی شاعری سے ترقی پسند عناصر کا سراغ لگایا اور عصمت چغتائی اور محمد حسن عسکری کے افسانوں سے اُن عیوب کی نشان دہی کی جن سے اخلاقی قدروں کی شکستگی کا اندیشہ تھا۔ عزیز احمد کے خیالات کا یہ نوالہ ایسا تھا کہ ترقی پسندوں کے حلق سے آسانی سے اتر نہیں سکا۔ چنانچہ جب علی سردار جعفری نے ترقی پسندی کا تعارف ایک مخصوص نقطۂ نظر سے کرانے کے لیے کتاب

---

[۱] عزیز احمد کے اولین افسانے ۲۹ تا ۳۲ کے عرصے میں "مخزن" "نیرنگِ خیال" "مکتبہ" (حیدرآباد) اور "مجلہ عثمانیہ" میں شائع ہوئے جن میں سے "تقدیر کا گلہ" سب سے زیادہ لائقِ ذکر ہے۔ [۲] "اوراق" میں شائع شدہ فقرہ قدرے غیر مکمل ہے اور گفتگو کی رعایت سے یہ الفاظ اضافہ کیے گئے ہیں تاکہ کلمہ پورا ہو سکے اور مفہوم واضح۔

تھی تو اس میں عزیز احمد کے نظریات پر خاصہ شدید ردِعمل موجود تھا اور اُس کے بعد عزیز احمد کی جدیدیت کو ترقی پسند حلقوں سے کبھی داد نہیں مل سکی۔ اہم بات یہ ہے کہ اس ردِعمل پر عزیز احمد نے کسی تیزابی رویّے کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے حقیقت نگاری کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر تخلیقات کے ذریعے پیش کرنا شروع کر دیا۔

اقبال: ترقی پسندی سے تشکیلِ نو تک

"ترقی پسند ادب[۱۰] میں اقبال ایک ایسے شاعر کے روپ میں ابھرا ہے جو انقلاب کا محرک اور انقلابی ادب کی انتہا ہے۔ چنانچہ ان کا یہ نظریہ مبنی بر حقیقت ہے کہ اقبال کے تخلیقی کارنامے ترقی پسند ادب کی تخلیق کے سب سے بڑے محرک بنے۔ اقبال کے بارے میں عزیز احمد کا یہ مثبت رویہ ان کے فکر کا ایک مخصوص زاویہ ہے۔ "اقبال، نئی تشکیل" میں انہوں نے اقبال پر بڑی ذمہ داری سے قلم اٹھایا اور تجزیہ و تحلیل سے فکرِ اقبال کے نادر گوشوں کو ابھارا۔[ن] "اقبال عزیز احمد کی محبت کا ایک زاویہ تھا۔ انہوں نے اقبال کو عقلی زاویے سے پرکھنے کی کوشش کی اور "اقبال: نئی تشکیل" لکھ کر یہ ثابت کیا کہ اقبال کو جزدان میں لپیٹنے کی بجائے اس کی فکر و فن کو نئی تشکیل دینا ضروری ہے۔"[۱۱] عزیز احمد کو اس بات کا احساس تو ہے کہ پاکستان کا تصور زیادہ تر اقبال کے ذہن کا ہی نتیجہ ہے اور انہوں نے جمہوری و اشتراکی تصورِ وطنیت کے بجائے ایک نئی طرح کی قومیت کا تصور پیش کیا۔ لیکن وہ اقبال سے مرعوب ہرگز نہیں ہوتے بلکہ انہیں ایک ایسا شاعر قرار دیتے ہیں جس کی نئی تعبیر اور نئی تشکیل ضروری ہے۔ عزیز احمد کی یہ خوبی انہیں اقبالیات کے بہت سے ماہرین پر فوقیت دیتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اقبال پر ان کی کتاب کو اب تک اہمیت حاصل ہے اور شاید یہ مقامِ افتخار انہیں ہمیشہ حاصل رہے گا کہ انہوں نے اقبال کو متوازن اور معتدل زاویے سے پرکھا اور ان کے انفرادی زاویے غیر جانبداری سے دریافت کیے۔

اقبال[۱۲] پر عزیز احمد کے بکھرے ہوئے مضامین کو پچھلے دنوں طاہر تونسوی نے مرتب کیا اور ایک کتاب "اقبال اور پاکستانی ادب" شائع کی۔ لیکن صورت یہ ہے کہ اس کتاب کے حوالے سے طاہر تونسوی کا ذکر پہلے آتا ہے اور عزیز احمد کا بعد میں۔ گویا عزیز احمد کی زندگی میں ہی یار لوگوں نے اُن کے ادبی اثاثے پر قبضہ جمانے کی مہم شروع کر دی تھی اور وہ اس پر دم بخود رہے۔

مغرب کی داستانِ دانش اُردو میں

[۱۳] تنقید، ناول اور افسانے کے علاوہ عزیز احمد کی ادبی شخصیت ایک مترجم کے طور پر بھی بے حد مستحکم ہے۔ بوطیقا پر ارسطو کی بوطیقا ادب کی بنیادی کتابوں میں شمار ہوتی ہے اور یہ اتنی ثقیل ہے کہ اس کا ترجمہ رواں دواں اردو میں کرنا اور ارسطو کے اساسی نظریات کو نئے لبادے میں یوں پیش کرنا کہ اجنبی معلوم نہ ہوں بے حد مشکل کام تھا۔ لیکن اس مشکل

کو عزیز احمد نے آسان کر دیا۔ ارسطو[ت] کی شعریات کو انہوں نے "بوطیقا" کے نام سے اُردو میں ڈھالا اور یوں اردو کی نظری تنقید کا ایک دروازہ یونان کی طرف کھول دیا۔ [ا] نتیجہ یہ ہے کہ اب تک اس سے بہتر ترجمہ اُردو ادب میں پیش نہیں کیا جا سکا اور عزیز احمد کی اس عطا سے انکار ممکن نہیں کہ انہوں نے دانشِ یونان کو اُردو میں منتقل کیا اور اہلِ ادب کو ارسطو سے بلا واسطہ متعارف کرا کے اُن کے ذہنی افق کو بلند کرنے کی سعی کی۔ عزیز احمد کا ایک اور ترجمہ (ہیرالڈ لیمب) کا تاریخی ناول "چنگیز خان" ہے۔ اس ترجمے میں انہوں نے (ہیرالڈ لیمب) کے تخلیقی ذہن کو گرفت میں لے لیا ہے اور اپنی روانی شگفتگی اور رعنائی سے اسے ایک تخلیقی فن پارے کا درجہ دے دیا ہے۔

اسلام کی فکری جڑوں کی تلاش

زندگی[ل] کے آخری دور میں عزیز احمد نے اپنی تمام تر توجہ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف مبذول کر لی تھی۔ [ا] چنانچہ ٹورنٹو یونیورسٹی کینیڈا میں معارفِ اسلامیہ کے شعبے کے ساتھ وابستہ ہوئے تو انہوں نے برصغیر میں مسلمانوں کی تہذیبی زندگی پر قابلِ قدر کام کیا۔ انہوں نے جو تصنیفات پیش کیں اُن میں سے "اسلامی کلچر ہندوستانی ماحول میں" "ہندوستان میں اسلام کی علمی تاریخ" "پاک و ہند میں جدید اسلامی فکر" کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور ان کے حوالے مغربی مصنفین نے بالعموم اور ہندوستانی اور پاکستانی مورخین نے بالخصوص اپنی کتابوں میں دیے ہیں۔ [ع] آخری دور کی (ان) تالیفات میں انہوں نے اسلام کی فکری جڑوں کی تلاش پر زیادہ توجہ اور وقت صرف کیا (اور) اُن[ا] کی (یہ) کتابیں (جو) لندن سے شائع ہوئیں۔ اب حوالے کی کتب میں شمار ہوتی ہیں۔ برصغیر[م] کے مسلم کلچر پر (عزیز احمد کی) خیال انگیز کتاب پر ڈاکٹر تارا چند جیسے محقق بھی بھنا اُٹھے تھے اور خوا اس جعفری جیسے غیر جانبدار صحافی نے اس کتاب کے مندرجات سے استفادہ کیا تھا۔ پاکستانی قوم جب اپنے ادب کی تاریخ غیر جانبداری سے لکھے گی تو وہ عزیز احمد کی (اس) کتاب کو بھی رہنما بنائے گی کہ اس سے غیر جانبداری کا ایک نیا زاویہ ابھرتا ہے اور حقائق کا سامنا کرنے کی سکت پیدا ہو جاتی ہے۔ عزیز[ا] احمد نے "سسلی میں فروغِ اسلام" پر بھی ایک کتاب لکھی تھی اور ایک مجموعہ ہندوستان کی سیاسی اور مذہبی تاریخ پر بھی مرتب کیا تھا۔ [ل] انہوں نے روایتی پی ایچ ڈی بننے کے بجائے اپنی تصنیفات کی اساس پر ڈی لٹ اور ایف آر سی ایس کی ڈگریاں حاصل کیں اور فیلو آف دی رائل سوسائٹی آف کینیڈا منتخب ہوئے۔

اَن مِٹ نقوش

عزیز[ل] احمد کا شمار ان ادیبوں میں کیا جاتا ہے جو کسی ایک منزل پر نہیں رکتے۔ اُن[ع] کا فکر مسلسل مائل بہ ارتقا رہا۔ [لا]

ع۔ ابن پر ایک جامع مقالہ آپ نے بھی پیش فرما لیا ہے۔ ممکن ہو تو "دی ماسٹر بلڈر" کے ترجمہ عزیزیہ پر تاثرات کا اضافہ فرما لیجئے گا۔

ط۔ حضرت یہ کتاب چالس دیرسے منسوب ہے بجائے اسٹوپیم کی تصنیف ہے جس کی تلخیص سے ... عزیز احمد نے "تیرا لہو پند" [illegible] کا نقادوں کی رفتار کو گم [illegible] اُردو کا قابلِ مطالعہ کیا۔

کی ترقی کا گراف ایک پڑاؤ سے دوسرے پڑاؤ کی طرف تیزی سے لپکتا ہے اور ہمیشہ مائل بہ فراز ہی نظر آتا ہے۔[۱] عزیز احمد تعلقاتِ عامہ کے لب بستے پر " من ترا حاجی بگویم" "تو مرا ملا بگو" قسم کی تنقید پر جسے ترقی پسند تحریک نے ابتدا میں ہی پروان چڑھانا شروع کر دیا تھا یقین نہیں رکھتے تھے چنانچہ ایک طویل عرصے تک عزیز احمد ادب کی وادی میں یوں محوِ خرام رہے جیسے اپنے گھر میں ہی اجنبی ہوں۔ تاہم وہ اُس سے دل برداشتہ ہرگز نہیں ہوئے اور راتوں رات شہرت سمیٹنے کے لیے انہوں نے کبھی منفی حربے کو آزمانے کی سعی نہیں کی۔[۲] وہ خاص ادیب تھے، پڑھتے تھے، سوچتے تھے، فکر کرتے تھے اور جب ذہن کے آوے میں ردِعمل کا لاوا سلگنے لگتا تو قلم تھام لیتے تھے۔ پھر کبھی افسانہ کبھی ناول کبھی تنقید اور کبھی "مہمانِ عزیز" جیسی معرکہ آرا نظم تخلیق ہو جاتی ہے۔[ن] بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ عزیز احمد شاعر بھی تھے، انہوں نے اپنی تخلیقی روش سے ہٹ کر "نیا دور" میں ایک نظم "مہمانِ عزیز" لکھی تھی۔[ع] وہ ابتدا ایک آزاد خیال ادیب کے طور پر نمایاں ہوئے تھے۔[۲] انہوں نے ترقی پسند تحریک کے عروج کے دور میں ترقی پسند ادب پر معرکے کی تنقید لکھی۔[ن] عزیز احمد کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے تبصرہ نگاری میں ایک خصوصی زاویہ پیدا کیا اور اسے تحسین و ستائش کی زد سے نکال کر تنقید کی اقلیم میں داخل کر دیا۔ علی سردار جعفری کی کتاب "نئی دنیا کو سلام" کرشن چندر کی کتاب "ہم وحشی ہیں" اور آلِ احمد سرور کی کتاب "نئے پرانے چراغ" پر عزیز احمد کے جامع اور مدلل تبصرے پورے مقالات کا درجہ رکھتے ہیں۔[۲] انہوں نے اقبال کی نئی تشکیل پر اس وقت زور دیا جب اقبال کو پاکستانی قوم نے حکیم الامت کے مرتبے پر فائز نہیں کیا تھا۔

[۱] زندگی کے مختلف ادوار میں اگرچہ عزیز احمد کے اظہار کی اصناف میں تبدیلی آتی رہی لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ انہوں نے حال کے بجائے ماضی کو زیادہ اہمیت دی، جدیدیت کی طرف قدم بڑھایا لیکن نقوشِ پارینہ سے روگردانی اختیار نہیں کی۔ انہوں نے اپنی تہذیبی قدروں کو ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رکھا اور تکمیلِ حیات کے لیے زمان و مکان کی کروٹوں کو تخلیق، تنقید اور تحقیق میں اجاگر کرتے رہے۔[۲] میں ذاتی طور پر عزیز احمد کا ممنونِ احسان ہوں کہ مجھے ان کے مطالعے سے ہمیشہ تازگی کا احساس ہوا اور زندگی اور قدروں پر اعتماد بحال ہو گیا۔ عزیز احمد نے اردو ادب پر اپنے اَن مٹ نقوش ثبت کیے ہیں۔ (بلاشبہ) عزیز احمد ایک فاضل پاکستانی ادیب تھے۔[۲] زمانہ ایسے ادیب سے صرفِ نظر کر سکتا ہے، یہ سوال میں آپ سے دریافت کرتا ہوں!

عزیز احمد اور ترقی پسندی

[۱] بعض ادبی حلقوں سے یہ آواز مسلسل ابھر رہی ہے کہ "وہ بنیادی طور پر ترقی پسند نقاد تھے اور وہ باقاعدہ طور پر ترقی پسند تحریک کے مسافر رہے ہیں۔" اس میں کوئی شک نہیں کہ عزیز احمد نے اپنی تخلیقی اور تنقیدی تحریروں میں کسی جامد پابندی کو قبول

٭ اس مقالے کے حصوں میں باوجود تلاشِ بسیار اس مرحوم کے تاثرات کی جمع آوری میں اختر گرجنداں کا بیابانہ ہو گیا ہے۔ ممکن ہو تو براہ کرم ان الفاظ اسکے آخذ کے بارے میں بتائیں تاکہ حاصل کیے جاسکیں۔

نہیں کیا۔ اور ادب میں کشادہ روی، وسعت نظری اور آزادیٔ اظہار کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ تاہم یہ کہنا درست نہیں کہ "انہوں نے اپنی تحریروں میں ترقی پسند تحریک کے مقاصد کو پیش نظر رکھا" عزیز احمد کھلے ذہن کے نقاد اور ادیب تھے چنانچہ انہوں نے ترقی پسندی کو کسی خاص سیاسی مسلک کے ساتھ وابستہ کرنا قبول نہیں کیا۔ ترقی پسند تحریک ہندوستان میں آندھی کی طرح آئی تھی اور بگولے کی طرح پھیلنی شروع ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی لپیٹ میں ہر اس ادیب کو لینے کی کوشش کی جس نے ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ قلم تھاما تھا۔ اس تحریک کے رہنماؤں میں سرکردہ حیثیت سجاد ظہیر کو حاصل تھی اور انہوں نے اسے اُن سیاسی خطوط پہ چلانے کی بھی تبلیغ کی، جن کی تربیت وہ قیام لندن کے دوران کمیونسٹ اداروں میں باقاعدہ شمولیت سے حاصل کر چکے تھے چنانچہ ترقی پسند تحریک کا سیاسی زاویہ کبھی نظر سے اوجھل نہیں رہا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس تحریک نے ادب کو ہمیشہ وسیلے کے طور پہ استعمال کیا اور اسے سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ عزیز احمد ادب کو نظریات کے فروغ کا وسیلہ تو شمار کرتے تھے لیکن وہ اسے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال ہرگز نہیں کرتے تھے۔

مارکسی نقادوں نے ترقی پسندی کے جو محدود معانی متعین کیے تھے عزیز احمد کو اس سے بھی اختلاف تھا۔ بلاشبہ وہ ترقی پسند تحریک کو ایک جدید تحریک شمار کرتے تھے تاہم انہوں نے اس کے سیاسی مسلک کو اہمیت دینے کے بجائے اس تحریک کے دو عناصر یعنی حقیقت نگاری اور انقلاب کو زیادہ درخورِ اعتنا سمجھا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ حقیقت نگاری بنیادی قدروں کے صادق اظہار کا نام ہے اور یہ کسی نہ کسی انداز میں ہر زمانے میں موجود رہتی ہے۔ زمانہ اپنی ضرورتوں کے مطابق اور حالات کے تقاضے کی روشنی میں ان میں مناسب تبدیلی کرتا رہتا ہے۔ ایک زمانے کی حقیقت دوسرے زمانے کی حقیقت کا لازمی طور پر چربہ نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف یورپی ممالک میں حقیقت نگاری نے مختلف روپ بدلے اور ان کے پرتو ان ممالک کے ادب میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ عزیز احمد نے فرانس، اٹلی اور انگلستان کی حقیقت نگاری کو بھی اہمیت دی۔ ان کے ناول اور افسانوں میں جس حقیقت کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی اس پہ یورپی ادب کے اثرات نسبتاً زیادہ ہیں۔ دوسری طرف ترقی پسند تحریک نے صرف سوشلسٹ حقیقت نگاری کے فروغ کی سعی کی اور وہ تمام ادب جو اس زاویے کو پیش نہیں کرتا تھا ادب ماننے سے انکار کر دیا اور اس میں عزیز احمد کا ادب بھی شامل ہے۔

جہاں تک انقلابی تحریک کا تعلق ہے عزیز احمد نے اسے بھی محدود معانی کے ساتھ قبول کرنا پسند نہیں کیا۔ ان کا زاویۂ نظر یہ تھا کہ جب زندگی پیش پا افتادہ اور روایتی روش پہ چلنے لگتی ہے اور اس کی تخلیقی جہت سے لپک مفقود ہو جاتی ہے تو انقلاب ایک سماجی حقیقت بن کر سامنے آ جاتا ہے۔ انقلاب فکر کا ایک نیا راستہ دکھاتا ہے اور انقلاب عام طور سے عوام الناس کی اکثریت کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی عزیز احمد نے انقلاب کے اس تصور کو صرف سوشلسٹ انقلاب کے ساتھ متعلق نہیں کیا بلکہ انہوں نے نشانۂ تنقید کہنہ اور فرسودہ روش کو بنایا جس کے خلاف انقلابی ردعمل کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ عزیز احمد انقلاب کو ترقی کا معاون شمار کرتے تھے لیکن انہوں نے اس سے انہدامِ ماضی کی سعی نہیں

کی۔ عزیز احمد کو برصغیر کی ترقی پسند تحریک پر سب سے بڑا اعتراض یہی تھا کہ اس نے مجنونانہ انہدام ماضی کی طرح ڈالی۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ماضی کو منہدم کرنے میں تقسیم سے قبل کے برصغیر کی ترقی پسند تحریک کا بڑا حصہ تھا۔ یہ انہدام روایت شکنی کے جوش میں مجنونانہ سرگرمی کی حد تک بڑھ گیا۔ اس نے اچھے اور برے خزف و گوہر، رطب و یابس میں کوئی امتیاز نہیں کیا۔ ہندوستانی ادیب تو پھر ایک ذرا سا چکر کاٹ کر دیو مالا، بھگتی تحریک اور اہنسا کی طرف واپس لوٹ گئے لیکن ہندوستان کے مسلمان ادیب اور پاکستان کے ادیب اب تک تذبذب کے عالم میں ہیں کہ کس بنیاد پر اپنی تعمیر کریں۔ بہت سے جلتا کام چھپنے لگے اور روس کے جدید ادب کی پیروی کرنے لگے جس کا معیار ہر سال گرتا ہی جا رہا ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباس ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے جو انہیں پڑھنے کی کوشش نہیں کرتے، ان کے مضامین پر تصرف بے جا کرنے کے لیے قینچی مارتے ہیں اور پھر انہیں ترقی پسندوں کے خانے میں دھکیل دیتے ہیں۔ عزیز احمد کے ادبی ورثہ کے ان نا طاہر اور ناجائز وارثوں کو توجہ اس حقیقت پر دینی چاہیے کہ عزیز احمد پاکستان کے رہنے والوں کو ایک ملت اور ایک ثقافت کے محافظ شمار کرتے تھے اور وہ ایک ایسے ادب کے فروغ کے خواہاں تھے جس میں ماضی کی روایات جذب ہوں۔ اور جو ایک مستقبل کی طرف قدم اٹھائے۔" چنانچہ عزیز احمد نے پاکستانی ادب کی تحریک کو اقبال سے وابستہ کیا اور سب سے پہلے اقبال کی نئی تشکیل پر زور دیا۔ عزیز احمد نے برصغیر کی مسلمان قوم کے بارے میں جن تاثرات کا اظہار کیا ہے، ان کا حوالہ یہاں بے محل نہیں ہوگا۔ عزیز احمد لکھتے ہیں کہ "اس قوم کا ایک خاص دستورِ اخلاق ہے ایک خاص زاویۂ نظر ہے جس سے وہ دنیا اور طبیعیات اور زندگی کو دیکھتی ہے۔ اس میں ایک خاص طرح کی انسانیت ہے۔ ایک خاص طرح کی عالی ظرفی ہے جس سے وہ رنج و انبساط دونوں کو اسیر کر سکتی ہے۔ زندگی کی دوڑ میں اس قوم اور اس تمدن نے بھی بڑی قربانیاں دی ہیں اور سب سے بڑی قربانیاں تو اقبال کے مرنے کے بعد تقسیم کے بعد کے قتل عام میں دی ہیں۔ اس قوم میں اس تمدن اور ثقافت نے جو کچھ تخلیق کیا وہ اتفاقی یا اضطراری عمل نہیں تھا یہ ایک باشعور مسلسل باسلیقہ حرکت تھی جو اپنی تخلیق کے محرکات اور اس کے نتائج میں دوسری قوموں اور دوسرے محرکات سے ممتاز ہے۔"

اس نظریے کے فروغ کے لیے ہی عزیز احمد نے اپنا اہوارِ فکر اسلامی ثقافت، تہذیب، افکار اور تمدن کی تحقیق کی طرف موڑ دیا اور "ہندوستانی ماحول میں اسلامی کلچر" "ہندوستان میں اسلام کی علمی تاریخ" اور "پاک و ہند میں جدید اسلامی فکر" جیسی معرکہ آرا کتابیں انگریزی میں لکھیں، انہیں لندن سے شائع کیا اور فکر و ثقافتِ اسلامیہ کے نقوش کو عالمی سطح پر ابھارنے کی سعی کی۔ ایک ایسے مصنف اور ادیب کو جس نے برصغیر میں جدید اسلامی فکر کا سراغ لگانے کی جرأت کی تھی۔ اور اس پر عالمانہ تجزیہ و تبصرہ لکھا تھا محض شرقی مضمون نگاری میں ترقی پسند ادیبوں کی صف میں کھڑا کر دینا ان کے ساتھ انصاف نہیں خصوصاً اس صورت میں جب کہ خود ترقی پسند حلقے ان کے آزاد تصورات سے خوش نہیں تھے اور ان کے نظریات کو باطل ثابت کرنے کے لیے علی سردار جعفری جیسے سکہ بند ترقی پسند کو کتاب لکھنے کی ضرورت بھی لاحق ہو گئی تھی

عطا کاکوی

مظفر رزمی کی شاعری

فنی پابندی کے ساتھ دلی احساسات اور قلبی تاثرات کی تصویر کشی آسان کام نہیں ہر دل اور دماغ کے دریچے اتنے کشادہ نہیں جو کیفیات کو محسوس کرے اور ان سے اثر پذیر ہو کر الفاظ کے قالب میں ان کو سمو سکیں. یہ بالغ نظری فطری شاعری کے حصے میں آتی ہے مثل مشہور ہے کہ رونا اور گانا کس کو نہیں آتا مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر رونے والے میں دوسروں کو [illegible] بت نہیں ہوتی اور ہر گانا دلوں کو اپنی طرف جذب کر لینے کی صلاحیت نہیں رکھتا کہنے کو تو شعر سبھی کہتے ہیں مگر ایسے کتنے ہیں جو کاروانِ حیات کے نقش قدم کو آئینہ بنا کر اس میں مستقبل کا عکس دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، یہ صرف ان شعراء کا حصہ ہے جو چشمِ نگراں اور دلِ آئینہ ساماں رکھتے ہیں۔

مظفر رزمی ان گنے چنے شعراء میں ہیں جن کو نوجوان تو نہیں ہاں جوان کہہ سکتے ہیں جن کا حسن تخیل اپنے پورے شباب پہ ہے اور بالغ نظری ان کے کلام سے ہویدا ہے ان کا ایک مختصر مجموعہ کلام جس کا نام انہوں نے "گرمیٔ بازار" تجویز کیا ہے مگر میں ان کے کلام میں وہ گرمیٔ افکار پاتا ہوں جو قلب کو گرما دے اور روح کو تڑپا دے، یہ گرما دینے اور تڑپا دینے والی بات وہی کہہ سکتا ہے جو خود حوادث کی آگ میں تپ چکا ہو اور ماحول کے زہرہ گداز مناظر سے متاثر ہو چکا ہو۔ رزمی کی محبوب صنف شاعری غزل ہے اور یہ کافر غزل دھان پان ہونے کے باوجود اتنی سخت جان ہے کہ اس کا البیلا پن کبھی فرسودگی سے دوچار ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ نہ جانے کتنے بوالہوسوں نے اس پر ڈورے ڈالے مگر اس کی عصمت شعاری ہمیشہ آڑے آئی اور یہ نکھر نکھر کر اور بھی اپنی کافرانہ اداؤں سے دلوں کو موہتی رہی۔

اردو شاعری میں غزل ایک سدا بہار صنف ہے اس میں ہر موسم کے گل بوٹے کھلانے کی صلاحیت ہے فلسفہ اور تصوف جیسے خشک مسائل سے لے کر حسن و عشق کی رنگین داستانیں تک اس کا موضوع ہو سکتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ آپ اس میں نفسیاتی جذبات اور سیاسی ہیجانات کو بھی داخل کر سکتے ہیں مگر غزل کی ادائے دلبری ان کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتی

ہے اور تغزل کو مجروح ہونے نہیں دیتی۔

رزمی کے کلام میں حقائق و معارف بھی ہیں، جذبات و احساسات بھی، کوائف کی تصویر کشی بھی ہے اور حسنِ کلام کے حسنِ بیان بھی۔ ان کے یہ اشعار کتنے پُر کیف، معنی خیز [illegible] اور دل نشیں ہیں۔

بہت مہیب ہے دشتِ الم کی [illegible] خود اپنے سائے کو مڑ مڑ کے دیکھتا ہوں

زندگی کو ایک مرقعِ عبرت بیان کرتے ہوئے [illegible] انداز میں کہا ہے ؎

کھلی کتاب ہوں پڑھ [illegible] یہاں [illegible] سے جی چاہے
ہوا وہ تیز چلی [illegible] کھل گیا [illegible] ہوں میں

پہلا مصرعہ عامتہ الورود ہے، ہر شاعر کہہ سکتا تھا مگر د[illegible] ے مصرعہ میں جو کیفیت ہے وہ صرف رزمی کا حصہ ہے دیکھئے یہ شعر کتنا نفسیاتی پہلو لئے ہوئے ہے ؎

آج مائل بہ کرم ہیں وہ [illegible] خدا خیر کرے
ہم غریبوں پہ نوازش کبھی ای[illegible] نہ تھی

ان کی نگاہ بصیرت ان سے یہ شعر کہلوا دیتی ہے ؎

ہم چشمِ بصیرت کے مارے کیا لالہ و گل سے بہلیں گے
اب ذکرِ بہاراں رہنے دو، ہم نے بھی بہاراں دیکھا ہے

اس شعر کے ٹکڑے "ہم نے بھی بہاراں دیکھا ہے" میں کتنی تلخ حقیقت اور کرب شامل ہے۔

غرض ان کے سارے کلام میں یہ درد انگیزی اور ان کی اپنی ساری تپش اندوزی اور کرب ریزی کے ساتھ جلوہ گر ہے مگر اس الم کی کے باوجود ان کا دل امید کا گہوارہ اور تمنا کا تابناک ستارہ ہے۔ دل میں عزم ہے اور یقین محکم۔ وہ حافظ کے لہجہ میں بیا تا گل بیفشانیم کے ساتھ طرحِ دیگر اندازیم کا بھی عزم رکھتے ہیں اور غالب کی طرح بیا کہ قاعدہ آسمان بگردانیم کا ولولہ بھی اُن کے دل میں موجزن ہے ؎

ستارے توڑ کے لانا ہے اب زمیں کیلئے اور اس زمین کو اک آسماں بنانا ہے

کس غضب کا شعر کہہ دیا ہے۔

یہ حادثات یہ دریائے وقت کی لہریں
انہی کو کشتیٔ عمرِ رواں بنانا ہے

لہروں کو کشتی بنانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، یہ رزمی کا حصہ ہے۔ چھوٹی بحروں میں اثر آفرینی پیدا کرنا ایک اعجاز ہے دیکھئے رزمی صاحب کی یہ سحر طرازی، یہ طرزِ بیان کتنا شگفتہ، کتنا پُر تاثیر اور کتنا دلربا ہے ؎

عمرِ رفتہ کو دے کے آواز ماضی کو قریب لا رہا ہوں
رونقیں شہر کی بہلا نہ سکیں اپنا اُجڑا ہوا گھر یاد آیا
محرمِ زندگی نہیں ہے ابھی آدمی آدمی نہیں ہے ابھی
خونِ دل کس نے ملایا ان میں کیا یہی رنگِ حنا تھا پہلے
کسی کی بے نیازی کا ہے رونا دلِ برباد کا ماتم نہیں ہے

کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی سمو دینا بڑا مشکل کام ہے رزمی صاحب اس مرحلہ سے بڑی خوبی سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ ایک ایک شعر میں ایک دنیائے تخیل سمیٹ کر رکھ دی ہے۔ اردو شاعری میں غزل سے بھی نازک صنفِ کلام رباعی ہے، اس کا چوتھا مصرعہ غضب کا ہے، کتنے شعراء سے تو یہ آنکھ بھی نہیں ملاتی۔ میرؔ و سوداؔ کو ایک جھلک نصیب ہوئی۔ غالب بے چارہ تسبیح کے دانے شمار کرتا رہا۔ ہاں جوشؔ و فراقؔ نے البتہ آنکھیں مل مل کر اس کو دیکھا۔ امجدؔ نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اسی لیے اردو کے شعراء عموماً اس سے کترا کر نکل جاتے ہیں۔ رزمی نے چند ہی رباعیاں کہی ہیں مگر انہی سے اس بات کی غمازی ہوتی ہے کہ آج نہیں تو کل رباعی گویوں میں ان کا شمار صفِ اول کے شعراء میں ہوگا کیونکہ کچھ یہی کہتے ہیں، آپ ان کی چند رباعیاں سنیئے اور مری طرح ان سے لطف اندوز ہوجیے۔

اک سوزِ فغاں بہ سینۂ ساز تو دو جنبش بہ حجابِ خلوتِ راز تو دو
فریاد کناں ہے شہر و صحرا کا سکوت اپنے ہم نفسو کہاں ہو آواز تو دو

رباعی کے فن کی پوری رعنائی اس میں موجود ہے سکوت کی فریاد کا کیا کہنا اور چوتھا مصرعہ جو رباعی کی جان ہوتا ہے کس بلند آہنگی کا مظہر ہے۔ دوسری رباعی سنیئے:۔

دامانِ قبا لئے تار سی لیتے ہیں زہراب بھی پینا ہو تو پی لیتے ہیں
ایسے بھی ہیں کچھ لوگ کہ جن کو رزمی جینا نہ بھی آتا ہو تو جی لیتے ہیں

بے چارگی حیات کی اس سے بہتر تصویر بھی ہو سکتی ہے؟

الغرض رزمی ایک حساس دل و دماغ رکھتے ہیں اور ان کا موقلم بھی بڑی چابک دستی سے ان کے جذبات و کیفیات کی تصویر کشی میں ان کا معاون ہے ان کی شخصیت خود ان کے اس شعر سے ظاہر ہو جائے گی۔

وہ سخت لمحے جو اہلِ وفا پہ گزرے ہیں
سنو سنو انہی لمحات کی صدا ہوں میں

پروفیسر شمیم احمد

خاک کے ڈھیر میں یہ بات کہاں سے آئی؟

شعر و شاعری میں جانتا نہیں اس کا ٹھیکہ سنا ہے کہ صرف جعلی شاعروں اور افسانہ نگاروں نے لے رکھا ہے۔ میں تو اسی معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت میں کسی شاعر اور ادیب کے صرف اس حصہ میں SHARE کرتا ہوں جو معاشرے کے ایک فرد ہونے کی حیثیت میں میرے اور اس کے درمیان دردِ مشترک ہے۔ اور میں اس کی تلاش کرتا ہوں کہ کون سا شاعر یا ادیب ان سوالات، تضادات اور معاملات کو بھوگ رہا ہے جو ہمارے معاشرے کے باطن اور فرد کے درمیان پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ میری تلاش ایسے ہی لکھنے والوں کا پیچھا کرتی ہے جو اپنے باطنی اور خارجی عوامل سے "معاملہ" کرنے کا جوہر رکھتے ہیں۔ اور میں ان کو اپنی تفتیش، جستجو اور تشویش میں شامل کر کے یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی شاعری میں اس "معاملے" کو کس طرح حل کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ میں ایک دھوکے سے بچنے کی بھی شعوری کوشش کرتا ہوں جو اکثر شاعروں کو "خاص" شاعر بننے اور دکھانے میں مبتلا رکھتا ہے یہاں میں صرف ان شاعروں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جو شاعر کی حیثیت میں اپنی پبلسٹی کرانے یا منوانے کی سعی اور کوشش میں مصروف رہتے ہیں بلکہ اُن شاعروں کا ذکر کر رہا ہوں جو اپنی شعری اور تخلیقی زندگی، تجربے یا انفرادیت کے ذریعہ ہی "اصلی شاعر" بننے کے مدعی ہیں۔ کچھ زمانے سے انھوں نے نئی بات، نئے احساس، نئے درد اور نئے انسان کی بالا جینے کے ساتھ ہیئت کے نئے تجربوں کی اہمیت اور پرانے شعری سانچوں کی تحقیر اور تذلیل کا کام ترک کر رکھا ہے۔ اور اب اُن کا تازہ شگوفہ لفظی صناعی کے ساتھ کسی بھی احساس کی سچائی کو باندھ دینا ہے۔ ہماری شاعری میں یہ کوئی نیا کام نہیں مگر یہ عمل ہمارے جدید شاعروں کے لیے اتنا ہی نیا ہے۔ جیسے کسی فیشن پریڈ میں چوڑی دار پاجامہ اور کرتا پہن کر آنے والی اس دوشیزہ کا ہوتا ہے۔ جو اسے بہت بڑا جدید پہناوا سمجھتی ہے ـــــ حالانکہ لفظ کو جانے بغیر اس سے صناعی کا کام لینا اور احساس کی سچائی کے معنی بغیر سچ کے معنی جانے کیسے بیان ہو سکتے ہیں اس کا اندازہ ہر معقول شخص کر سکتا ہے

ان سے بات کیجیے تو یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ہم زبان اور جذبہ دونوں کی تجرید کے قائل ہو چکے ہیں۔

اللہ اکبر۔ ۵۔ بدستِ بچگاں افتاد

اب ایسی فضا میں ایک ایسے شاعر کا تذکرہ کیا کروں جس کو خود کو بحیثیت شاعر پیش کرتے ہوئے بھی حجاب رہا ہے۔ اور جس کی شاعری میں، شاعری کا نیا تو نیا کوئی پرانا تصور بھی پیش کرنے کا شوق ایک ...بہت موجود نہیں ہے۔ اور جو خود کو شاعر کی حیثیت سے زیادہ معاشرے کے ایک عام فرد کی حیثیت میں جاننے کی خواہش اور نہ جاننے کے عمل میں مبتلا ہے۔ شاید یہی مسئلہ ہم جیسے عامیوں کی زندگی کا سب سے بڑا عذاب ہوتا ہے، بات یہ ہے کہ خود کو جاننے اور نہ جاننے کے درمیان انتہائی تخلیقی آسودگی کے ساتھ، انتہائی عذاب سہنے کے کئی مرحلے آتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ بعض شاعروں کے یہاں نہ جاننے کا عمل ہی ان کی شاعری کا پہلا ہے۔ چنانچہ جب میں محمد ابن الحسن کا شعری مجموعہ "آبگینہ" پڑھنے بیٹھا تو مجھے سب سے پہلے جس چیز نے متوجہ کیا۔ وہ یہ بات تھی کہ ابن الحسن ایک شاعر سے زیادہ ایک فرد کی حیثیت سے معاشرے کے انجانے پہلوؤں پر برابر نظر جمائے رکھتے ہیں۔ اور ان کی شاعری اسی عمل سے پیدا ہوئی ہے۔ محمد ابن الحسن کوئی نوجوان اور نئے شاعر نہیں ہیں۔ وہ اپنی عمرِ طبعی کے آخری زمانے میں داخل ہو چکے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی تربیت، اپنے تہذیبی ورثہ، معاشرتی اقدار اور ادب و شعر کے بنیادی اور کلاسیکی سرمائے میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ جو ہمارے مجلسی ادیب اور شاعر نہیں جانتے کیونکہ جاننے میں ان کی اپنی ذات کی دیوار ہی رکاوٹ بنی رہتی ہے۔ جاننے کے اسی عمل سے ابن الحسن کے یہاں بڑی آسودہ شعری لہریں پیدا ہوتی ہیں جو فرد اور معاشرے کے ربط اور تعلق کی دھڑکنوں کو اپنے اندر جذب کیے ہوتے ہیں۔ ذرا یہ چند اشعار دیکھیے اس میں کیسی تخلیقی آسودگی اور فرد کی طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے یہ ایک ہی آپے اور سراپے کا حصہ ہوں۔

بجتی رہی اک کانچ کی زنجیر برابر
اک خواب سا ہم رقص رہا عمرِ رواں میں

میں جو کچھ دیکھتا ہوں کچھ مجھے اچھا نہیں لگتا
مگر یہ آسماں پر بادلوں کا تیرنا مل کر

لاکھ تم اجنبی بن لیے بھی اجنبی نہیں
کیا کوئی قدرِ مشترک راہ کی چاندنی نہیں

اس میں بلندیاں تمام اس میں تمام پستیاں
یعنی یہ آدمی جو ہے، اس میں کوئی کمی نہیں

دن بھر تو کڑی دھوپ تھی سایہ تھا گریزاں
شام آئی ہے، تنہائی ہے جاں آئی ہے جاں میں

منظر نظر کے سامنے ہر لحظہ اور ہے
لے جا رہی ہے آپ کو جلوہ گری کہاں

خواب و حقیقت باہم اپنے رقص فسوں انگیز میں ہیں
کون ہو تم اور کون ہوں میں اب کوئی نہیں پہچانے گا

تھک گئی ہوں گی نگاہیں آئینے کے روبرو
اب یہ گرد و پیش کی پھیلی ہوئی دنیا بھی دیکھ

وقت کتنا ہی کٹھن ہو کٹ ہی جاتا ہے حسن
کس قدر دشواریاں تھیں کتنی آسانی رہی

شام ابد کا صبح ازل سے ہے انتظار
فارغ بہت ہوں کار فراغت بہت مجھے

یوں سہل تو دریا کو روانی نہیں ہوتی
دریا کے اگر ساتھ کنارے نہیں ہوتے

وقت کٹ جاتا ہے اکتاہٹ نہیں ہوتی حسن
روز مرہ کے مشاغل سعیٔ لا حاصل نہیں

موجیں یہ اٹھ رہی ہیں دلِ مطمئن سے یوں
جیسے کہ مل گیا ہو سمندر سے آسماں

اک اپنی کائنات سی تعمیر کیجیے
سارے جہاں سے دور ہیں سب کے دلیل

سجدہ ہر ایک گام پہ کرتا ہوں شکر کا
مجھ کو جبیں کے ساتھ میسّر ہے آستاں

اب ذرا ان اشعار کو غور سے اور سمجھ کر پڑھیئے تو آپ کو ان اشعار کے باطن میں ایک مرکزیت کا احساس ہوگا۔ یہ مرکزیت ہرگز فرد پہ قائم نہیں ہے۔ ابن الحسن صاحب کی شاعری اور موجودہ شاعری میں یہی تو بنیادی فرق ہے۔ یہ مرکزیت زندگی کے اجتماعی عمل میں حسن، صداقت اور خیر کے اثبات سے پیدا ہوتی ہے۔ جو کسی بسیط حقیقت سے رشتہ پیدا کر کے خود کو بھی اسی تخلیقی سلسلہ میں شامل کر لیتی ہے۔ جس کا نام کائنات بھی ہے اور فرد بھی۔ ان اشعار کا شاعر ذاتی اور اجتماعی زندگی کو ملا کر دیکھ سکتا ہے اور ملانے کی یہ صورت موجودہ شاعری سے بالکل مختلف نظر آئے گی۔ ملانے کا یہ کام تو ہر شاعر کرتا ہے۔ کچھ لوگ خارجی زندگی (جس کو وہ زندگی کے حقائق کہتے ہیں) کو اپنے احساس کی شدت سے ملا کر یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اجتماعی زندگی کے تقاضے پورے کر دیئے کچھ لوگ انفرادی تجربات سے اجتماعی طرزِ احساس تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس میں یک جائی ممکن نہیں ہوتی۔ کیونکہ فرد جس جگہ خود کو اظہار میں لانے کی زیادہ کوشش کرتا ہے وہ اجتماعی اثبات سے انحراف کے بغیر ممکن نہیں ابن الحسن صاحب کے یہاں یہ عمل باطن میں اس طرح موجود ہے کہ وہ ایک دوسرے سے الگ محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ باطن میں ایک ہے اُن کی تنظیم اور ترتیب جس مرکزیت پر قائم ہے۔ دراصل وہی اصل بنیاد ہے۔ اور اسی عمل سے آسودگی، طمانیت اور قبولیت کی وہ نرمی پیدا ہوتی ہے جو ابن الحسن صاحب کی پہچان ہے۔ چنانچہ وہ خود بھی اس راز کا اظہار یوں کرتے ہیں

کہتا تو وہی کچھ ہے جو محسوس کیا ہے
پیرایہ ہو مانوس، گھلاوٹ ہو بیاں میں

اب آیئے ان کی شاعری کے دوسرے پہلو کی طرف جس کو میں نے اپنے جیسے عامیوں کا مسئلہ کہا ہے یعنی نہ جاننے کا عمل ان کے یہاں کونسا سوال پیدا کرتا ہے۔ جب سے ہمارے یہاں مغربی طرزِ احساس کی قلم لگی ہے نیا ادب پیدا ہونا شروع ہوا ہے۔ نہ جاننے کا عمل نفی سے پیدا ہوتا ہے۔ جس کی بنا پر مرکزیت سے رشتہ ٹوٹا ہے۔ اور فرد اور معاشرہ، فن اور فن کار ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سارا انتشار اسی سے پیدا ہوا ہے۔ زندگی کے مطالبات، جن تضادات اور سوالات کو پیدا کرتے ہیں۔ اُن میں ہم آہنگی کیسے پیدا کی جائے اور یہ ایک

عامی کی حیثیت میں زندگی کی معنویت تک کیسے رسائی حاصل کروں یہی میرا اور معاشرے کے عام فرد کا سب سے بڑا عذاب ہوتا ہے۔ ابن الحسن صاحب کے یہاں مجھے یہی عمل سب سے زیادہ متوجہ کرتا ہے کہ وہ عام آدمی کے اس مسئلہ کو عامی ہی کی طرح جھیل گئے ہیں۔ ذرا ان اشعار کے باطن میں جھانکیے تو آپ کو ان کا اصل مسئلہ معلوم ہو جائے گا

اے حبابِ خود نگر اب جانبِ دریا بھی دیکھ
تن کے محمل سے نکل کر وسعتِ صحرا بھی دیکھ

دھوپ کی کرنیں ہوا میں بکھری ہیں آپ ہیں
ایک ان کے درمیاں احساس کا رشتہ بھی دیکھ

کبھی مجبوریاں شدت سے چونک اٹھتی ہیں سینے میں
تو سناٹا اتر آتا ہے، رہ جاتا ہے دل ہل کر

یادوں نے دن رات کی جانب جبر کا رشتے ہیں
ورنہ کبھی کے ڈوب چکے ہیں میرے افق کے شمس و قمر

ہجر کی رات سہانی آئی، ہوتی ہے تجدیدِ وفا
درد نے گویا ہاتھ رکھا ہے میرے خفیہ شانوں پہ

کھڑکی کھولو کچھ تو یہاں بھی تازہ نرم ہوا آئے
منظرِ صحنِ چمن کا ابھرے بہتے درد رُبا آئے

بے جان تن میں جان سی آئے نسیمِ عشق تازہ ہو
یادیں رنگِ حنا کا مہکے رقص میں بادِ صبا آئے

اپنی کوئی ادا نہیں بھاتی،
دوسروں سے بھی بدگماں ہم ہیں

وہی غیب و حضور کی الجھن
اک اشارہ سا ہے پسِ چلمن

سب سے دامن کشاں گزر جاتا
لوگ آتے تھے راستہ نہ ملا

مجھے تو کچھ بھی نہیں ہے ترے سوا معلوم
تجھے بھی ہوگا یہ جانکاہ ماجرا معلوم

آتی ہے روشنی تو گئی تیرگی کہاں
اب ڈھونڈتی پھرے گی مجھے آگہی کہاں

ہر اک گام پہ راہیں کتنی ساتھ لی ہیں بچھڑی ہیں
کوئی کیوں اس الجھاوے میں رستے کو پہچانے کیا

خاموشیِ ہجراں میں ہر اک سانس صدا ہے
ہر سانس کو آسائشِ فریاد رہی ہے

میں زندانیِ ذات، گھبرا کے آخر
کچھ اب اور اپنے سوا ڈھونڈتا ہوں

مہر پہ سایۂ بارِ شہر کے، جال سے موتیں الجھی ہیں
کوئی حسن اس الجھاوے کو جانے ذرا سلجھا آئے

آپ نے دیکھا کہ ان اشعار میں نہ جانے اور ذاتی اور اجتماعی زندگی کے ارتباط کی تلاش کے کتنے مرحلے موجود ہیں۔ ان اشعار کی سریت سے آپ دھوکہ نہ کھائیں اس میں زندگی کے ٹھیٹ مسائل اور خواب بہت نمایاں نظر آرہے ہیں۔ ابن الحسن صاحب نے جو کوشش اور سعی کی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ فرد کی ٹھیٹ زندگی کے سوالات کو روحانی کاوِش کے یا اگر آپ کو روحانی پر اعتراض ہو تو اجتماعی طرزِ احساس" سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ اور یہی وہ عمل ہے جس کی وجہ سے مجھے ابن الحسن صاحب سے یک گونہ دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔

ایک چھوٹی سی بات مجھے اور محسوس ہوتی ہے کہ ابن الحسن صاحب جیسے نرمی اور گھلاوٹ رکھنے والے شاعر کے یہاں یگانہ کا اثر کیسے موجود ہے؟ مگر قصہ یہ ہے کہ ابن الحسن کے یہاں یگانہ کے سب سے دلآویز اور خوبصورت لہجے سے ہم آہنگی ملتی ہے۔ ان کے طنطنے والے اور کھردرے لہجے پر یعنی ان دو تین اشعار ہی سے آپ کو اس کا اندازہ

ہو جائے گا۔ ...

جان میرا یہ کشش کیسی ہے
دل کا کیا حال کرے گی دنیا
رنگ بدلے گی ابھی اور بہت
آپ کی رنگ بدلتی دنیا

ماضی، حال اور آئندہ کے رنگ بدلتے نظارے
آتے جاتے دیکھ رہا ہوں بستی کیا ویرانے کیا

آخری شعر کے دوسرے مصرعہ میں آپ کو ایک آواز اور محسوس ہو رہی ہوگی۔ ناصر کاظمی کی۔ اس مختصر سے مجموعہ میں مجھے جو کچھ ملا ہے۔ وہ میں نے پیش کر دیا ہے۔ مگر وہ چند اشعار اور دیکھئے جہاں ابن الحسن صاحب تنہا بھی ہیں اور نمایاں بھی۔

بہائے جو لیے جاتی ہیں تجھ کو تند خو موجیں
یہی موجیں سفینہ ہیں، انہی موجوں کو ساحل کر
یہ کیسی خود نمائی، خود فراموشی کا عالم ہے
غضب کا رنگ نکھرا ہے صبا کا گل کا جھل مل کر
زمیں سے آسماں تک فاصلہ آنکھوں کی زد میں ہے
نگاہوں کی مسافت میں حسن خود کو بھی شامل کر

بادل، بارش، تیز ہوا میں، کیا کیا یادیں امڈی ہیں
دور تھے تو پیڑوں کی چادر ڈالے کے پچھاؤں یاد آئے
پہلی سی تنہائی نہیں ہے اب لیکن تنہا ہوں میں
ساتھ چلے ہیں پیڑ کے سائے چاند ستارے راہگذر

ماہ گزیدہ رات ہے ساکت۔ جیسے کوئی آئینہ
اوس کے سبزے پہ گرنے کی شاخوں میں صدا آئے

اُٹھتے ہوئے کہسار اُمڈتے ہوئے دریا
کھلتے ہوئے آفاق مرے عزم جواں میں

ہنستی ہوئی آنکھوں کا تصور نہیں مٹتا
قائم ہے بہاروں کی فضا فصلِ خزاں میں

اتری ہیں کبھی میرے دریچے سے بھی کرنیں
اب اُن کی تب و تاب ہے احساس زیاں میں

ابد کی راہ ہے منزل ہماری
سنئے دن رات کا قصہ پرانا

حسن کی اب تو عادت ہو گئی ہے
الگ بیگانگی سے مسکرانا

دور تک ہے بسیطِ خاموشی
اس خموشی کے درمیاں ہم ہیں

رات آئی ہے بھٹکے ہوئے دن بھر کے مسافر
اب ڈھونڈتے ہیں اپنا پتہ کرتے تباں ہیں

مجھے ابن الحسن کے کلام اور اس سے زیادہ اُن کے لب و لہجہ سے خواجہ میر درد کا لہجہ بہت یاد آیا۔ اُن کے کلام کا سارا مسئلہ یہ ہے

آخر الامر آہ کیا ہو گا
کچھ تمہارے بھی دھیان پڑتی ہے

اور لہجہ میں یہ گھلاوٹ بھی ایسی ہے۔

اتنا پیغام درد کا کہنا
گر صبا کوئے یار سے گذرے
کون سی رات آپ آئیں گے
دن بہت انتظار میں گذرے

کرنل غلام سرور

محمد ابن الحسن کا عالمِ نیرنگ

محمد ابن الحسن کے شعری کلام کا اسلوب و لہجہ، بوقلموں زندگی کی بدلتی ہوئی کیفیات کا اسلوب و لہجہ ہے۔ وہ قدیم رنگِ شاعری کو بڑی پختگی اور رچاؤ سے اپنا کر غزل سرا ہوتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ جدید طرزِ احساس سے ہمکنار ہو کر آزاد نظم تخلیق کرنے کی بھی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے مشاہدات و واردات کے اظہار کے لئے نئے حوالوں کا سہارا لیتے ہیں۔ مگر اس عمل میں وہ غزل کے مروّجہ نقشہ کو مسترد نہیں کرتے۔ ان کے کلام میں قدیم اور جدید کا ایک خوشگوار امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے قدیم قصرِ غزل کی اندرونی آرائش نئے تقاضوں کی روشنی میں یوں کرتے ہیں کہ ان کی غزل روایت کی زمین میں پیوست ہوتے ہوئے بھی ہواؤں میں آزاد درختوں کی مانند پرکشادہ اور جدیدیت کی دھوپ میں نہائی نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں قدیم سے جدید کی طرف سفر کسی چونکا دینے والی بغاوت کی نشاندہی نہیں کرتا بلکہ لمحہ لمحہ آگے بڑھتا ہوا یہ ایک حرکی عمل ہے۔ ان کے طرزِ اظہار میں روایت کی ایک مانوس رچی بسی کیفیت ہے اور موضوعات میں ایک خوشگوار نیا پن۔ ان کے ہاں، نئی اور پرانی قدروں کے ردّ و قبول کا عمل مسلسل جاری ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں صحت مند جدیدیت کے ساتھ ماضی کے مقبول اسالیبِ اظہار کا جاندار ورثہ بھی ملتا ہے۔

ابن الحسن کے کلام میں تنوع کی فراوانی ہے۔ ان کے ہاں فلسفے کے پُرپیچ مسائل پر گفتگو بھی ملتی ہے اور رومانی طرزِ فکر کی رنگینی بھی۔ بقول ظہیر فتح پوری، ذات کے ساتھ کائنات، وضاحت کے ساتھ اشاریت، معاشرے سے مغائرت اور قربت بیک وقت ان کے کلام میں موجود ہیں۔ وہ قاری کو اپنا رازداں بنا کر اس پر عرفان کی تہیں کھولتے چلے جاتے ہیں۔ عرفانِ ذات کی یہ آگہی ان کے کلام کو ایک نئے منظر نامے سے آشنا کراتی ہے۔ ان کا بنیادی مزاج ایک صوفی (MYSTIC) کا ہے۔ وہ پوری کائنات کو ایک مربوط اور منضبط اکائی کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے کلام میں اپنے من کی دنیا بساتے نظر آتے ہیں۔ ایسی دُنیا جو ان کے الفاظ میں، درد کی، دل کی اور دعا کی دنیا ہے۔ وہ اپنی چشمِ بینا سے دنیا کی نیرنگیوں کا نظارہ کرتے ہیں۔ انہیں گلہ ہے کہ دنیا ان کی جانب متوجہ نہیں ہو رہی، حالانکہ وہ اپنے اندر ایک عالمِ امکاں

سمیٹے ہوئے ہیں۔

حسن داخل میں تنہائی سے رجوع کرتے ہیں۔ مگر ان کا ذات کی طرف یہ رجوع خارج سے فرار یا بیرونی محاذ سے پسپائی کا غماز نہیں۔ بلکہ خارج سے نبرد آزما ہونے سے پہلے کشفِ ذات کی وہ منزل ہے اور تخلیقی تنہائی کی وہ ساعت ہے جو خود دریافتی اور خود آگاہی کے لئے ضروری ہے۔ ان کی غزل، زندگی کی تلخیوں کے باوجود ایک ایسا سنبھلا ہوا اور سنجیدہ لب و لہجہ رکھتی ہے، جو رجائی اور زندگی بخش رویوں سے پھوٹتا ہے۔ ان کے کلام میں یاسیت کی جھلک بھی ملتی ہے مگر مجموعی طور پر رجائیت کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ گھپ اندھیروں میں بھی روشنی کے خواب دیکھتے ہیں۔ اور پھر انہیں زندگی کی مسکراہٹیں یوں نظر آتی ہیں : ؂

قدم، قدم پہ اندھیروں میں روشنی کے خواب
امید و بیم کے حلقوں میں زندگی کے خواب
سراب زار پہ بے داغ چاندنی کے خواب

اور پھر فرماتے ہیں :-

نقوش جوششِ نو کے اُبھرتے جاتے ہیں
رکاوٹوں پہ بپھرتے، سنبھلتے جاتے ہیں
ہوائے شوق چلی ہے، سنورتے جاتے ہیں

انہیں رات کے اندھیاروں میں جگنو چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور پھر گرد و پیش ماحول میں انہیں نادیدہ اشاروں کا فسوں اپنا رنگ دکھانے لگتا ہے : ؂

پتوں میں گئی رات نمودار ہوں جگنو
ماحول میں نادیدہ اشاروں کا فسوں ہو
پلکوں پہ کبھی ایسے دمک آئیں وہ آنسو
جس سے دلِ بے تاب کی موجوں کو سکوں ہو

حسن کے تخلیقی رویہ کی نمایاں خصوصیت ان کا طرزِ احساس ہے۔ وہ اشیا اور ان سے وابستہ حقائق کو ایک حساس آنکھ سے دیکھتے ہیں اور احساس کی شدت کو برقرار رکھتے ہوئے اس کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا ذات کا اندر سفر، اپنے وجود کو عرفان اور ذات سے باہر کا تصادم، اس بے ہنگم شور میں اپنی آواز اور بے کراں ہجوم میں اپنی اکائی کی شناخت کے لئے ہے۔ وہ مجرد لمحوں میں جیتے ضرور ہیں، مگر ان میں ڈوبتے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حال میں گم ہونے کے باوجود ان کے ہاں زیرِ تجربہ لمحوں کا مطالعہ اور تجزیہ ملتا ہے بسا اوقات وہ اپنے حصار سے نکل کر کائنات

کے اسرار و رموز پہچاننے کی کوشش میں سرگرمِ عمل ہو جاتے ہیں۔ اسی حوالے سے وہ "حبابِ خودنگر" کو "جانبِ دریا" دیکھنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ وہ اپنے قاری کو "تن کے محل" سے نکال کر اسے "وسعتِ صحرا" سے روشناس کراتے ہیں۔ ان کی نگاہیں آئینے کے روبرو جب تھکنے لگتی ہیں تو وہ انہیں اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی کائنات پر مرکوز کر دیتے ہیں۔ وہ بیک وقت ہوا میں دھوپ کی کرنوں اور پانی میں تیرتے ڈوبتے سنگریزوں کے حسن سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک، ان دو اکائیوں کے مابین احساس کا ایک لطیف رشتہ موجود ہے۔ فرماتے ہیں :

اے حبابِ خودنگر اب جانبِ دریا بھی دیکھ
تن کے محل سے نکل کر وسعتِ دریا بھی دیکھ
تھک گئی ہوں گی نگاہیں آئینے کے روبرو
اب یہ گرد و پیش کی پھیلی ہوئی دنیا بھی دیکھ
دھوپ کی کرنیں ہوا میں، سنگریزے آب میں
ایک ان کے درمیاں احساس کا رشتہ بھی دیکھ

محمد ابن الحسن کا تخلیقی رویہ، داخل سے پھوٹتا اور خارج میں ملتا نظر آتا ہے۔ ذاتی واردات کے ساتھ آج کے زندہ اور حساس شاعروں کی طرح، ان کے ہاں بیرونی صورتِ حال کی تصویریں بھی ملتی ہیں۔ یوں خود ... کے ساتھ ساتھ لمحہ لمحہ بدلتی ہوئی خارجی حقیقتوں سے آگاہی، ان کے شعری شعور کو داخل اور خارج کے مابین ایک پل کی مانند سامنے لاتی ہے۔ اور اس مخصوص حوالے سے ہم انہیں ایک متوازن شاعر کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ ان کی آواز آج کے مریضانہ دور میں خود آگاہی کے راستے پر نکلے ہوئے نئے انسان کی آواز ہے۔ داخلیت سے خارج کی طرف سفر کے دوران وہ ظاہر کی بوقلموں دنیا کے تازہ، نرم ہوا کے جھونکوں سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ اس عمل کے دوران صحنِ چمن کا نظارہ، اپنی پوری تابانی کے ساتھ ان کے سامنے آ جائے۔ انہیں یقین ہے کہ ہوا کا یہ تازہ جھونکا، ان کے بے جان تن میں، تازہ روح پھونک سکے گا۔ اور پھر بادِ صبا، رقص میں مصروف ہو جائے گی۔ اور خامشی کا یہ عالم ہوگا کہ اوس کے سبزے پر گرنے کی صدا بھی سنائی دینے لگے گی۔ اس خوبصورت منظر کا بیان، ان کے اپنے الفاظ میں سنیے :

کھڑکی کھولو، کچھ تو یہاں بھی تازہ نرم ہوا آئے
منظرِ صحنِ چمن کا ابھرے، بوئے دردِ رسا آئے
بے جاں تن میں جان سی آئے، زخمِ تمنا زندہ ہو
یاد میں رنگِ حنا کا مہکے، رقص میں بادِ صبا آئے

ماہ گزیدہ رات ہے ساکت، جیسے کوئی آئینہ
اوس کے سبزے پر گرنے کی سناٹے میں صدا آئے

حسن، موجودہ معاشرہ کے ایک حساس فرد ہیں۔ وہ اپنے اردگرد کے بارے میں حقیقت پسندانہ تخلیقی عمل کے قائل ہیں۔ جو کچھ دیکھتے ہیں، اسے من وعن بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ، وہ اپنی قلبی واردات کو بھی شامل کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ دقیق مسائل سے لے کر سامنے کی چیزوں تک تمام اجزا کو اپنی گرفت میں لینا چاہتے ہیں۔ ان کے عزائم کی بلندی کا یہ عالم ہے کہ وہ تند خو موجوں کو سفینہ کی شکل میں بدل ڈالنا چاہتے ہیں۔ انہیں زمین سے آسمان تک کا فاصلہ، آنکھوں کی زد میں نظر آتا ہے، اور وہ نگاہوں کی اس طولانی مسافت میں خود کو شریک کر لینا چاہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو؛

بہائے جو لئے جاتی ہیں تجھ کو تند خو موجیں
یہی موجیں سفینہ ہیں، انہی موجوں کو ساحل کر
زمیں سے آسماں تک فاصلہ آنکھوں کی زد میں ہے
نگاہوں کی مسافت میں حسن خود کو بھی شامل کر

حسن، جس جذبہ احساس یا کیفیت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، ان کی تخلیقی صلاحیتیں اسے حسن و خوبی کے ساتھ قاری تک پہنچا دیتی ہیں۔ احساس کی سچائی کے ساتھ ساتھ اظہار پر گرفت کے سبب ان کے اشعار، تاثیر سے مملو نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں نرمی، تصویریت اور موسیقی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ فطرت کے حسن کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ ہماری توجہ "سیلِ آب" اور "آئینہ کاریٔ مہتاب" کی جانب مبذول کراتے ہیں۔ موجوں پر پھیلتی ہوئی شفق کی سرخی انہیں وجدانی کیفیات سے دوچار کر دیتی ہے۔ جھکی ہوئی پھول کی ڈالی، انہیں بڑی دلکش دکھائی دیتی ہے۔ اسی انداز میں، وہ صفِ مژگاں کو بھی جھک جانے پر مائل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ع
یہ ڈالی پھول کی جھک کر ہوئی ہے اور بھی دلکش
اسی صورت صفِ مژگاں کو جھک جانے پہ مائل کر

بھنور پہ ہوا کے رقص اور ہوا کے ساتھ سحاب کا تذکرہ کر کے وہ ہاسعدل کے تاروں کو چھیڑتے ہیں۔ انہیں سراب تاروں پر لیے داغ چاندنی کے خواب سہانے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر یہ خواب موتیوں کی مانند بکھر جاتے ہیں اور اوس کے قطروں کی مانند، پھولوں پر لرزنے لگتے ہیں۔ اس تناظر میں، سیاہ رات میں تاروں کے

جھرنوں کی طرح ۔ ان کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے :

یہ سیلِ آب ، یہ آئینہ کاریٔ مہتاب !
بھنور پہ رقص ہوا کا ، ہوا کے ساتھ سحاب
زمانہ دیکھ رہا ہے ، نگہ نگر کے خواب
قدم قدم پہ اندھیروں میں روشنی کے خواب
امید و بیم کے حلقوں میں زندگی کے خواب
سراب زار پہ بے داغ چاندنی کے خواب

حسن کے کلام میں ، تصوف کے واضح اشارے ملتے ہیں ۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا ، وہ پوری کائنات کو ایک مربوط اور منضبط اکائی کے طور پر اس شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ انہیں نہ صرف سمندر ، آسمان سے ہمکنار ہوتا دکھائی دیتا ہے ۔ نہ صرف انہیں آفاق سے نغمات کے جھرنے پھوٹتے ہوئے سنائی دیتے ہیں ۔ بلکہ ایک لمحہ خود فراموشی میں انہیں یوں محسوس ہوتا ہے ، جیسے وہ پورے عالم کے ترجمان بن گئے ہوں ۔ پھر پھول کی پتی پر لرزتے ہوئے اوس کے قطرے سے لے کر ، آسمان پر جھلمل جھلمل کرتے ہوئے ستارے تک کی ماہیت سمجھنے پر قادر ہو گئے ہوں ۔
چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

پرے ہے عدم سے بھی منزل ہماری
من و تو کا رستے سے پتھر ہٹاؤ
کوئی سمت ہے ، راستہ ہے نہ منزل
کہاں جا رہے ہو حسن لوٹ آؤ

وہی غیب و حضور کی الجھن — اک اشارہ سا ہے پسِ چلمن
وہ یہاں تھا ، نہ تھا کسے معلوم — میں تو اپنے خیال میں تھا مگن

سپردگی کا لطف تھا ، کمالِ احتیاط میں
سو بے خودی ضرور تھی ، مگر میں بے خبر نہ تھا

صبحِ ازل سے چھانتا ہے انتہا کی خاک
مشتِ غبار سا جو ابھی راستوں میں ہے

صاحبِ نظر ہوا ہے تو اپنے نفس بھی کر
کیسا ہے بُت شکن کہ یہاں آذروں میں ہے

اپنے عزمِ جواں کو وہ اٹھتے ہوئے کہساروں، اڑتے ہوئے دریاؤں اور کھلتے ہوئے آفاق سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ چشمِ تصور سے دیکھتے ہیں تو محبوب کی آنکھوں کا سحر انہیں اس درجہ جلوہ فرما نظر آتا ہے کہ فصلِ خزاں میں بھی بہاروں کی فضا قائم رہتی ہے:

اُٹھتے ہوئے کہسار، امڈتے ہوئے بادل،
کھلتے ہوئے آفاق، مرے عزمِ جواں میں
ہنستی ہوئی آنکھوں کا تصور نہیں مٹتا
قائم ہے بہاروں کی فضا، فصلِ خزاں میں

ان کی دلی خواہش ہے کہ نغمات کے دھارے، آفاق سے بہتے ہوئے، ان کے فکر و بیاں میں سما جائیں اور پھر وہ زلف، لب اور رخسار کے لمحاتِ گریزاں کو اپنی گرفت میں لے سکیں:

آفاق سے بہتے ہوئے نغمات کے دھارے
آجائیں سبک سیر مرے فکر و بیاں میں
زلف و لب و رخسار کے لمحاتِ گریزاں
کیا جوت جگا دیتے ہیں احساسِ زیاں میں

حاصلِ کلام! محمد ابن الحسن، اشیا اور ان سے وابستہ حقائق کو ایک حسّاس آنکھ سے دیکھتے ہیں اور احساس کی شدّت کو برقرار رکھتے ہوئے اس کا اظہار کرتے ہیں۔ احساس کی گہرائی اور جذبہ کی توانائی کی آمیزش کے سبب ان کے اشعار خلوص اور تاثیر سے مملو ہوتے ہیں۔ ان کا کلام پڑھتے وقت، لب و لہجہ کی تازگی کے ساتھ، اظہار میں کشادگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی غزل دلکشی کے اعتبار سے نئی غزل ہے۔ مگر ان کے ہاں نام نہاد جدیدیت کے لیے لسانی تحریفات اور زبان کے مروجہ سانچوں کی توڑ پھوڑ نہیں ملتی۔ وہ واردات کے لئے زبان و بیاں کے مانوس رشتوں کو برہم نہیں کرتے۔ بلکہ وہ لسانی حرمتوں کے قائل ہیں۔ ان کے امیجز (IMAGES) میں ان کا داخل چھلکتا، بولتا محسوس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل

صمد انصاری ـ فن اور شخصیت

یاد ش بخیر آج سے کوئی بارہ پندرہ سال قبل ہمارے ایک باذوق دوست یوسف خٹک نے جو اب ریلوے کے حساب کتاب میں لگے ہوئے ہیں۔ صمد انصاری کے کلام کی طرف ہمیں یہ کہہ کر متوجہ کیا کہ یارا اچھا بھلا کلام ہے۔ شعر کی تخلیق میں محنت بھی کرتے ہیں اور اشعار کی ساخت دیکھئے، کیسی چولوں سے چولیں بٹھائی ہیں۔ دیکھا تو فی الحقیقت اشعار جاندار تھے پھر دوسرا واسطہ صمد انصاری سے پڑا کہ ان کے مجموعہ کلام پر تبصرہ کرنا پڑا۔ کوئی چلتا ہوا سرسری سا تبصرہ تھا اور غالباً فنون میں کیا تھا، ایک زمانے میں فنون میں تبصرے کرتے وقت میں سچ مچ تبصرے کر دیا کرتا تھا لیکن چونکہ یارانِ طریقت لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑ گئے تو میرے تبصروں کا انداز بھی وہی ہو گیا جو واجب نمازیں پڑھنے کے بعد سنتیں ادا کرتے وقت عامۃ المسلمین کا ہوتا ہے چنانچہ صمد انصاری بھی اسی رویئے کا شکار ہوئے۔ تیسری بار صمد انصاری بہ نفسِ نفیس ایف سی کالج آ کر مجھ سے ٹکرا گئے۔ یعنی کسی شخص کو ڈھونڈتے ہوئے ایف سی کالج پہنچے اور اتہ پتہ مجھ سے دریافت کیا اور خود ہی گویا ہوئے کہ مجھے صمد انصاری کہتے ہیں مجھے مصافحے کا شرف بخش کر چلتے بنے، اب کوئی گزشتہ جمعے کی بات ہے کہ حضرت سید سیف زلفی کی جانب سے صمد انصاری کے تازہ مجموعۂ کلام ہدف کا ایک نسخہ مجھے ملا اور اسی کے ساتھ ساتھ ایک خط کہ چند سطریں لکھو اور حاضر ہو جاؤ۔ ہم جیسے جُز وقتی، یعنی شعر و ادب سے جُز وقتی رشتہ رکھنے والوں کو زندہ رہنے اور رازقہ بہم پہنچانے کے لیے جو مشقت کرنا پڑتی ہے اس کی مصروفیت تو ادب سے جز وقتی رشتہ بھی قائم نہیں رہنے دیتی چنانچہ کل شب میں سید سیف زلفی نے فون پہ دھمکی دی کہ اگر تم مع تبصرے کے حاضر نہ ہوئے تو تمہارا حشر و نشر، سچ پوچھیے تو اس مرتبہ بھی میرا ارادہ تھا کہ صمد انصاری صاحب سے معذرت کر لی جائے۔ لیکن ہوا یوں کہ جب میں نے ہدف کی ورق گردانی شروع کی تو پڑھتا ہی چلا گیا، ہاتھ میں قلم تھا اور اشعار پر نشان لگاتا جاتا تھا اور آخر میں یہ کھلا کہ میں خود صمد انصاری کا ہدف بن چکا ہوں، بارے میں نے شکر کیا کہ سید سیف زلفی کا ہدفِ ملامت بنتے بنتے بچ گیا۔

میرا اصول یہ ہے کہ جب میں کسی تخلیقی شہ پارے پر غور کرتا ہوں تو اس کے خالق کی ذہنی بضاعت اور اس کے ادبی سرمائے کے بین السطور اس شعور اور آگہی کو دریافت کرتا ہوں جو تخلیق کے پس منظر میں کارفرما ہو۔ صمد انصاری کے تخلیقِ شعر میں محض قافیہ پیمائی کا شوق اور روایتی غزل کا فرسودہ تھکا ہوا لہجہ نہیں ہے جو مجھے سوءِ ظن میں مبتلا کرتا،

چنانچہ میں نے از اوّل تا آخر ہدف کا بالاستیعاب مطالعہ کر ڈالا اور یہ معلوم کر لیا کہ صمد انصاری محض ہیئت اور مواد سے دست و گریباں نہیں ہیں بلکہ اپنے اسلوب میں جو اپنی بات کہہ رہے ہیں وہ منفرد متنوع اور پُرکشش بھی ہے ساتھ ساتھ تخیل میں توانائی اور حسنِ ادا سے رعنائی بھی رکھتی ہے۔ صمد انصاری اپنے تخیل کی بنیاد تفکر اور تعقل پر رکھتے ہیں اور فرد و کائنات کے مابین جو ارتقائے فکر کا فطری اور انسانی رشتہ قائم ہے اس سے باخبر ہیں۔ اس ضمانت کے حاصل کر لینے کے بعد جب میں نے ان کی مملکتِ شعر میں قدم رکھا اور تخلیقِ شعر کے درونی محرکات و عوامل پر غور کیا تو میری ملاقات ایک ایسے انسان سے ہوئی جو تمام دنیا کا بالعموم اور تیسری دنیا کا بالخصوص ایک حساس باحیثیت اور باضمیر زندہ انسان ہے جو اپنے درون سے کمند اچھال کر ساری کائنات پر پھینکتا اور نظامِ کائنات کو مسخر کرنے کی تدبیر کرتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ میں اس شریف انسان سے مصافحہ کرتا اور سلام کر کے رخصت ہو جاتا یا زیادہ سے زیادہ معانقہ بھی کر لیتا۔ لیکن ہوا یہ کہ میں جن اشعار کا ہدف بنا وہ میرا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے اور مصر ہوئے کہ فکر کے جس سمندر کو بلویا گیا ہے اور احساس و ادراک کی جو قندیلیں منور دستیز ہوئی ہیں اُن سے صرفِ نظر کروں، سو میں اس ہوش ربا طلسم کی گرفت میں آ گیا۔ آیئے آپ بھی تھوڑی دیر کے لئے اس چمن کی سیر کیجیئے اور اس گلگشت میں منظور ہو تو گلچینی بھی کیجیئے۔ مثلاً پہلی ہی نعتیہ غزل کا یہ شعر میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور متقاضی ہوا کہ اسے بار بار پڑھوں :

اس کے ہاتھوں سے لے کر سب کی چاندنی اپنے خوابوں کے آنگن کو روشن کرو
اس کی آنکھوں کے کاجل کی تحریر لو غم کے لکھتے ہوئے حاشیوں کے لئے

اس کی غنائیت پر سر دھنوں اور تخیل کی رعنائی پر مرحبا و آفریں کہوں۔

ساتھ لو اپنے قدموں کی گردِ سفر ساتھ لو اپنے تلووں کے سب آبلے
ساتھ لو اپنے جسموں کی ساری تھکن زادِ راہ اجنبی راستوں کے لئے

یا ـــــ تشبیہ کا یہ التزام جس میں سمعی و بصری کیفیت کی قوسِ قزح کھلی ہوئی ہے :

شاہدِ شام کی وہ حنائی قبا، شب کی جوگن کے گھنگھرو کی چھم چھم صدا
دل کے داغوں کی بیدار و دلکش فضا، رات کے بیکراں فاصلوں کے لئے

اور اس شعر تک پہنچ کر تو بے ساختہ آپ کی زبان سے "کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست" کا کلمہ نکل جاتا ہے

دل کے روشن مناروں کی نوری اذاں، سجدۂ بے جبیں ماحصلِ جسم و جاں
دل سے اٹھتی دعا درمیاں درمیاں، حسن کے بے نشاں رابطوں کے لئے

آگے بڑھیے دوسری غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

زخم خوشبو کے گلابوں میں چھپائے رکھنا ان پیاروں کو رگِ جاں میں بسائے رکھنا
صدیے قامت کو بڑھا دیتے ہیں شہر کے ستون اپنے قدموں پہ بدن اپنا اٹھائے رکھنا

خاک ہو جائیں گے سورج کے تلے شبنمی رنگ
عکس مٹی کا گلابوں پہ جلائے رکھنا

اور جب آپ اس شعر سے ملاقات کرتے ہیں ـــــ

کتنا سفاک ہے مذہب کے خطیبوں کا طریق
حرفِ تقدیس مناروں پہ چڑھائے رکھنا

تو آپ کو "چوں بہ خلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند" کے ساتھ ساتھ کیا حافظ کا یہ شعر یاد نہیں آتا

من حالِ دلِ زاہد با خلق نخواہم گفت
ایں قصہ اگر گویم با چنگ و رباب اولیٰ

خیر اولاً تو یہ اشعار ملاحظہ کیجئے :

وہ لحظہ لحظہ مری فکر میرے فن میں رہا
غرور بن کے مرا، میرے بانکپن میں رہا

وہ مدتوں سے گریزاں تھا میرے سائے سے
مرے بدن کی طرح میرے پیرہن میں رہا

جبینِ فلک کی اُسے سوچتی رہی صدیوں
وہ نقشِ پا، کہ مرے پاؤں کی تھکن میں رہا

اور ثانیاً اسی زمین میں کسی تہذیب کا نوحہ سنیئے :

اسی پتنگ زمانے کی بجھی شامیں ہیں
جو شہر یارِ تمدن کے نورتن میں رہا

اور یہ بھی ملاحظہ ہوں :

چمن کو جس نے نئے موسموں کے نام دیئے
وہ ناشگفتہ کسی شاخ کے بدن میں رہا

وہ موجِ بو سا در آیا مشامِ جاں میں مدام
جو میرے شہر میں ٹھہرا نہ میرے بن میں رہا

ایک نادر تشبیہ ملاحظہ ہو :

زندگی سیلابِ غم میں کشتِ جاں بوتی رہی
ساری فن کاری ہماری سیپ کا موتی رہی

اور ہمارے نقادانِ ادب کا قحط الرجال اور تحسینِ ناشناس :

مدتوں تُلتے رہے ہم مدح کی میزان پر
ہمتِ اہلِ سخن صرفِ دعا ہوتی رہی

اور یہ بھی ایک انداز ہے :

پینے والے پی گئے ظلمات کا ایک ایک گھونٹ
رات کہکشاؤں پہ سر رکھ کے سحر روتی رہی

ایک مختلف زمین میں ایک شعر ملاحظہ ہو اور اس میں مراعاۃ النظیر بھی :

منزلوں میں سج گئے آکر سرابوں کے بدن
نقشِ پا قدموں کے نیچے سر پٹکتے رہ گئے

اور یہ انداز بھی دیکھئے :

کیا جانے کس کے آبلۂ پا کا فیض ہے
خوشبو سی پھوٹتی ہے کفِ رہگزار سے

اسی زمین میں یہ شعر بھی دیکھنے کے لائق ہے :

کام و دہن کو چاٹ گئی لذتوں کی آگ
کچھ اور چیز مانگئے پروردگار سے !

اور عارف صاحب کی خوردہ بینی کی داد دیجئے :

اب کے پھوٹی ہے وہیں سے نئے موسم کی کرن
تھا جہاں زخمِ نمو زخمِ جگر سے پہلے

اور اسی زمین میں یہ بھی دیکھئے :

صبح ہوگی تو ملیں گے نئے خوابوں کے سراغ
بھید کھلتا نہیں آنکھوں کا سحر سے پہلے

اور عارفِ عشق کا چلن سیکھنے کے لئے :

ملبوسِ درد مانگیے زخموں کے واسطے
کب سے ہیں شہرِ جسم کے دیوار و در کھلے

اور ذرا پندارِ حسن میں کمی دیکھئے :

آئینہ داغ داغ ہو پندارِ حسن کا
اپنے ضمیر پر وہ اگر فتنہ گر کھلے

عارفِ تراب کا یہ احساس بھی غور طلب ہے :

کیا کیا صلے ملے ہیں مجھے عجزِ خاک کے
ابلیس پر فضیلتِ نوعِ بشر کھلے

ذرا یہ اشعار بھی دیکھئے :

درد گزرا بھی نہیں شہر کی شریانوں سے
شہزادوں کے بدن زخم چرانے آئے
کربِ شہروں کا فصیلوں میں بپا تھا کیونکر
قامتِ غم رسن و دار بڑھانے آئے

اپنے معاشرے پر یہ تبصرہ بھی دیکھئے :

کھا گئی اپنے کناروں کو سمندر کی ہوا
کتنے آباد جزیرے تھے کہ ویران ملے

خیال کی رعنائی کے لئے لفظوں کا عجز دیکھئے :

تجسیم ہو کب فن سے اس حسنِ معانی کی
وہ پیکرِ زیبائی معراجِ سخن مانگے

اور ذرا ان تینوں اشعار کے تیور بھی ملاحظہ کیجئے :

درِ قفس سے گئے موسموں کی بو آئی
ہوا کا رنگ بہت روز بال و پر میں رہا
نگل لیا ہے اسے بھی مرے اندھیروں نے
جو روشنی کی طرح شعلۂ خبر میں رہا
ہوا نہ اس کو صمد زندگی کا رنگ نصیب
وہ برگِ نو کہ ذرا سایۂ شجر میں رہا

اس کے ساتھ ذرا ان چار اشعار کو بھی دیکھئے :

غمِ حیات کی لذت دلِ حزیں سے ملی
تمام لمحوں سے دُرِ تہ نشیں سے ملی
شجر اُگا تھا عدالت کا جن کے سینے میں
ہمارے خوں کی خبر اُن کی آستیں سے ملی
فرازِ دار ہے قائم ہماری نسبت سے
قبائے خونِ شہادت اسے ہمیں سے ملی
جہاں یہ سب کو پڑے تھے جنوں اندھیروں کے
نویدِ صبحِ تمنا صمد وہیں سے ملی

اک ذرا ان اشعار پر بھی توجہ کیجئے :

کچھ دور میرے ساتھ مرے ہمسفر گئے
آگے بڑھے تو راہ میں رستے ٹھہر گئے

جن کو بچا کے لائے تھے یلغارِ شب سے ہم — گل پوش وادیوں میں وہ سورج اتر گئے

ایک مدت سے مری ہمدم و دمساز ہے یہ — میں نے مانا کہ مرے پاؤں کی آواز ہے یہ
شب نے بدلا تھا ذرا دیر کو ظلمت کا لباس — میں نے جانا کہ نئی صبح کا آغاز ہے یہ
وہ گھڑی خود کو میسر نہیں اس عہد کے لوگ — کیا ہے وہ جس کے لئے ساری تگ و تاز ہے یہ

ہوتی ہے خاکِ ذہن میں مرے فن کی پرورش — کب حرفِ انبساط مری داستاں میں تھا

ہوئی تھی شام جنہیں وادیٔ شہادت میں — ذرا اجل سے گزر کر وہی مدام جئے

ہے کائنات میں کیا زیست کا محل دیکھوں — کبھی تو حلقۂ گرداب سے نکل دیکھوں
مرے خمیر سے شاید کوئی دھنک اٹھے — مثالِ برف نئی دھوپ میں پگھل دیکھوں

ذرا یہ استعارہ ملاحظہ ہو :

بکھرے تھے زخمِ خاک سے خوشبو کے پیرہن — لاوا زمیں کا پھوٹ پڑا کوہسار میں

اور اسی زمیں ایک شعر یہ بھی :

وہ لوگ جن کی ذات میں تھی کائنات بند — محبوس ہو گئے ہیں بدن کے حصار میں

زاویے شب کے سمٹتے نہیں تو میل سے — کن اندھیروں سے اجالوں کا جنم ہے اب کے

یہ بھی ملاحظہ ہوں :

کھا گئی جس کو دھوپ موسم کی — وہ شجر سائباں سا لگتا ہے
تھے چمن زار جس کے ہمسائے — شہر وہ بے اماں سا لگتا ہے

نہ دے مجھ کو فرشتوں کی شباہت — خدایا میں تو فرزندِ زمیں ہوں

مہکا گیا تھا بارِ زخمِ جاں مرے لئے — آئی نہیں کسی کے بدن پر مری قبا

آجائیں زمینوں پہ بلندی سے ہنر کی   اب تازگیِ فکر کی صورت یہی ہے

ابھی سے لوگ اُجالوں کی بات کرتے ہیں   ابھی تو دامنِ ظلمت بہت کشادہ ہے

جب سے چلی ہے دار کے قامت پہ اس کی بات   زینت تمام سرو و سمن سے چلی گئی

نکل کے آئے ذرا اپنی بند راہوں سے   فقیہِ شہر کبھی اجتہاد سے گزرے

دل میں اگر وہ حرفِ صداقت اتار دے   ذہنوں سے سامری کی فراست اتار دے

اُگا رہا ہے جو مدّت سے بھوک کھیتوں میں   ہمارے خوشۂ گندم میں وہ کسان بھی ہے
رکھا تھا جس کو الگ ناسپاس لوگوں سے   مرے خلاف شہادت میں وہ زبان بھی ہے

کتنی شرمندہ ہے مجھ سے مرے موسم کی ادا   رنگ میرا مرے چہرے سے اڑاتے رہیے
کتنے سورج تھے کہ ڈوبے ہیں شفق زاروں میں   مطلعِ درد سے داغوں کو اٹھاتے رہیے

جس شہر میں محتاج نہ تھا کوئی کسی کا   اس شہر پہ ٹوٹے ہیں عذاب اور طرح کے
منصور سرِ دار ہیں یوسف سرِ زنداں   ملتے ہیں فرشتوں کو ثواب اور طرح کے
بس جائیں تو صحرا ہیں اُجڑ جائیں تو دُنیا   ہم لوگ ہیں کچھ خانہ خراب اور طرح کے

کل تک رسن و دار میں تنہا بھی یہی تھا   اب رات میں جس شخص کا سایا نہیں جاتا
آیا ہے کسی آنکھ کے معدن سے نکل کر   گوہر جو کسی تاج میں ٹانکا نہیں جاتا

کشید کی ہے زمانے سے زندگی میں نے   یہ روز و شب مرے سالِ حساب جانتے ہیں
نہیں ہے نظمِ گلستاں پہ اعتماد جنہیں   وہ موسموں کو خدا کا عذاب جانتے ہیں

کتنے برسوں کی ریاضت میں کھلا فاقہ   آسمانوں سے صحیفے ناگہاں اترے نہیں

اور وہ جو کسی نے کہا ہے کہ "اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی" اس عنوان کو ذرا یہاں ملاحظہ کیجیے:

پھیلی ہوئی ہے راہ میں دیوار و در کی گونج   خالی گھروں پہ لوگ صدا کر کے آتے ہیں

ذرا آخر میں ان اشعار پر بھی توجہ فرما لیجیے:

پاؤں جن کے نہ کبھی اپنے محور سے نکلے   لوگ ایسے بھی ممتد راہ دکھلانے اترے

مرے لبوں پہ ہے میرے بدن کا سناٹا   جو گھر میں ہے وہی دیوار پر نوشتہ ہے

نگاہیں کیوں افق کو ڈھونڈتی ہیں   ابھی تو رات باقی ہے سحر پر

جس کے لیے سجی ہے دکانِ جسم و جاں کی   آیا نہیں ابھی وہ خریدار سامنے
لوحِ قدم پہ بختِ سکندر رقم کریں   آجائے یک بیک جو درِ یار سامنے

اب وار سے ملتا ہے ترا قامتِ بالا   شکوہ تھا ترے قد کو بہت سرو و سمن سے

رحیم گل

سراج منیر

ذہین آدمی ہے، داڑھی بہت سجتی ہے،
خوش شکل ہے، بہت پڑھتا ہے، بہت بولتا ہے،
حافظہ اس بلا کا، کہ جو پڑھا ازبر ہو گیا!
اور فطانت ایسی، کہ جاذب ہے اس کا برمحل استعمال کم از کم اس عشرے میں اسی پر ختم ہے،
تخلیقی قوتوں کا اظہار ابھی نہیں ہوا،
اندر کی صلاحیتیں ابھی محصور ہیں،
روح کی صداقتوں نے اسے ابھی تسخیر نہیں کیا،
اس نے دو چار سال میں جو کچھ پایا ہے، حافظے کے زور سے،
اجتماع کو مسخر کر لیتا ہے، ادبی محفلوں میں اس کی آواز تازہ جھونکے کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ وہ بات کے کئی رُخ نکالنے کی قدرت رکھتا ہے،
نظم ہو، غزل ہو یا افسانہ، وہ ہر موضوع پر بولتا ہے، بول لیتا ہے!
یہی شوقِ اولیں، یہی شوقِ آخریں!
سراج کو دس دن محبوس رکھو، کال کوٹھڑی میں، حقہ پانی بند کر دو، دانۂ گندم سے بھی ناطہ توڑ دو،
لیکن دس دن بعد کسی محفل میں ادبی جگالی کا موقع دو، اس کی جسمانی، قلبی اور روحانی کمزوری بحال ہو جائے گی!
نانِ جویں سراج کی ضرورت نہیں، مجمع کی تسخیر اس کی احتیاج ہے،
حلوے کے طشت سجا دو، مرغ و ماہی کے مینار کھڑے کر دو، گلاب کی پنکھڑیوں کا گھر بنا دو، موقع ملا تو سراج نکل جائے گا کہ یہ اظہارِ ذات کا معاملہ ہے،
سراج کو چین بھیج دو، امریکہ بھیج دو، ملک کا صدر بنا دو، کہیں نہیں ٹکے گا — اس کا خمیر ٹی ہاؤس سے اٹھایا گیا ہے، دیر سویر پلٹ کر یہیں آئے گا کہ یہ سرشت کا معاملہ ہے۔

جیسے سمندر سے بخارات اٹھتے ہیں، پہاڑوں سے ٹکراتے ہیں اور پانی بن کر واپس سمندر میں گم ہو جاتے ہیں،

کبھی کبھی وہ سپاہی بن کر زیرِ آستیں خنجر بھی آزماتا ہے، کہ یہ پیر و مرشد کا حکم ہوتا ہے — !

پیر و مرشد نے جو فہرست مرتب کر رکھی ہے ——— "بزن" کا اشارہ پاکر سراج کشتوں کے پشتے لگا دیتا ہے، تب اس کی خوبصورت تنقید کا رُخ بدل جاتا ہے اور رویے میں توازن نہیں رہتا، اور وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور اس کی شکل بگڑ جاتی ہے — !

لوگ حیران ہوتے ہیں کہ یہ ذہین شخص جو خود گرو بننے کی صلاحیت رکھتا ہے محض دائرۂ اختیار کی مجبوری سے باجگذار بنا ہوا ہے ؟

اس کی جڑیں زمین میں ہوں تو وہ خود برگد کی طرح پھیلاؤ کی صلاحیت رکھتا ہے، اسے کسی اور درخت کے تنے میں اُگنے کی ضرورت نہیں،

ایسے پودے جو زمین کی بجائے دوسرے تناور درختوں سے توانائی حاصل کرتے ہیں اپنی شناخت کھو دیتے ہیں۔ اپنی اکائی ختم کر دیتے ہیں ——— دیوار میں اُگنے والے پیپل کی شاخوں کا رُخ آسمان کی طرف نہیں ہوتا،

ہوا میں معلق پودا کبھی درخت نہیں بن پاتا ! ؟

سراج منیر مجمع کا شوقین ہے، مجمع لگا سکتا ہے۔ مجمع کو اپنے ڈگر پر چلا سکتا ہے، ایسے میں کیا ضرورت، کہ گروہی سیاست کا شکار ہو، آدمی خانوں میں بٹ جائے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اپنی قوت کھو دے ؟

کبھی کبھی وہ چپ بھی ہو جاتا ہے، جہاں بولنے کی ضرورت ہو وہاں نہ بولنا، عملِ صالح نہیں ہے ——— شہادت ضروری ہے ——— خدا ایک ہے، اس کی گواہی فرض ہے ———

صداقت اُگلنا قوتِ ایمانی کا اظہار، صداقت نہ اُگلنا نفسِ ناتواں کا عجز !

پست کے معنی نیست کبھی نہیں ہوتے،

سراج جانتا ہے ——— کہ ادنیٰ و اعلیٰ دو الگ الگ لفظ ہیں، یہ ایک فقرے میں مربوط ہو جاتے ہیں مگر اپنے اپنے مفہوم کے ساتھ،

بلند و پست ہمنشیں لفظ ہیں مگر ہم معنی نہیں، خیر و شر کی راہیں الگ الگ ہوتی ہیں !

عمل خود نتائج متعین کرتا ہے ———

میں نے دیکھا ہے، حد سے زیادہ فطین آدمیوں کی روحوں میں گُھن آجاتے ہیں، دل بند ہو جاتے ہیں اور جذبے زنگ آلود ہو جاتے ہیں !

میری خواہش ہے ——— سراج کے ساتھ یہ المیہ نہ ہو — ؟

"پھر تجھے اڑا دوں گا، فنا کر دوں گا!"

یہ اس کی سطح نہیں ہے، بصیرت ابلیس کے پاس بھی بہت تھی، راندۂ درگاہ ہوگیا، بصیرت مادام کیواری کے پاس بھی تھی، لازوال ہوگئی!

سچ کہوں، تو مجھے اس نوجوان سے کدورت بھی ہے اور اُنسیت بھی!

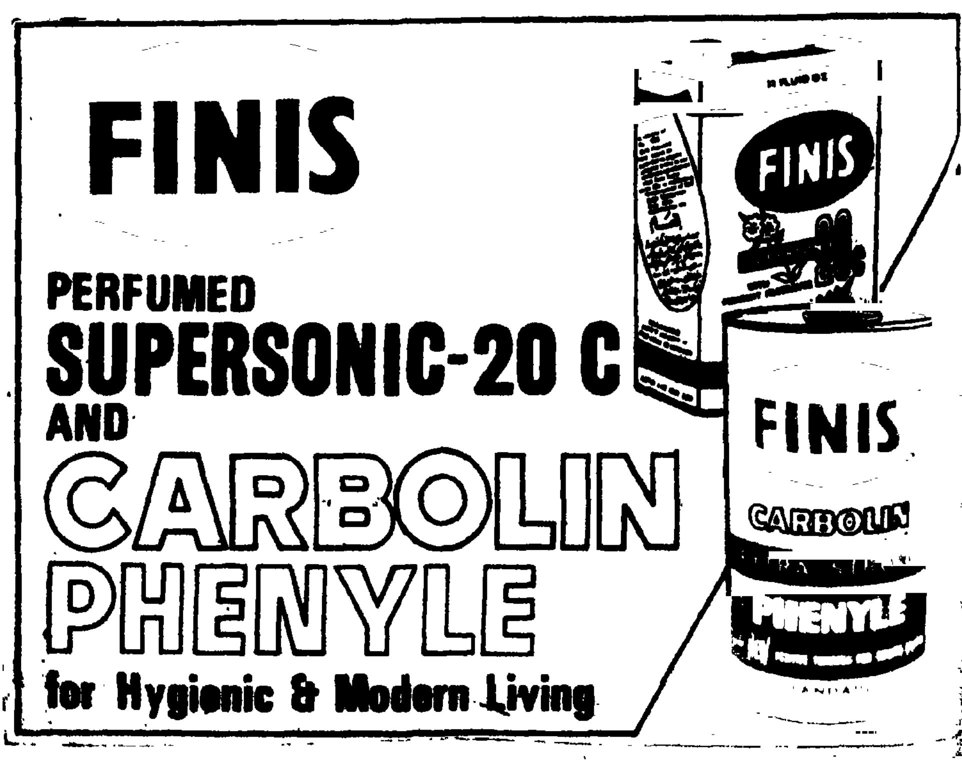
کدورت یوں، کہ اس کے پاس علم ہے حلم نہیں،

اُنسیت یوں کہ خدا نے اسے کسی مبارک گھڑی میں تخلیق کیا ہے،

ظاہر ہے کہ جسے خدا نے توجہ سے بنایا۔ اس سے محبت تو کرنا ہی پڑے گی،

سراج منیر میرے ناول "جنت کی تلاش" کے کردار افضل کی طرح مجھے عزیز ہے، میں افضل کو بھی تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا، سراج کے لئے بھی یہی جذبہ رکھتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ کائی جو اس کے دل کے اردگرد اُگ چکی ہے، سیاہ غلاف بن کر اس کے دل کو ڈھانپ دے!

سرشت بدل نہیں سکتی اور فطرت بھی اٹل ہوتی ہے، لیکن وہ جس طریقت کا حامی ہے ـــ ان کا کہنا ہے ـــ اصل فتح وہ ہوتی ہے کہ انسان اپنی فطرت کو زیر کرلے ـــ!؟



جگن ناتھ آزاد

بنّے بھائی

۱۲ ستمبر ۱۹۷۳ء کی بات ہے شام کے وقت میں اوپر اپنے کمرے میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ نیچے گھر کے لوگ ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے کہ میری بیوی گھبراہٹ کے عالم میں اوپر آئی اور بولی بنّے بھائی ان دنوں کہاں تھے؟ میں نے اوپر سر اٹھایا اور کہا کہاں تھے یا کہاں ہیں؟ پچھلے دنوں جب میں دہلی میں تھا تو وہ ماسکو گئے تھے شاید وہاں سے ان کا لندن جانے کا ارادہ بھی تھا واپس آنے ہی والے ہوں گے۔ کیوں کیا بات ہے؟ وہ انتہائی افسردہ لہجے میں کہنے لگی ابھی ٹیلی ویژن پر خبر آئی ہے۔ اس کی بات ابھی نامکمل ہی تھی۔ میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ پھر بھی میں نے سوال کر ہی دیا کیا خبر آئی ہے؟ بولی بنّے بھائی کا انتقال ہو گیا ہے۔ سنتے ہی پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ تاہم یقین نہ آیا اور جلدی سے نیچے ٹیلی ویژن والے کمرے میں آیا جیسے کہ ٹیلی ویژن کا نیوز ریڈر میرے انتظار میں اس ایک خبر پہ رکا ہوا ہوگا۔ خبریں آگے چل چکی تھیں، بچوں نے تائید کر دی ابھی نیوز ریڈر نے بتایا ہے سجاد ظہیر چچا کا روس میں انتقال ہو گیا ہے۔

اور میں خیالات میں ڈوب گیا۔۔۔۔ کیا بنّے بھائی کی لاش روس میں دفن کی جائے گی یا ہندوستان لائی جائے گی۔ اور پھر پینتیس برس کے واقعات ایک فلم کی طرح میری نظر کے سامنے گھومنے لگے۔

۳۷ء کا زمانہ ہے میرے والد گارڈن کالج راولپنڈی میں اردو کے استاد ہیں۔ اٹھارہ انیس برس کی میری عمر ہے ایک نوجوان ہمارے گھر آتا ہے ادب میں ترقی پسندی پر باتیں ہوتی ہیں۔ والد کہتے ہیں لیکن میں ادب میں فحاشی اور عریانی کو برداشت نہیں کر سکتا وہ نوجوان جواب دیتا ہے محروم صاحب! ترقی پسندوں کے مخالفوں نے یہ باتیں ترقی پسندی کے ساتھ وابستہ کر رکھی ہیں ان چیزوں کا ترقی پسندی سے کوئی تعلق نہیں ہے لاہور میں مجھ سے علامہ اقبال نے بھی یہی کہا تھا۔ یہ ہمارے مخالفوں کا پراپیگنڈہ ہے۔

والد یہ ساری بات سن کر کہتے ہیں تم کل ہمارے کالج میں ادب میں ترقی پسندی کے موضوع پر تقریر کرو،

کالج کے دوسرے اساتذہ اور طلبہ کو بھی بحث میں حصہ لینے کا موقع مل سکے۔

یہ نوجوان سید سجاد ظہیر تھے سر وزیر حسن مرحوم کے فرزند، نکھرا ہوا گورا چٹا رنگ، نکلتا ہوا قد، مجھے اُن کا یو۔ پی کا شستہ لب و لہجہ بہت بھلا لگا۔

——اور دوسرے دن گارڈن کالج راولپنڈی میں سجاد ظہیر کی تقریر ہوئی۔ والد صاحب نے صدارت کی۔ سجاد ظہیر نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا اس سے زیادہ مجھے ان کے لب و لہجہ سے دلچسپی رہی۔ کتنی عمدہ اردو میں بول رہے تھے جیسے کانوں میں رس گھول رہے ہوں۔

سجاد ظہیر نے یہ سارا واقعہ اپنی تصنیف "روشنائی" میں اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

اردو کی ادبی دنیا میں راولپنڈی کی سب سے مشہور ہستی پنڈت تلوک چند محروم کی تھی پنڈی کی انجمن یا گارڈن کالج کی اردو سوسائٹی کی جانب سے ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں ترقی پسند ادب کی تحریک پر مجھے تقریر کرنا تھی مجھے بیحد مسرت ہوئی جب میں نے جلسے میں پہنچنے کے بعد دیکھا کہ حضرت محروم اس کے صدر ہیں وہ غالباً گارڈن کالج میں اردو فارسی کے پروفیسر تھے اور ان کی عمر ساٹھ کے قریب رہی ہوگی ایسے زبان دان اور قدیم مکتبۂ خیال کے قابلِ احترام استاد کے سامنے زبان کھولتے ہوئے مجھے کافی جھجک محسوس ہو رہی تھی میں بڑی احتیاط سے بولا میری تقریر کے خاتمے پر پنڈت جی نے فرمایا کہ میں ترقی پسند ادب کی تحریک کے بارے میں دوسرے خیالات رکھتا تھا لیکن اگر اس کے مقاصد وہی ہیں جو اس جلسے میں بیان کئے گئے تو اس سے بھلا کیسے اختلاف ہو سکتا ہے۔ میں نے ان کے اس جملے کو تحریک کے اور اپنے لئے باعثِ برکت سمجھا۔

بات آئی گئی ہو گئی چند برس بعد ہندوستان کے دو حصے ہو گئے ہندوستان اور پاکستان۔ میں راولپنڈی اور لاہور کو چھوڑ کر دہلی آ گیا۔ ترقی پسند تحریک سے میری دلچسپی کا صحیح معنی میں آغاز دراصل تقسیم ملک کے بعد ہی ہوا۔ اس زمانے میں سجاد ظہیر کا نام ہر زبان پر تھا لیکن سجاد ظہیر خود کہاں تھے۔ پاکستان میں۔ کیمونسٹ پارٹی نے انہیں پارٹی کی تنظیم کے لئے پاکستان بھیج دیا تھا انہیں وہاں گئے تھوڑی ہی مدت ہوئی تھی کہ راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں گرفتاریوں کا ایک چکر شروع ہو گیا جس میں فیض احمد فیض اور جنرل اکبر خان کے ساتھ سجاد ظہیر بھی گرفتار ہو گئے۔

سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے میر کارواں تھے ہم نوواردانِ شوق کے لئے ان کا نام ایک علامت بن گیا تھا، ایک سمبل بن گیا تھا ان کی رفیقۂ حیات رضیہ سجاد ظہیر لکھنؤ میں تھیں یہ مکان ہم لوگوں کے لئے ایک سجدہ گاہ کی حیثیت رکھتا تھا لکھنؤ جانا ہو یا لکھنؤ سے گزرنا ہو میرے لئے اس مکان پر حاضری دینا، رضیہ بھابی اور بچوں سے ملنا ایک معمول بن گیا اور تھوڑی ہی مدت میں صورتِ حال ایسی ہو گئی جیسے میں اسی گھر کا فرد ہوں۔

ادھر سکھر جیل سے بنے بھائی کے خطوط رضیہ بھابی کے نام خاصی باقاعدگی سے آ رہے تھے یہی خطوط بعد میں نقوش

زنداں" کے نام سے شائع ہوتے۔ ایک خط میں میرا ذکر بھی تھا اور وہ یوں کہ ایک مقالے میں پاکستان کے شعراء کا ذکر کرتے ہوئے میں نے حفیظ جالندھری کو اردو کے اہم ترین شعراء میں شمار کیا تھا۔ یہ مقالہ "شاہراہ" میں چھپا تھا اور بنّے بھائی کی نظر سے گزرا تھا۔ انہیں میرا نادیدہ نگاہ پسند نہ آیا اور انہوں نے لکھا آزاد نے در پردہ حفیظ کو فیض پر ترجیح دینے کی کوشش کی ہے اس سے آزاد کی رجعت پسندی ظاہر ہو رہی ہے وہ زمانہ ترقی پسند تحریک کے نظریئے کی شدت کا زمانہ تھا۔ رضیہ بھابی کو بھی میرے خیالات ناگوار گزرے تھے لیکن اس سے ہمارے باہمی مراسم میں کوئی فرق نہ آیا۔

جیل سے سجاد ظہیر کے خطوط سنسر کی قینچی سے گزر کر لکھنؤ تک پہنچتے تھے بعض خطوط تو جوں کے توں مل جاتے تھے بعض میں اکثر فقروں پر اس طرح سیاہی پھری ہوتی تھی کہ سارا مفہوم غتر بود ہو جاتا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے میں لکھنؤ میں وزیر حسن منزل میں پہنچا، بنّے بھائی کی بیٹی نسیم نے مجھے بنّے بھائی کا ایک خط دکھایا جس کے اکثر فقروں پر سیاہی پھری ہوئی تھی، رضیہ بھابی نے کہا جگن اس خط نے تم پر اتنا اثر بھی نہیں کیا کہ تم اس کے بارے میں نظم کہہ سکو۔ نہ جانے ان کے الفاظ میں کیا طلسم تھا کہ میں اس سنسر شدہ خط کے بارے میں فی البدیہہ ایک نظم ہو گئی جو اس طرح شروع ہوتی تھی۔

یہ اک معصوم فقرے پہ سیاہی پھیرنے والو! کسی نے وقت کی پرواز کو روکا بھی ہے اب تک
کسی بلبل کے نغمے تک کوئی صیاد پہنچا بھی کسی نے گرمیٔ آواز کو روکا بھی ہے اب تک
شکست انجام کوئی ساز ہو جائے تو ہو جائے کسی نے نغمہ ہائے ساز کو روکا بھی ہے اب تک
کسی نے پھول کی خوشبو کو بھی زنجیر پہنائی
کسی نے گلستاں کے راز کو روکا بھی ہے اب تک
یہ الفاظ محبت باپ نے بیٹی کو لکھے ہیں! ان الفاظِ محبت سے یہ وحشت کس لئے آخر
جو اپنے باپ کا ہر لفظ پڑھ لیتی تو کیا ہوتا
یہ اک معصوم بچی سے عداوت کس لئے آخر
یہ جن دو چار لفظوں پہ سیاہی تم نے پھیری ہے انہی لفظوں میں پوشیدہ ہے سورج کی درخشانی
مسلط ہے جو ظلمت آج اس ننھے سے فقرے پر اسی ظلمت پہ بجلی بن کے ٹوٹے گی یہ تابانی
یہی تحریر جس کو تم نے روکا ہے ابھرنے سے جب ابھرے گی تو بن جائے گی اک سیلاب نورانی
سفیدی پہ سیاہی کی لکیریں کھینچنے والو! یہ کب تک شانِ فغفوری یہ کب تک فرِ خاقانی
وہ دیکھو فکرِ انسانی سے ابھری نور کی دنیا بڑھا دنیائے زنداں سے وہ اک سیلاب نورانی
خدا حافظ تمہاری ان سیاہی کی لکیروں کا
. . . .

یہ ۱۹۵۳ء کی بات ہے۔

سجاد ظہیر ہمارے صف اول کے نثر نگار تھے لیکن نام و نمود سے کوسوں دور۔ حتیٰ کہ دہلی کی ادبی سرگرمیوں سے بھی دور ہی رہتے تھے۔ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے لیکن سامع کی حیثیت سے۔ ہاں مشاعروں کے بعد جو مخصوص نشستیں ہوتی تھیں ان میں اپنا کلام بھی سنا دیتے تھے۔ ان نشستوں میں صدارت اکثر ان کے سپرد ہوتی تھی اور وہ اپنی کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی اردو اور اس مسکراہٹ کے طفیل جو ہمیشہ ان کے خوبصورت چہرے پر کھیلتی رہتی تھی محفل کو شگفتہ تر بنا دیا کرتے تھے۔ ایسی محفلوں میں مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے۔ جگن ناتھ تم میرے قریب آکر بیٹھ جاؤ، تمہاری مدد کے بغیر میں صدارت نہیں کر سکوں گا۔ دو چار محفلوں میں جب انہوں نے ایسا کہا تو تاباں اور بعض دوسرے دوستوں نے ازراہِ مزاح مجھے نائب صدر کا لقب دے دیا جس محفل میں بنے بھائی موجود ہوں اور میں نہ پہنچ سکوں تو یاروں کا اکثر یہ ہوتا تھا بھئی ذرا ٹھہر جاؤ ابھی نائب صدر تو آئے نہیں یا اگر میں موجود ہوں اور بنے بھائی نہ ہوں تو تان کچھ ایسے ہی فقرے پر ٹوٹتی تھی کہ لیجئے نائب صدر آگئے اور صدر ابھی تک نہیں آئے۔

کوئی تین برس کی بات ہے بنے بھائی صادق صاحب مرحوم کی دعوت پر کشمیر تشریف لائے۔ رضیہ بھابی بھی ان کے ساتھ تھیں۔ صادق صاحب ہی کے مہمان تھے۔ میری تقریباً ہر شام ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ اسی قیام کے دوران میں کشمیر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کا ذکر آیا اور یہ طے پایا کہ سری نگر میں از سر نو انجمن قائم کی جائے چنانچہ اس سلسلے میں میرے ہی دفتر میں مسلسل کئی روز تک وہ آتے رہے بحث مباحثے ہوئے، مسودے بنے اور طے پایا کہ کشمیر ڈیموکریٹک رائٹرز ایسوسی ایشن کے نام سے ایک ادبی تنظیم کشمیر میں قائم کی جائے چنانچہ یہ تنظیم قائم ہوئی بنے بھائی ہی نے اس کی بنیاد رکھی اور ڈھائی برس تک یہ تنظیم کشمیر میں علمی اور ادبی کام کرتی رہی۔

بنے بھائی بھری بزم کے محبوب تھے اور ع ایں سعادت بزور بازو نیست۔ ان کا حلقہ احباب کسی ایک ملک یا براعظم تک محدود نہ تھا بلکہ ہندوستان، پاکستان، روس، کیوبا، مشرقی اور مغربی یورپ، انگلستان، امریکہ ہر جگہ ان کے چاہنے والے موجود تھے اور ہیں۔ اسی ہماری وادی میں ان کے عزیز دوستوں کی کمی نہیں۔ صادق صاحب مرحوم ہمارے وزیر اعلیٰ سید میر قاسم، پیر عبد الاحد، پیر غیاث الدین، موتی لعل مصری، ڈاکٹر مرزا، دینا ناتھ نادم اور کتنے ہی شاعر اور ادیب ان کے عزیز ترین دوستوں میں تھے کس کس کا نام لیا جائے۔ یہ فہرست مکمل ہو ہی کہاں سکتی ہے۔

میری یہ مختصر سی بات چیت بنے بھائی کی علمی، ادبی یا سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں نہیں ہے، ان کی شاعری کے متعلق نہیں ہے، ان کی نثر نگاری کے متعلق بھی نہیں ہے یہ محض ایک یاد ہے اس محبوب کی جسے ادب کی ترقی پسند تحریک میں امیر کارواں کا رتبہ حاصل تھا اور ہم جسے پیار سے بنے بھائی کہتے تھے۔ بنے بھائی جو آج ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے ہیں جن کے جانے سے ملک کی ادبی فضائیں اداس ہیں جن کے جانے سے ہماری نگاہیں اجاڑ اور ویران ہیں اور جنہیں اب ہم کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔

ہمیشہ رہے نام اللہ کا! (ایک پرانا لیکن غیر مطبوعہ نشریہ)

ڈاکٹر سید مقصود زاہدی

اطہر جاوید

جب ہم کسی سے پہلی بار ملتے ہیں اور وہ ملاقات اک رواداری کے عالم میں ہوتی ہے تو وہ کسی مرتبے کا انسان کیوں نہ ہو، ہم پہ کوئی گہرا اور دیرپا اثر نہیں چھوڑتا۔ ہوا کا اک جھونکا جیسے دریا کی ایک لہر، بھاگتے ہوئے منظر کی جھلک اور ہم اپنی زندگی کی مصروفیات میں خارج سے باطن یا اندر سے باہر کے کسی سفر میں گم ہو جاتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ ہم کسی سے کبھی ملے بھی تھے۔ اس وضع کی ملاقاتیں میری بہت سے فن کاروں قلمکاروں، شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ سیاست دانوں اور مدبروں سے بھی ہوئیں۔ لیکن میں زندگی کے رواں دواں دریا کی ہر موج کا حساب کیسے رکھوں۔

ع ہر شے مسافر ہر چیز راہی

اس ہمہ جہت انسان کو جو دریا بھی ہے اور قطرہ بھی، اک ذرۂ ناچیز بھی ہے اور صحرائے لق و دق بھی، کون سے کاریوں یا بکھے بندھے اصول کے تحت تمام و کمال سمجھا جا سکتا ہے۔

اور یہی مسئلہ میرے روبرو اُس وقت آیا جب میری اطہر جاوید سے جو بھی یا پانچویں ملاقات تھی۔ ایک مدیرت کسی اہل قلم کی ملاقات شاذ ہی اچھے اور خوشگوار اثرات مرتب کرتی ہے اور بسا اوقات تو یہ بدمزگی پر منتج ہوتی ہے۔ اطہر جاوید سے پہلی بار تو یونہی اچانک سلطان رشک مدیر نیرنگ خیال کی شادی میں ملاقات ہو گئی تھی اس دوران ... اور شخصیات بھی درمیان میں حائل تھیں۔ سید ضمیر جعفری مزاحیہ شاعری کا ایک پس منظر لیے وہاں موجود تھے۔ کرنل محمد خان انہی دنوں ادبی دنیا میں "بجنگ آمد" کے مصنف بن کر تہلکہ مچائے ہوئے تھے اور وہاں تو حکیم محمد یوسف حسن صاحب بھی موجود تھے جن کی موجودگی بجائے خود ایک بڑی کشش کا درجہ رکھتی تھی اور شاعر اور مدیر جو ایک سوداگر بچہ بھی ہو اس کی شادی ہو تو اور بھی بہت سے حضرات کی موجودگی یقینی ہوتی ہے کہ اچانک کرنل محمد خان صاحب کے جانے کیسے بیٹھے بٹھائے دل میں خیال آ گیا۔ "بھئی سہرا کون پڑھے گا؟" لیجئے جناب ایک نئی افتاد پیش آ گئی

نہ خود سلطان رشک نے اپنا سہرا لکھا تھا کیونکہ یہ بات روایت کے خلاف ہے کہ کوئی دولہا خود اپنا سہرا لکھے۔ نہ منیر جعفری نے یہ نیک کام سرانجام دیا تھا نہ کسی اور شاعر کے ذمہ یہ کام لگایا گیا تھا۔ بس کرنل صاحب نے "فال اِن" کا آرڈر دیا اور ہم تینوں کو یعنی خاکسار، اطہر جاوید اور منیر جعفری صاحب کو اس کام پر مامور کر دیا۔ ہم تینوں نے اناپ شناپ مل جل کر مصرعے لگائے پھر ان میں گرہیں لگائیں اور یوں یہ آورد کا مارا چندے کا سہرا وجود میں آیا۔ کرنل محمد خان ہر مصرعے پر تنقید کرتے رہے کہ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ بہرحال یہ چندے کا سہرا منیر جعفری صاحب نے اپنی مانوس آواز میں سر محفل سنایا، اور بات ختم ہو گئی۔ وہ سہرا ایسا بھی نہ تھا کہ کوئی یہ تعلّی کرتا کہ

دیکھیں اس سہرے سے بڑھ کر کوئی کہہ دے سہرا

اور باوجودیکہ تین شاعروں نے زور لگایا تھا۔ لیکن بیاں و یزدانی کی طرح

ذوق و غالب نہ سہی اب ہیں بیاں داغ و امیر
دیکھیں اس سہرے سے بڑھ کر کوئی کہہ دے سہرا

تین ملاؤں میں مرغی کا جو حال ہو سکتا ہے وہی اس سہرے کا بھی ہوا ہوگا اور ہمیں یقین ہے کہ سلطان رشک نے یہ سہرا فریم کرا کے اپنی نشست گاہ کی زینت ہرگز نہیں بنایا ہوگا۔

بہت دنوں بعد کہیں جا کر اسلام آباد کانفرنس کے میلے میں اطہر جاوید سے چلتے پھرتے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اقبال ساغر صدیقی صاحب نے تعارف کراتے ہوئے کہا" ارے آپ ان سے واقف نہیں!" اس سے قبل کہ میں اثبات یا انکار میں جواب دیتا اطہر جاوید بولے " اجی یہ ہمیں کیوں پہچاننے لگے ہیں حالانکہ ہم ایک شاعر کا سہرا ہنڈی میں مل جل کر کہہ چکے ہیں"۔ معاً میری یاد کا کوندا لپکا، لمبی ناک، بڑھی ہوئی قلمیں اور دراز زلفیں اور میں نے فوراً کہا" بھئی اطہر جاوید سے کون ناواقف ہو سکتا ہے"۔

اگرچہ دراز زلفیں، لمبی قلمیں اس دور میں کسی بھی شخص کے بارے میں شاعر اور ادیب نہ سہی ایک دانشور کا دھوکا تو پیدا کر ہی سکتی ہیں۔

گزشتہ چند سالوں سے ناموں اور چہروں کو میں کبھی کبھی بھولنے لگا ہوں اور یہ علامت مجھ میں رو بہ ترقی ہے کبھی کبھی تو نام کے سلسلے میں ذہن ایسا کورا ہو جاتا ہے کہ اچھے اچھے کرم فرماؤں کے نام ذہن سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ ابھی اہل قلم کانفرنس میں اسلام آباد ہوٹل میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری پر مرتضیٰ برلاس کا گمان ہوا تھا۔ اور پھر ایسی خفت اٹھانی پڑی تھی کہ جب مرتضیٰ برلاس ملے تو میں نے ان سے کہا تھا" خدا آپ کو بھی ایسا ہی خوار

سے جیسا آپ نے آج صبح ڈاکٹر فرمان صاحب کے روبرو مجھے کیا ہے"۔ میں اپنی اس مجہول پر جسے خفیف الحرکاتی بھی کہا جا سکتا ہے اب تک نادم ہوتا ہوں کیونکہ یہ غلطی میں نے دانستہ تو کی نہیں تھی۔

ملتان کے بشپ وکٹر سیموئیل اور نذیر قیصر کے ادبی ذوق و شوق کے طفیل ایک ادبی سیمینار کا اہتمام کیا گیا جدید ادب اور انسان" انتظار حسین، اسرار زیدی، اصغر ندیم سید اور عذرا اصغر، جیلانی کامران اور اطہر جاوید لاہور سے تشریف لائے اور کوئٹے سے بیگم ثاقبہ رحیم الدین صاحبہ تشریف لائیں۔ اس دفعہ میں نے اطہر جاوید کی پھبتیوں فقرے بازی اور چٹکلوں کے ساتھ ساتھ بزعم خود غلط شاعروں کو ہوٹ کرنے سے بھی لطف اٹھایا۔ اور ان کی باہم اور بے ہمہ کیفیات کا ذرا قریب سے مشاہدہ کیا۔ مشاعروں میں اپنا کلام سنانے سے گریزاں لیکن مجلس میں گرمجوشی کی کیفیات اُن سے تازہ بہ تازہ اور مکرر ہوتے دیکھیں۔ اگرچہ یہ سیمینار دو روز تک جاری رہا اور اس کی کئی نشستیں ہوئیں، لیکن اطہر جاوید نے اپنا کلام سنانے پر اصرار نہیں کیا۔

کنونشن ختم ہوا تو آذر صاحب ڈائریکٹر نیشنل سنٹر ملتان نے ایک ہوٹل میں مہمانوں کو اور کچھ مقامی حضرات کو چائے پر مدعو کیا۔ اور ایک مختصر سی مجلس مشاعرہ بھی منعقد ہوئی۔ لیکن یہاں بھی اطہر جاوید نے دو چار شعر سنا کر معذرت کر لی۔ میں نے چاہا کہ باہر سے آنیوالے حضرات کی میں بھی کچھ تواضع کروں لیکن کچھ حضرات اسی دن دوپہر کو واپس جا رہے تھے۔ البتہ اطہر جاوید، عذرا اصغر اور اصغر ندیم سید مع اپنے میزبان نذیر قیصر کے غریب خانے پر آ گئے اور ایک خاصی دلچسپ اور طویل نشست ہو گئی، جس میں اطہر جاوید کو شاعر کم اور زیادہ مجلسی انسان نظر آئے۔ گویا وہ اپنی شخصیت پر ایک ہلکا سا نقاب ڈالے رہتے ہیں تاکہ ان کی دوسری جہتیں سامنے نہ آئیں اور ان کے باطنی اوصاف دوسروں کی نگاہوں سے جہاں تک ہو سکے اوجھل رہیں

اس مرتبہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی طلبی پر لاہور پہنچا اردو کانفرنس میں شرکت کے ساتھ ساتھ وقت نکال کر دوسرے احباب سے بھی ملاقاتوں کے لئے وقت نکالا۔ دفتر امروز بھی گیا۔ ہمارے مدتوں کے پرانے ساتھی مسعود اشعر سلیم عثمانی اور دوسرے احباب سے ملتے ملاتے اطہر جاوید سے بھی ملاقات ہو گئی۔ وہ ہوٹل سے تازہ تازہ آیا ہوا کھانا کھانے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ مجھ سے بے تکلفانہ پہلا سوال یہ کیا کہ میں کھانا کھا چکا ہوں کہ نہیں۔ جب میں نے بتایا کہ کھانا مجھے کسی اور جگہ کھانا ہے تو اصرار سے مجھے اپنے ساتھ شریک کر لیا اور فقرے بازی کرتے رہے۔ چلیے مرغن اور رنگ برنگ کھانا نہ سہی، عوامی ہوٹل ہی کا سہی لیکن اس میں خلوص ہے۔ پھر چائے کے لئے آرڈر دیا کہ جدا جدا اور اچھی قسم کی تو لیکن جب لانے والا ملی جلی قسم کی چائے لئے آیا تو بہت برہم ہوئے۔ خاصی بدمزگی کا اظہار کیا۔ لیکن میں تو محبت اور خلوص سے پیش کی گئی ہر شے کو تحفہ تصور کرتا ہوں اور اس سے محظوظ بھی ہوتا ہوں۔ چنانچہ میں نے مزے لے لیکر چائے پی اور اطہر صاحب کے غصے کو فرو کرتا رہا۔ لیکن وہ تو مہمان نوازی کے جذبے سے بیتاب

ہو جاتے ہیں اور اس کا مظاہرہ انہوں نے ایک بار نہیں کئی بار کیا۔

ایک مرتبہ میں طلعت اور بیگم مال روڈ پر خرید و فروخت کرتے ہوئے گشت کر رہے تھے کہ میں نے طلعت سے کہا کہ چلو تمہیں پاک ٹی ہاؤس کا تماشہ دکھلاؤں۔ وہاں پہنچے تو حُسنِ اتفاق سے لاہور کے کم و بیش سارے ہی نمائندہ شاعر موجود پائے۔ ندیم، قتیل، منیر نیازی، اور بہت سے دیگر شعراء۔ وہاں اظہر جاوید بھی تھے جنہوں نے ہمارے داخل ہوتے ہی بڑے خلوص سے ہماری پذیرائی کی۔ ملاقاتیں تو سبھی سے ہوئیں۔ لیکن سب جیسے ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ سب پر عجلت کا عالم طاری ہی سمجھ گیا کہ کسی مشاعرے میں جانے کی تیاری ہے میں چائے کا آرڈر دیکر ایک میز پر بیٹھ گیا، جہاں منیر نیازی بیٹھے ہوئے تھے اور ان سے باتیں کرنے لگا۔ اسی دوران اظہر جاوید کاؤنٹر پر گئے اور وہاں خاموشی سے کچھ کہہ کر ہم سے رخصت طلب کر کے چلے گئے۔ جب ہم چائے پی کر کاؤنٹر پر پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ ہمارا بل ادا کر دیا گیا ہے اور یوں ہم پاک ٹی ہاؤس کا تماشہ مفت میں اظہر جاوید کی مہمانداری کے طفیل کر کے باہر آگئے۔ یہ اظہر جاوید کی وضعداری کی اِک ادائے خاص ہے۔ ورنہ اس زمانے کا انسان اتنی محبت اور مہمان نوازی کا مظاہرہ کب کر سکتا ہے۔

تیسری اہلِ قلم کانفرنس میں جو شرکت کا موقع ملا تو وہاں اظہر جاوید کی کمی کو بہت سے احباب نے محسوس کیا۔ عذرا اصغر صاحبہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے ایک طرف تو ان کی عدم شرکت کا جواز پیش کیا اور دوسرے شکوہ کیا کہ میں لاہور جاتا ہوں تو بالا ہی بالا اظہر جاوید سے دفتر امروز مل کر چلا جاتا ہوں۔ میں نے معذرت کی اور تلافی کے لئے دفتر "تخلیق" میں بھی حاضری دینے کا وعدہ کیا۔

اہلِ قلم کانفرنس سے واپسی کے فوراً بعد ایک عزیزہ کی وفات کے سلسلے میں فوراً لاہور جانا پڑ گیا۔ اس مرتبہ پھر طلعت اور بیگم ساتھ تھیں۔ لاہور میں طلعت کی خواہش پر بہت سے ہم قلم دوستوں سے ملاقاتیں کیں میں ہمیشہ کی مانند امروز کے دفتر بھی پہنچا اور ایک ایک کر کے جو بھی احباب ملتے رہے اُن کی صحبت سے فائدہ اٹھاتا رہا۔ آخر میں اظہر جاوید صاحب سے بھی ملاقات ہو گئی۔ وہی گرمجوشی وہی خاطر تواضع۔ طے پایا کہ دوسرے دن صبح کو دفتر "تخلیق" پہنچنا ہے۔ جب ہم حسبِ وعدہ وہاں پہنچے تو اظہر جاوید منتظر تھے۔ دو بڑی طویل نشستیں رہیں جن سے دو باتیں واضح ہوئیں، ایک تو یہ کہ اظہر جاوید ایک جمال پرست انسان ہے اور خواتین کی موجودگی میں دوسرے ثقہ حضرات کی طرح اپنے خول میں سمٹ کر نہیں رہ جاتا بلکہ کھُل کر باتیں کرتا ہے اور یوں وہ دوسری صنف کے افراد کو بھی اپنی باتوں میں شریک کر کے اپنا دوست بنانے کے ہُنر سے آگاہ ہے۔ دوسری بات اس کی مہمان نوازی کی مشہود حِس ہے جس سے اس کا ایک دردمند دل کا انسان ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس کی اَنا میں ایک سوز دروں کی خلش بھی ہے اور کربِ تنہائی کی آمیزش بھی۔ اور یہ کربِ تنہائی ہی تو ہے جو ہر فنکار کا ناقابلِ تنسیخ

ہوا یہ ہوتا ہے۔

میں نے اس کے متعدد کالم پڑھے ہیں۔ وہ اپنے ہر کالم میں ایک مخصوص ذہنی روش اور ایک دلچسپ اپروچ کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس کی درد مندی اور انسان دوستی اس کے کالم "دیدبان" میں ہمیشہ بڑے شد و مد کے ساتھ نظر آجاتی ہے۔ اس کا ایک کالم "محفل محفل" بھی ہے۔ لیکن یہ خالص ادبی معاملات سے پُر ہوتا ہے جس میں اسے لاہور کی ادبی محفلوں اور پاکستان بھر کے ادبی گروہوں اور سرگروہوں اور کالم نگاروں سے عدل و انصاف برتنا پڑتا ہے لیکن "دیدبان" کالم اظہر جاوید کے باطن کا مظہر ہوتا ہے جسے پڑھ کر ہم اس کے دل دریا کی امواج کی طغیانیوں کا بخوبی مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اظہر جاوید کے چند کالموں کے عنوانات ہیں "ممی مجھے بچاؤ"، "ضرورت ہے والدین کی تربیت کی"، "معاشرہ توازن اچھے لوگوں سے قائم ہے"، "سچا کون اور جھوٹا کون" اور "ماواں ٹھنڈیاں چھاواں"۔

ان کالموں میں کبھی اس کا قلم لاکھوں بے کس اور بے یار و مددگار بچوں کے لئے کڑھتا ہے جنہیں جینے کے لئے بے پناہ جدوجہد کرنا پڑتی ہے، ظلم سہنے پڑتے ہیں اور نت نئے عذابوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے، کبھی وہ سوچتا ہے کہ تعلیم و تربیت بچوں کو تو ملنی چاہیئے لیکن والدین اور بڑے بھی تعلیم و تربیت کے محتاج ہوتے ہیں، کیونکہ والدین اور بزرگوں کی غلطیوں کو آنیوالی نسلوں کو اپنے کاندھوں پر بوجھ کی طرح ڈھونا پڑتا ہے، اظہر جاوید ابدی نیکی اور سچائی کا قائل ہے۔ وہ ثابت کرتا ہے کہ معاشرے میں اصل توازن کا سبب اچھے لوگوں کے دم سے قائم رہتا ہے اس کا کالم "ماواں ٹھنڈیاں چھاواں" ایک زہر خند کی حیثیت رکھتا ہے اس میں اظہر جاوید کے دل میں، ممتا کے لازوال جذبے کی جو قدر و منزلت ہے اس کا اظہار ملتا ہے۔ اسے کسی طرح یقین ہی نہیں آتا کہ کوئی بیٹا اپنی ماں کو قتل کر کے کیسٹ کے گانوں کی دھن پر رقص بھی کر سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایسا صرف فاترالعقل انسان ہی کر سکتے ہیں، لیکن ہمارے معاشرے میں سرمائے اور جاگیر کی دھنوں پر ناچنے والے معاشرے میں تو اس قسم کے سفاک انسان قدم قدم پر ملتے ہیں۔ کبھی بیوی کو کبھی بہن کو کبھی ماں کو اور کبھی اپنے باپ کو مال و زر کی خاطر جائیداد اور زمین کی خاطر آئے دن قتل کیا جاتا ہے۔ اظہر جاوید تو پرانے صحافی ہیں، کالم نگار ہیں بھلا وہ ایسی آئے دن کی خبروں سے کیسے بے خبر رہ سکتے ہیں۔ ایک عام قاری سے کہیں زیادہ وہ ان باتوں کی خبر رکھتے ہوں گے۔ بہرحال ان کے یہ کالم اتنا ضرور بتاتے ہیں کہ اظہر جاوید ایک ایسے معاشرے کا تصور ذہن میں لئے بیٹھے ہیں، جہاں انہیں ایسے کالم لکھنے کی ضرورت نہ پڑے وہ خود بھی اپنے ہی کالم کا معمول نظر آتے ہیں۔ اچھے آدمی محض اچھے آدمی ہوتے ہیں اظہر جاوید، منو بھائی، انعام درانی جیسے کالم نگار ہمارے معاشرے کے رِستے ہوئے ناسوروں کو دیکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان ناسوروں کے سوتے بند ہو جائیں۔ وہ ان پر مرہم نوشدارو رکھ کر انہیں مندمل کرنے کے آرزو مند ہوتے ہیں لیکن کیا ایسا ممکن بھی ہے۔ !!

میں نے ذکر کیا تھا کہ فنکار شاعر اور دانشور کی پہچان آگہی ہے ۔ اسلوب بھی ایک وسیلہ ہے ۔ لیکن تخلیق جس میں اسلوب پختہ نہ بھی ہو تو وہ پہچان بن سکتا ہے بھلا تلسی داس کا یہ دوہا ۔

مایا سے مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ
تلسی داس غریب کی کوئی نہ پوچھے بات

جو صدیوں سے خاص و عام کی زبان پر ہے اپنے اندر ایسی کون سی نرالی بات رکھتا ہے ۔ ایک عام سی بات ہے جسے ہر باشعور انسان جانتا ہے ۔ لیکن با ایں ہمہ اس شعر کی فصاحت و بلاغت میں کون شبہ کر سکتا ہے ۔

ایک طویل صحبت میں اظہر جاوید نے جس کے بارے میں اُس کے ایک دوست ظفر اقبال کا یہ خیال ہے ۔ " اظہر جاوید ایک ایسا نشتر ہے جو رگ و پے میں اُتر جاتا ہے " اپنی ایک پنجابی غزل اور اک اردو نظم سنائی ۔ یہاں رام لعل بھارت کے مشہور افسانہ نگار کے چند الفاظ کا حوالہ بے سود نہ ہوگا ۔ وہ اظہر جاوید کے متعلق کہتا ہے " وہ مجلس میں حاضر جواب رہنے والا انسان ہے ۔ ۔ ۔ جس کی اک مخصوص ادا پرلے درجے کا سنبولا ہونا بھی ہے " اس سنبولڑ اور مجلسی انسان کے اشعار پڑھیے اور غور فرمائیے کہ یہ کس سوزشِ باطن اور عذاب تنہائی میں مبتلا ہے اور اس کا کس طرح اظہار کرتا ہے

اِکلاپے دے روگ کلوں تو مر جائیے تے چنگا اے — غم دی بازی جتنی کانوں ہر جائیے تے چنگا اے
جیوندیاں جی تے ناں دی تختی کسے دی بوہے لگی ناں — کتبہ اپنی قبر تے آپے دھر جائیے تے چنگا اے
موئیاں پچھوں یاراں نے جے ساڈا مُل چکانا اے — اے دی اج اپنا سودا کر جائیے تے چنگا اے

یوں اظہر تنہائی کے روگ پر موت کو ترجیح دیتا ہے ۔ اگرچہ یہی عذاب اور کرب تو ہے جو فن اور تخلیق کے سوتوں کو بند نہیں ہونے دیتا ۔ تخلیق جو فن کار کی معنوی اولاد کی حیثیت رکھتی ہے ، اظہر جاوید اپنی قبر پر کتبہ لگانے کا خود ہی آرزو مند ہے اور اپنا مُل اپنی ہی زندگی میں چکانا چاہتا ہے ۔ یا محض اچھے اور بیہودہ طور کہہ رہا ہے ۔ بس یہی اک رمز ہے جسے پا لینے کے بعد تخلیق اور فن کار کے باہمی رشتے کو پہچانا جا سکتا ہے ۔ یہ تمام اشعار مجید امجد مرحوم کے طرزِ احساس کی یاد دلاتے ہیں اور انہیں پڑھ کر اس کی کئی نظمیں ، کئی اشعار بالخصوص نظم "آٹوگراف" خود بخود ذہن میں آ جاتی ہے ۔ اب اردو کی ایک نظم بھی دیکھیے ۔

زندگی کا سفر ختم ہوتا نہیں
در بدر گھومتے ، بے خبر گھومتے
اپنی راہوں کے سنگِ سفر چومتے
عمر گزری مری

وقت کی گرد بالوں پہ جمنے لگی
دھڑکنوں کی جوانی بھی تھمنے لگی
میرے چہرے کو ویرانیاں کھا گئیں
میری آنکھوں میں حیرانیاں چھا گئیں
منزلوں کا نشاں پھر بھی پایا نہیں
اور میں لوٹ کے گھر بھی آیا نہیں۔

یہ شاعر، صحافی، کالم نگار اور ان سب سے بڑھ کر ایک اچھے انسان کے تخلیقی روپ ہیں جن سے اس کی باطنی خصوصیات کی روشنی جھلکتی ہے۔ اس نظم میں محمد علی صدیقی جیسے نقاد نے ڈان اخبار میں ایک ریویو لکھا ہے جس میں اس نظم کے متعلق کہا اور نظم کی تعریف و ستائش کی ہے لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوتا، یہ ریویو نہ بھی لکھا گیا ہوتا اور اسے میں نے نہ بھی پڑھا ہوتا تو یہ نظم دائمی ۔ کی حامل تو نظر آتی ہے۔ یہ بے بس اور مجبور انسان کا سفرِ حیات ہے جسے غالب نے کہا تھا

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
اور میر نے کہا صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یونہی تمام ہوتی ہے

میں نے اپنی ایک بیاض اسی تخیل کا احاطہ کرنے کی سعی کی ہے۔

میں کب سے زمانوں میں ہوں سرگرمِ سفر ہیں راستے پھیلے ہوئے تا حدِ نظر
صدیوں کے تسلسل میں ہوں آوارہ خرام مقصد کا شعور کچھ نہ منزل کی خبر

اکبر حمیدی کی یہ نظم ایک درد مند اور گداز دل رکھنے والے انسان کے سفرِ زندگی کی ان تھک سفرِ حیات کی اک روداد ہے۔ سفر جو ازل سے کر رہا ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ تصوف، گیان دھیان، سنیاس اور انسانوں کی اصلاح و تربیت کا جنون اس کے دکھوں کی چارہ گری کی کوششیں، انہیں حل کرنے کا احساس، پیہم چلتے جانا اور بغیر تھکے رواں دواں۔

انسان کو اپنی تمام کوششوں کے باوجود نہ منزل ملتی ہے نہ وہ مقام جہاں سے اس نے پہلے پہل سفر کا آغاز کیا تھا۔ یہ وہ اکبر حمیدی ہیں جس سے کئی بار ملکر اسے میں نے اس کے خدو خال اس کے لیے بالوں، جھکی ہوئی پلکوں اور باس کی وضع قطع سے جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی لیکن جس کا شیوہ اور شعار مجھے محض اخلاص و محبت ہی نظر آیا۔ میں تو اکبر حمیدی ایک منکسر مزاج سوشل کہتا تھا جو میں کا احترام تو نہیں بنا لیکن اللہ کے بندوں سے پیار ضرور کرتا ہے اور اس پیار نے اسے کبھی ماخارجیہ کے اعضا اللہ کے تعجب کر کے کبھی دیر ہاں کالم لکھ کر ... سحر مخلد امر اردو کا قلمی ا...
... جرگو ... ۱۰ ... ۱۹۷ ...

جیلانی کامران

شاعری اور انسانی خدوخال

اس بات سے بہت کم اختلاف کیا جاسکتا ہے کہ ہر زمانہ اپنے ادب سے پہچانا جاتا ہے۔ اپنے گزرتے ہوئے روز و شب کے دوران جن کے مجموعے سے کسی نسل کا زمانہ پیدا ہوتا ہے، اس دور کی نسلیں صرف اپنا عکس اپنے ماحول ہی میں دیکھنے کی قدرت رکھتی ہیں اور انہیں صرف اپنا آپ ہی دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح مختلف چہروں کے باہمی رشتے سے وہ سب کچھ ظاہر ہوتا ہے جسے انسان کی پریشانی اور تشویش کہا جاتا ہے۔ اور پھر نہ وہ نسل رہتی ہے، نہ اس کے ارادے باقی رہتے ہیں، اور نہ وہ باتیں رہ جاتی ہیں جن پر کسی عہد کی نسل اپنا عکس ثبت کرنے کی آرزومند ہوتی ہے۔ صرف لکھا ہوا لفظ باقی رہ جاتا ہے۔ ادب باقی رہ جاتا ہے جو اس نسل کے گناہوں کی روداد آنے والی نسلوں کو سنانے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔

کسی زمانے کی انسانی آبادی جس سے اُس زمانے کی نمائندہ نسل مرتب ہوتی ہے اپنے بارے میں اچھی اچھی رائے رکھنے کا بخوبی حق رکھتی ہے۔ اور اپنے آپ کو کسی بھی اخلاقی مرتبے اور مقام سے پکار سکتی ہے مگر لکھنے والوں کے لئے ایسی آسانی کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اور خاص طور پر ان کے لئے جو اپنے تخلیقی عمل کو شاعری سے نسبت دیتے ہیں وہ خود کو اچھے ناموں سے پکار نہیں سکتے۔ کسی دور کے اجتماعی گناہ کا گہرا اثر شاعر کی شخصی نفسیات پر ہوتا ہے۔ اور ادب اس عمل سے کسی طرح بچ نہیں سکتا۔ ادب اور شاعری گناہ کی کہانی مرتب کرتے ہیں اور اُسی زمانے کی نسل اپنے کارناموں کا تذکرہ کرتی ہے۔ اور اس طرح ادب اور شاعری، اور زمانہ اور اس کی نمائندہ نسل دونوں الگ الگ محاورے میں گفتگو کرتے ہیں۔ اس کیفیت کو تنقید کی زبان میں کئی نام دیئے گئے ہیں۔ مگر یہ امر بخوبی واضح ہے کہ اس کیفیت سے گناہ اور کارناموں کی دوئی ظاہر ہوتی ہے جو ہر زمانہ حقیقت کے اس بنیادی سانحے سے دوچار رہتا ہے، اور شاید اسی سانحے سے

صورت بھی پیدا ہوتی ہے جو کسی عہد کو دورِ تشویش کا نام دیتی ہے۔

کہا گیا ہے کہ انسان گم ہو چکا ہے اور لوگ باقی رہ گئے ہیں۔ جو اہلِ نظر اس بات کو تسلیم نہیں کرتے اُن کا خیال ہے کہ انسان نام کی کوئی بھی شے موجود نہیں ہے۔ صرف لوگ ہی انسانی اکائی کو ظاہر کرتے جس دنیا سے ہمارا اس زمانے میں سابقہ ہے وہ اِن دونوں کیفیتوں کے مابین بٹی ہوئی ہے یہ دنیا لوگ کو معروضی سچائی کے طور پر تسلیم کرتی ہے مگر انسان کی تلاش کرتی ہے۔ غالباً اسی لئے زمین پر انسان تلاش ادب اور شاعری کا نمایاں موضوع بن چکا ہے۔ اور اگر ادب کے ذریعے کسی تہذیب کے مافی الضمیر علم ممکن ہے تو جو امر واضح ہوا ہے یہ ہے کہ ہماری تہذیب کلاسیکی تصوّف کی کائنات سے باہر آ چکی تاہم یہ الگ بات ہے کہ اب تصوّف کا عروجی سفر زمین پر جاری ہے اور اس کا محور انسان بن چکا ہے ہماری فکری دنیا کا یہ نقشہ سنجیدہ توجہ چاہتا ہے۔

انسان کی تلاش میں جو کوئی معاشرے کا (اور ہماری دنیا کا) سفر اختیار کرتا ہے اُسے ہر دوسرے قدم دلدل دکھائی دیتی ہے۔ مگر یہ دلدل صرف تلاشِ انسان کے مسافر کو اپنی جانب بلاتی ہے۔ تاہم اپنے سفر سے پھر جب یہ مسافر اپنی دریافتوں کی تفصیل سے آگاہ کرتا ہے اور جس سے ہمارا ادب پیدا ہوتا ہے تو انسان بارے میں اِس قسم کی معلومات حاصل ہوتی ہیں :۔

(۱) انسان ایک نہیں انسان دو قسم کے ہیں جن کو حاکم اور محکوم انسان کہا جاتا ہے۔

(۲) انسان کی یہ دونوں قسمیں شکست و ریخت سے دوچار ہیں۔ اور شکست و ریخت کے نتیجے میں انسان زخمی ہو چکا ہے۔

(۳) انسان بیمار ہے۔ اور اُسے اپنے عارضے کا علم نہیں ہے۔

(۴) انسان کی صحت یابی کے لئے جو طریقے اختیار کئے گئے ہیں انہوں نے انسان کو اور زیادہ بیمار کر دیا ہے۔

(۵) انسانی کیفیت سائیکو پیتھک صورت اختیار کر چکی ہے۔

انسان کی تلاش ہی کے سلسلے میں ایک معروف اہلِ نظر کا کہنا ہے :۔

"کئی برس قبل مجھے دریائے ستلج کے کنارے سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ بارشوں کا موسم کچھ روز پہلے ختم ہوا تھا۔ اور دریا کے کنارے نرم زمین پر دلدلیں بن چکی تھیں۔ میں اُس راستے سے پیدل گزر رہا تھا۔ دفعتاً میں نے دیکھا کہ ایک اونٹ دلدل میں گھرا ہوا ہے۔ غالباً کوئی

> قافلہ اپنے اونٹوں کے ساتھ اس طرف سے گزرا تھا اور یہ اونٹ
> اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا تھا۔ اس اونٹ کا نچلا دھڑ دلدل
> میں دھنس چکا ہے، اور صرف اس کی لمبی گردن اور کوہان
> باہر تھے..... دلدل کی مہلک کشش اس کی دلدوز آواز
> میں بخوبی آشکار تھی..... مگر اس کی آواز میں بھی وہ
> شدت نہ تھی جو پختہ زمین پر چلنے والے اونٹوں میں محسوس
> ہوتی ہے..... انسان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی سانحہ
> رونما ہوا ہے۔

اسی ضمن میں تلاشِ انسان کے اُن اہلِ فکر اصحاب کی رائے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو ادیبوں کے درمیان اہلِ باطن کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ اُن کی رائے کچھ اِس نوع کی ہے کہ انسان کے باطن میں ایک خاص قسم کا سرکٹ ہے جو کام کرتا ہے تو انسان، انسان بنتا ہے۔ لیکن یہ سرکٹ ایک مخصوص دروازے کے کھلنے سے اپنی توانائی حاصل کرتا ہے اور اس دروازے کا نام باب العلم ہے..... مگر ہمارے عہد سے اس دروازے کی چابی (کلید) گم ہو چکی ہے۔ اس لئے نہ تو دروازہ کھلتا ہے اور نہ سرکٹ ہی توانائی حاصل کر سکتا ہے اور انسان اپنی پہچان کے لئے چارہ چرنے والے جانداروں میں شامل ہو گیا ہے۔

فلسفے سے تعلق رکھنے والے انسان کو چناؤ کا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔ اور بتاتے ہیں کہ ہر شخص اصلی طور پر محض ایک شخص ہے۔ لیکن جب وہ اپنے لائحہ عمل کے لئے چناؤ کرتا ہے تو وہ انسان کی نمائندگی کرتا ہے اور اس طرح شخص کے مرتبے سے گزر کر انسان کے مقام پر ظاہر ہوتا ہے اور انسان بنتا ہے۔ قوموں کی تاریخ میں اس طریقِ کار کی مدد سے جمہوریت، انسانیت میں بدلتی ہے۔ اور چونکہ چناؤ انسان کا مقدر ہے اس لئے صرف اس ایک حق اور قوت کے ذریعے انسان اپنے ماحول، اپنے زمانے اور کائنات کی تسخیر کر سکتا ہے۔ اس سچائی کی گواہی دے سکتا ہے کہ زمین پر انسان الٰہی مشیت کی نمائندگی کر رہا ہے۔ تاہم جہاں ماحول انسان پر غالب آ جاتا ہے وہاں انسان اس شخصی قوت (اختیار/چناؤ) سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور تمدنی طور پر اس منزل میں آ ٹھہرتا ہے جہاں انسان اور چوپایے کے مابین کوئی فرق باقی نہیں رہتا..... تلاشِ انسان کے سفر میں غالباً اسی لئے کئی ایک افسانہ نگاروں کی چوپایوں سے آشنائی ہوئی ہے۔

تلاشِ انسان کے موضوع کے ساتھ اگر ادب کے بطن میں موجود کیفیات کا جائزہ لیا جائے تو اس بات سے بہت کم اختلاف ہوگا کہ ہمارے ادب کے بطن میں غیر معمولی توانائی برابر موجود رہی ہے اور برابر موجود ہے۔

یہ اس توانائی سے بیشتر احتجاج کی صورتیں اختیار کی ہیں۔ تاہم ان صورتوں کی تخلیق میں ادیب اپنے انسانی مواد سے مناسب فاصلہ روا نہیں رکھتا۔ اس لئے احتجاج فن کی بجائے رپورتاژ بن جاتا ہے، اور جہاں فاصلے اور انسانی مواد کا تناسب قائم ہوتے دکھائی دیتا ہے وہاں رومان ظاہر ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے ہمارا ادب احتجاج اور رومان کے رویوں کی نشاندہی کرتا ہے اور جہاں توانائی ان دونوں رویوں سے الگ ہوتے ہوئے اپنا اظہار فراہم کرتی ہے وہاں استعاراتی زبان ظاہر ہوتی ہے اور توانائی استعاروں کے جنگل میں بکھر جاتی ہے۔ اگر ان رویوں کا بغور احساس کیا جائے تو اس نتیجے پر پہنچنا مشکل نہ ہوگا کہ نہ تو احتجاج کی صورتیں اور نہ رومان کی صورتیں ہی اپنے عہد کی درست تخلیقی پہچان ہیں اور نہ استعاراتی زبان ہی اپنے زمانے کی مناسب زبان ہے۔ ادب کی تخلیقی توانائی کسی نئی صورت گری کی خواہش کرتی ہے۔ وہ توانائی جو اپنے لئے مناسب صورت حاصل نہیں کر سکتی اپنے نیم پختہ اظہار کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کو بھی ہلاک کر دیتی ہے۔

تاہم انسان کے ساتھ جو کچھ رونما ہوا ہے اور تلاشِ انسان کے سفر میں جو کچھ حاصل ہوا ہے اسے ہمارے عہد کے تاریخ نویس غالباً منفی کامیابیوں کے زمرے میں شمار کریں گے۔ اور اس کی وضاحت کے لئے وجوہات کی کمی بھی نہیں ہے۔ لکھنے والوں سے جب کبھی پوچھا گیا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ تو وہ بھی وجوہات کی ایک لمبی فہرست کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن جب ان سے کہا جائے کہ وجوہات سے صورتحال متاثر نہیں ہوتی اور نہ محض وجوہات کے بیان کرنے سے کوئی بیمار شفایاب ہو سکتا ہے۔ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہمارا کام تو صرف وجوہات کے بیان کرنے کا ہے۔ اسی لئے تو ہم عکاسی کرتے ہیں اور اپنے عہد کا منظر دکھاتے ہیں۔ ایسے متعدد جوابات انسان کی مدد سے قاصر دکھائی دیتے ہیں — اور شاید اسی لئے جب انسان ہی کے حوالے سے (کہ انسان کہاں ہے / انسان کسی عارضے میں مبتلا ہے) پوچھا جاتا ہے کہ انسان پر جو کچھ وارد ہوا ہے اور وارد ہو رہا ہے اسے بہتر طور پر کون بدل سکے گا۔ تو جواب ملتا ہے کہ جب معاشرہ بدلے گا، ماحول بدلے گا تو لوگ بھی بدل جائیں گے۔۔۔۔ اور انسان بھی شفا پائے گا

حقیقت یہ ہے کہ لکھنے والوں نے انسان کو نظر انداز کر کے غیر انسان کو اپنا موضوع بنا رکھا ہے، اور اس طرح وہ اپنے تخلیقی حق کو سوشل سائنس کے سپرد کر کے خود اپنے ہی رسم و سلوک سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ رویے کی ایسی تبدیلی سے جو سانحہ ظاہر ہوا ہے یہ ہے کہ ہمارا عہد شاعری سے کلیتاً محروم ہو چکا ہے یہ الگ بات ہے کہ ہمارے عہد میں نظموں اور غزلوں کی تعداد میں بے دریغ اضافہ ہوا ہے۔ اور نثری نظم نے اس خالی میدان پر اپنا تسلط جما لیا ہے۔ اگر بغیر کسی تعصب کے اس سارے منظر کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ ہمارا ادب اور ہماری شاعری دونوں سوشل سائنس کے بتائے ہوئے لائحہ عمل کو اختیار کرتے

ہوئے ماحولیات کا محض پیرا فریس کرتے ہیں۔ اور ہم اپنی بدقسمتی میں اس پیرافریس کو تخلیقی ادب کا نام دیتے ہوئے اطمینان محسوس کرتے ہیں۔

اگر اس امر سے ہمارا اتفاق ہے کہ انسان کسی ابتلا کا شکار ہے اور اُسے اس ابتلا سے نجات دلانا ضروری ہے تو محض دجوہات اور ماحولیاتی مناظر کی عکاسی اور جذبات کے پیرافریس سے ایسا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ اور جس نوع کا ادب لکھا جا رہا ہے اس کی مدد سے رائے عامہ کو بھی منظم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ باتیں کسی طرح درست ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو اس کی ابتلا سے بچانے کے لئے اور تلاشِ انسان کے موضوع کے لئے رکہ انسان کہاں ہے؟ آدم کجا ست) ادب کو کس اصول کی بنیادی طور پر ضرورت ہے؟ مگر اس سوال کی نشاندہی سے قبل یہ امر تسلیم کرنا لازمی ہے کہ انسان کے بچائے جانے کے لئے صرف ادب ہی کا ادل ایسا ہے جو اس بڑے مقصد کے لئے کار آمد ثابت ہو سکتا ہے اور صرف ادب ہی اس زمانے میں انسان کو اس کی ہمہ گیر کہانی ابتلا سے بچا سکتا ہے۔

ہماری دنیا جس میں ہم جی رہے ہیں دو کیفیتوں کا مجموعہ ہے جنہیں تصوّف کی زبان میں نزولی اور عروجی کیفیت کا نام دیا گیا ہے۔ ہماری زندگی کا سفر بالعموم نزولی نوعیت کا ہے اور دنوں، ہفتوں اور مہینوں کے حساب سے بسر ہوتا ہے۔ اس سفر سے معاشرتی علوم، ٹیکنالوجی اور علم سیاسیات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اور نسلوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی ترتیب پاتا ہے۔ اس سفر کے دوران دن طلوع ہوتے ہیں، دن ڈوبتے ہیں، نقش ابھرتے ہیں، نقش مٹتے ہیں، بچے پیدا ہوتے ہیں اور بوڑھے ہوتے ہیں اور زندگی اپنے اثاثے کو موت کے سپرد کرتی چلی جاتی ہے۔ اور چونکہ نزولی سفر کے ہر موڑ پر نیستی برابر موجود رہتی ہے اور ہست اس سفر کے دوران برابر روز بروز سے کمزور تر ہوتا ہے، اس لئے نزولی سفر لوگوں کو بے چین رکھتا ہے۔ قومی قیادتوں کو بے چین رکھتا ہے، اور قوموں کو بے چین رکھتا ہے۔ نزولی سفر کی حقانیت پر یقین رکھنے والے فلاسفر، بے چینی کو آفاقی اصول قرار دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس بے چینی کے بغیر تاریخ اپنی نقل و حرکت کو قائم نہیں رکھ سکتی۔ اس لئے یہ اصول (بے چینی) انسان کی جبری اور ازلی کیفیت کا لازمی عنصر ہے۔ تاہم جب کبھی اس نزولی سلسلے کے دوران تاریخ ساز مقام ظاہر ہوتے ہیں تو وہاں صرف عروجی کیفیت ہی کی کارفرمائی دکھائی دی ہے۔ خواہ خواب دیکھنے والے مشرق میں ہوں یا مغرب میں ہمیشہ بہتر دنیا کا خواب ہی نزولی سلسلے میں عروجی کیفیت کو نمایاں کرتا رہا ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ مشین خواب نہیں دیکھ سکتی۔ سوشل سائنس خواب کا استعمال نہیں کر سکتی۔ اور نہ ریورتاژ ہی اس نعمت سے آشنا ہے۔ صرف شاعر ہی خواب دیکھ سکتی ہے۔ شاعر کشفِ حقیقت کا سائل بن سکتا ہے اور جہاں خواب سی شخص یا کلچر کی زندگی میں داخل ہوتے ہیں وہاں عروجی کیفیت اور فرد کے عروجی سفر کی ابتدا ہوتی ہے۔

ہم سب اپنے اپنے خوابوں سے بخوبی آشنا ہیں۔ لیکن وہ خواب جو الف بے اور جیم دیکھتے ہیں اُن خوابوں سے
تلف ہوتے ہیں۔ جو ادب کے اہلِ تفکر دیکھتے ہیں۔ ادب کے ذریعے قوموں کی تاریخ خواب دیکھتی ہے اور یہ
یاب عام آدمی کے خواب سے مختلف ہوتا ہے اور اس کا مختلف ہونا ہر اعتبار سے ضروری ہے۔ خواہ بہتر دنیا کا خواب
ماری زندگی میں پورا ہو یا کبھی پورا نہ ہو۔ ادب کے لئے اس خواب کی گفتگو لازمی ہے۔ اور یہ گفتگو صرف شاعری
یعنی ہے۔ کیونکہ شاعری (اور شاعری سے نظم گوئی یا غزل گوئی مراد نہیں ہے) جس تخلیقی سرشت کے ماتحت کام
تی ہے وہ اشیاء کے باطن میں اُترتی ہے اور اس مسلسل ظہور سے آشنا ہوتی ہے جو حیاتِ ابدی کی خبر دیتا ہے، جہاں
سان کبھی نہیں مرتا اور جہاں صرف زندگی ہی نظر آتی ہے۔

زمین پر انسان کو بچانے کی صورت صرف مستقبل ہے۔ ماضی اور زمانۂ حال محض مستقبل کے لئے تیاری کے ایام کی کئی منزلیں
یا۔ ہمارے ادب نے انسان کے بچانے کی فکری ذمہ داری کو شاید اس لئے پورا نہیں کیا کہ ہمارے لکھنے والے عصرِ حاضر کے
سفۂ عکاسی کے محتاج ہیں۔ غالباً اسی لئے لکھنے والوں کیلئے عصرِ حاضر سے رہائی لازمی ہے۔ اور اگر اس رہائی کے بعد صرف ماضی
ہی دکھائی دے تو ایسا رویہ انسان کی بہتری کیلئے فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس ضمن میں بعض اہلِ فکر کا کہنا ہے کہ ادب
کا کام معاشرے کو اور دنیا کو بدلنے کا ہے۔ مگر بدلے ہوئے انسانوں کے بغیر نہ تو معاشرہ بدل سکتا ہے اور نہ دنیا ہی بدل سکتی
ہے۔ ادب میں اب تک جتنی بھی تحریکیں اُٹھی ہیں انہوں نے فکری عقائد کے ذریعے انسان کو بدلنے اور اس طرح دنیا
دبدلنے کی روایت قائم کی ہے۔ مگر فکری عقائد کے ذریعے صرف ایک قسم کا انسان ظاہر ہوا ہے اور تہذیب کے
ختلف مدارج پر ایسے تجربوں سے خاطر خواہ نتائج بھی پیدا نہیں ہوئے۔ تاہم جس انسان کا تذکرہ ہو رہا ہے اس
کے بچنے کی صورت تشویش پیدا کرتی ہے۔ اور ایسے انسان سے معاشرے اور دنیا کے بدلنے کا کام بھی ممکن نہیں
ہو سکتا۔ شاعری کے بغیر اس انسان کو نہ تو بچایا جا سکتا ہے اور نہ ایسے انسان کی تلاش ہی کی جا سکتی ہے۔

انسان کو اس کی ابتلا سے بچانے کی ذمہ داری شاعری پر عائد ہوتی ہے اور یہ ایک ایسا مرحلہ ہے جہاں یہ کہنا
مناسب ہے کہ انسان کو ادب ہی اس کی ابتلا سے بچا سکتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے؟ اور اس کیلئے خاطر خواہ
طریقِ کار کون سا ہے؟ یہ سوال ہر لکھنے والے کے اپنے سوال ہیں۔ اور اس سوال کے تابع ہیں کہ لکھنے والا کہاں تک شعری
سرشت کے قریب ہے اور کہاں تک اُس کیلئے مستقبل ایک سچائی ہے۔ مستقبل کے ساتھ مکالمہ اور ہمکلامی صرف شاعری
ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ اگر لیلیٰ ماضی میں ظاہر ہو سکتی ہے اور پھر عصرِ حاضر میں ہمسفر بن سکتی ہے (خواہ اس لیلیٰ کے محل میں
کوئی بھی دنیا موجود ہو۔) تو لیلیٰ مستقبل کی منزلوں پر بھی ظاہر ہو سکتی ہے۔ اور قیس اس لیلیٰ کے لئے خواب در خواب سفر
بھی کر سکتا ہے۔ اور زندگی سے کبھی دستبردار بھی نہیں ہو سکتا۔ جب تک مستقبل لیلیٰ کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ انسان کے
بچنے کی اُمید واضح نہیں ہو سکتی، اور نہ ادب ہی اپنے گھر کا محرم بن سکتا ہے.....!

جمیل الدین عالی

اُردو غزل

——— چند مسائل

(یہ پُر مغز مقالہ ستمبر ۸۲ء میں ہونے والی پہلی کینیڈین اردو کانفرنس ٹورنٹو کینیڈا میں پڑھا گیا۔ (ادارہ)

جنابِ صدر، معزز خواتین و حضرات۔

میں منتظمین کا نہایت ممنون ہوں کہ مجھے اس یادگار اجتماع میں یہ مقالہ پڑھنے کی دعوت دی۔ یہ واقعی منتظمین کی بڑی ہمت ہے کہ انہوں نے اس پیمانے پر ایسی کانفرنس منعقد کی جس میں اتنی اہم شخصیات شریک ہیں۔ پچھلے سال مجھے کینیڈا کے چند شہروں میں مشاعرے پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ میں نے اس وقت بھی محسوس کیا تھا اور اب بھی دیکھ رہا ہوں کہ ایک طرف تو اردو جاننے والے کینیڈین شہریوں نے اپنی جڑوں کے ساتھ اپنے کمٹمنٹ کو جان کی طرح عزیز رکھا ہے اور دوسری طرف کینیڈا کی حکومت دنیا بھر کی ان چند حکومتوں میں شامل ہے جو کثیر الثقافتی معاشرے کے لئے اپنے دعوؤں کی تائید میں ٹھوس امداد دیتی ہیں۔

مجھے اعتراف بھی کرنا ہے کہ کینیڈا کے اس معزز اور کثیر الجہات ثقافتی اجتماع کے سامنے میں اپنے آپ کو اردو غزل پر کوئی مبسوط مقالہ پڑھنے کا اہل نہیں سمجھتا خصوصاً جبکہ وہ مقالہ بھی انگریزی میں ہو کیونکہ نہ تو میں مروجہ مفہوم کے مطابق کوئی باقاعدہ نقاد ہوں نہ اردو کے سوا کسی اور زبان کو اپنے ادبی تجربات و مسائل کے اظہار کیلئے استعمال کرتا ہوں۔ تاہم میں نے اس سیمینار میں اردو غزل پر مقالہ پڑھنے کی دعوت قبول کی ہے تو اس کی وجہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ میں کم و بیش پچھلی تین دہائیوں سے اردو غزل لکھنے والے جیسے تیسے تخلیقی فنکاروں میں شامل اور ان سے متعلق رہا ہوں۔ یعنی تیسری دہائی کے اساتذہ دہلی سے لے کر آج کے نوعمر غزل گویوں تک۔ اس واسطے سے اردو غزل اور اس کے ارتقا کے مختلف مدارج و منازل سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہوں۔ بس یہی بات میرے لئے اس معزز اجتماع کے سامنے اپنا مقالہ پیش کرنے کا جواز فراہم کرتی ہے جس میں مجھے کئی معاصرین ایسے بھی نظر آ رہے ہیں جو

نہ صرف یہ کہ بلا مبالغہ مجھ سے کہیں زیادہ قابل ہیں بلکہ اس موضوع پر مجھ سے کئی گنا بہتر معلومات رکھتے ہیں۔

اور ابتدا ہی میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ میں نے اس مقالے کے لئے اپنے تخلیقی اظہار کی زبان یعنی اردو کو وسیلہ اظہار بنایا ہے چنانچہ اصلی مقالہ اردو زبان میں ہے جو میری تحریر کی زبان ہے یہ اس مقالہ کا انگریزی ترجمہ ہے۔ دونوں زبانوں کے مزاجی اختلافات کے سبب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ انگریزی ترجمہ اردو اصل کا بالکل صحیح متبادل ہے معاف کیجئے گا فٹز جیرالڈ صاحب وہ نہیں کہہ سکے جو عمر خیام کہہ گئے تھے میں تو ایک اچھا انگریزی مترجم بھی نہیں ہوں۔ مقالہ کا اردو متن اور اس کا انگریزی ترجمہ دونوں سیمینار کے شرکاء میں تقسیم کئے جا رہے ہیں۔

میرا موضوع اردو غزل مقرر ہوا تھا اور یہ ایک بہت بڑا موضوع ہے کئی کتابوں کا مستحق، لیکن میری خوش قسمتی سے جناب صدر انجمن اے پی کے قریشی نے میری مشکل آسان کر دی اور دعوت نامہ کے ساتھ ایک واقعی زریں مشورہ بھیجا کہ میں خصوصیت کے ساتھ غزل کے ان پہلوؤں پر بات کروں جو عام طور پر اردو ادب میں بحث کا موضوع رہے ہیں۔ مثلاً اردو شاعری میں غزل کی اہمیت بطور فن شاعری کے ایک اسلوب کے، یا یہ مسئلہ کہ غزل کا فارم ہمارے جمالیاتی ذوق کی تسکین کیلئے کہاں تک مناسب ہے، یا یہ بحث کہ اردو غزل کے تاریخی ارتقاء میں معاشرتی اور اخلاقی قدروں کا کیا حصہ ہے یا یہ مسئلہ کہ غزل اپنی مخصوص ہیئت یا فارم کے ساتھ ہمارے بدلتے ہوئے رجحانات اور مذاق کا کہاں تک ساتھ دے سکتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ غزل کے حوالے سے بات کرنے کے لئے ان میں سے ہر مسئلہ بجائے خود بہت دلچسپ، اہم اور تفصیلی مطالعہ کا متقاضی ہے، لیکن اس مختصر سے مضمون میں ان تمام مسائل کا احاطہ کرنا شاید ممکن نہیں اور جیسا کہ آپ بھی جانتے ہیں اردو دنیا میں ان مسائل پر اتنا کچھ سوچا اور لکھا گیا ہے کہ اس مختصر وقت میں ان میں سے کسی ایک پہلو کو سمیٹنا بھی شاید مشکل ہے بہرحال تعمیل ارشاد کے طور پر چونکہ مجھے کچھ نہ کچھ بات کسی نہ کسی پہلو پر تو کرنی ہی ہے اس لیے میں نے اپنی آسانی کے پیش نظر ان میں سے ایک مسئلہ کا انتخاب کیا ہے۔ یعنی یہ کہ ــــ کیا غزل اپنی ہیئت یا فارم کے ساتھ ہمارے بدلتے ہوئے رجحانات اور مذاق کا ساتھ دے سکتی ہے؟ لیکن یہ یقین پھر بھی نہیں ہے کہ میں اس موضوع پر کوئی نئی یا کام کی بات بھی کہہ سکوں گا یا نہیں۔ بہرحال یہ کوشش ضرور کروں گا کہ اس مسئلہ کو مختلف پہلوؤں سے دیکھ کر چند باتیں کر سکوں لیکن اس سوال پر براہ راست کچھ کہنے سے پہلے مختصراً چند باتیں غزل کے بارے میں عرض کروں گا۔

تہذیبی معنویت :-

غزل کے بارے میں کم از کم ایک بات تو ظاہر ہی ہے اور وہ یہ کہ یہ اردو شاعری کی سب سے جاندار اور وقیع صنف سخن ہے جو زمانے کے ہر سرد و گرم کو جھیلتی ہوئی اپنی تمام لطافتوں، نزاکتوں، رمزیت، اشاریت اور ایمائیت کے ساتھ آج تک اپنی انفرادیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس صنف سخن کا ضمیر عرب و عجم اور ہند کی بہترین شعری روایت کے امتزاج سے اٹھا ہے بلکہ یہ محض ایک صنف سخن ہی نہیں ہمارے تہذیبی مزاج کی ترجمان اور ہماری تہذیب کی

ایک علامت بھی ہے اس کا روایتی پس منظر ایک خاص نظامِ خیال سے وابستہ ہے لہٰذا ہم اسے اس کے مخصوص نظامِ خیال اور اس کی تہذیبی بنیادوں سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے چنانچہ خیال کے بارے میں کوئی بھی گفتگو کرتے ہوئے اس کی تہذیبی بنیاد اور اس نظامِ خیال کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے جو اس صنفِ سخن کے لئے پس منظر کا کام دیتا ہے۔

علاوہ ازیں غزل کا ایک خاص شعری مزاج بھی ہے جس کی فضا جذبات و احساسات کے مختلف النوع رخوں اور رنگوں سے تعمیر ہوئی ہے اور جس کے مرکز میں انسان کا بنیادی جذبۂ عشق، ایک خاص نظامِ اقدار سے وابستہ ہو کر غزل کی کائنات کا مرکزی استعارہ بنتا ہے۔ اس کائنات کا مرکزی استعارہ بن کر عشق کی معنویت کیا سے کیا ہو جاتی ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فراقؔ صاحب کہتے ہیں کہ اردو غزل کا عاشق اپنے محبوب کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتا اپنی تہذیب کی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اسے اپنے ہاتھوں سے نہیں بلکہ اپنے کلچر کے ہاتھوں سے چھوتا ہے اور بقول رشید احمد صدیقی ہماری تہذیب غزل میں، اور غزل ہماری تہذیب کے سانچے میں ڈھلی ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے رنگ و آہنگ، سمت و رفتار اور وزن و وقار ملا ہے ۔ اب چونکہ غزل اپنے بنیادی مزاج اور ذہنی فضا کے اعتبار سے ایک تہذیبی ذریعہ اظہار ہے۔ اس لئے اس کا اسلوب اور پیرایۂ بیان یہ ہے کہ یہ اکثر و بیشتر رمز و ایما کا سہارا لیکر علامتوں اشاروں اور کنایوں میں بات کرتی ہے۔ روزمرہ زندگی کے معاملات و مسائل ہوں یا انسانی تعلقات و معاملات کی حقیقت ہو یا حسن و عشق کی واردات ہو یا مشاہدہ حق کا معاملہ، غزل کا بنیادی مزاج یہ ہے کہ وہ ہر موضوع کو رمز و اشارت کے ساتھ ملا کر انداز میں پیش کرتی ہے اردو غزل کے نگارخانے میں شمع و پروانہ، برق و خرمن، شانہ و کاکل، بادہ و ساغر، شیشہ و سنگ، قفس و آشیاں، گل و بلبل وغیرہ ہزار ہا علامتیں اور استعارے زندگی کی بوقلمونی کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اشیاء کے رشتۂ اضداد و کشش میں ربطِ معنوی کی نشاندہی کرتے ہیں، ان میں سے ہر استعارہ بارہا تخلیقی تجربہ کی بھٹی میں تپا کر سرخ کیا جاتا ہے اور ہر علامت بار بار کاوشِ اظہار کے تیشہ سے تراشی جاتی ہے تب کہیں جا کر اسے روایت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں غزل کا فن تخصیص سے تعمیم کی طرف بڑھنے کا فن بھی ہے لیکن غزل محض تجربہ کی عمومیت ہی کو پیش نظر نہیں رکھتی بلکہ اسے ایک تہذیبی منزلت و معیار بھی عطا کرتی ہے۔ یہ منزلت و معیار کبھی محسوس کو غیر محسوس سے ربط دے کر قائم ہوتا ہے، کبھی استعارہ کی طلسم بندی سے وجود میں آتا ہے، کبھی شاعرانہ صداقت کے حوالے سے ظاہر ہوتا ہے، کبھی قولِ محال کی وساطت سے رونما ہوتا ہے، کبھی علامت کے ذریعے پیدا ہوتا ہے اور کبھی نکتہ سنجی اور معنی آفرینی کے عاملوں سے ظہور میں آتا ہے۔ غرض اسی طرح غزل کا فن اسالیبِ اظہار کے نوبنو رنگوں کے ساتھ ہمارے تہذیبی اور تمدنی مزاج کی آئینہ داری کرتا ہوا ہر عہد اور ہر زمانے کی روح کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ اپنے بنیادی تشکیلی مزاج کے اعتبار سے غزل ایک خاص طرح کے خارجی حدبندیوں کی پابند ہونے کے باوجود اپنے اندر بڑی لچک بھی رکھتی ہے قلی قطب شاہ سے لے کر آج تک غزل کے تدریجی ارتقاء کی روشنی میں اس کے مزاج کا تجزیہ کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ نئے فکری اور سماجی عوامل ہمیشہ اردو غزل

کے خاکے میں رنگ بھرتے رہے ہیں۔ ہر سماجی واقعہ اور ہر سیاسی حادثہ غزل کے مزاج اور اس کے طرزِ اظہار میں تھوڑی بہت تبدیلی پیدا کرتا رہا ہے اور ہر معاشرتی اور سماجی تبدیلی غزل کے اسلوب و ادا سے لے کر اس کے موضوع و مواد تک ہر شے پر اثر انداز ہوتی رہی ہے اور گو کہ ایک روایتی صنفِ سخن ہونے کے اعتبار سے غزل کچھ خاص حدود و قیود کی پابند ہے لیکن یہ حدود و قیود اس کی ترقی و ارتقا کی راہ میں کبھی بھی حائل نہ ہو سکیں اور روایت سے وابستگی کے باوجود یہ صنف ہر دور میں اپنے شعری مواد کو نئے عناصر سے ہم آہنگ اور مربوط کرتی چلی آئی ہے اس کے باوجود اپنی ترقی و ارتقا کی مختلف منزلوں میں اسے طرح طرح کی آزمائشوں اور امتحانوں سے بھی گزرنا پڑا ہے۔ مولانا حالی کی برہمی اور بیزاری سے لے کر ترقی پسند تنقید کی مخالفت تک اسے کیا کچھ برداشت نہیں کرنا پڑا ہے کبھی اسے نیم وحشی کہا گیا کبھی گردن زدنی ٹھہرایا گیا کبھی تہی دامنی اور تنگ دامانی کے طعنے دیئے گئے اور کبھی پریشان خیالی کی تہمت لگائی گئی لیکن اردو غزل ہر کڑی سے کڑی آزمائش سے سرخرو ہو کر نکلی۔ نظم کے عروج کا زمانہ آیا اور گزر گیا لیکن غزل کو اس کے منصب سے معزول نہ کر سکا۔ غزل مختلف اوقات میں اپنی گھٹتی بڑھتی مقبولیت کے باوجود آج بھی اردو ادب کی آبرو سمجھی جاتی ہے۔

بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ہیئت کا مسئلہ:۔

بدلتے وقت کے ہر موڑ پر غزل کے سلسلے میں یہ سوال ضرور اٹھتا ہے کہ آیا یہ صنف اپنے مزاج کی تمام تر لطافتوں اور نزاکتوں اور اپنی روایتی حدود و قیود کے ساتھ نئی زندگی کے پیچیدہ مسائل کی ترجمانی کا حق ادا کر سکے گی یا نہیں، بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ زمانے کے نئے تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکے گی یا نہیں۔ ایسا ایک سوال آج بھی ہمارے پیش نظر ہے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ ماضی میں تو یہ سوال ہمیشہ غزل کے موضوع و مواد یا اس کے تخلیقی طریقہ کے حوالے سے اٹھایا گیا تھا جبکہ آج ہمیں اس سوال پر غزل کی ہیئت کے حوالے سے غور کرنا ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ آیا غزل اپنی مخصوص ہیئت یا فارم کے ساتھ ہمارے بدلتے ہوئے رجحانات اور مذاق کا ساتھ دے سکتی ہے یا نہیں۔ اس سوال کے اندر یہ نقطہ مضمر ہے کہ اگر وقت کے بدلتے ہوئے رجحانات سے ہم آہنگ ہونے میں غزل کا مخصوص عروضی سانچہ یا دوسرے ہیئتی لوازم کسی طور پر حارج ہو تو کیوں نہ انہیں بدلنے پر غور کیا جائے، لیکن جیسا کہ پہلے ہی اس جانب چند اشارے کئے جا چکے ہیں۔ ہماری غزل اپنی ابتدا ہی سے ہر عہد اور ہر زمانے کے تقاضوں سے بخوبی عہدہ برآ ہوتی چلی آئی ہے اس کی ہیئت وقت کے بدلتے ہوئے رجحانات اور تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے میں کبھی حارج نہیں ہوئی پھر یوں بھی غزل کی مخصوص ہیئت اپنی جگہ ایک بہت بنیادی چیز ہے۔ بدلتے وقت کے تقاضے خواہ کچھ سے کچھ ہو جائیں یہ تو بس جیسی ہے ویسی ہی رہے گی۔ اس لئے کہ غزل کے پورے وجودی نظام میں سب سے بنیادی چیز اس کی مخصوص ہیئت ہی ہے لہٰذا غزل کی ہیئت کے سلسلے میں ایسا کوئی بھی سوال اٹھانا غزل کی بنیادی ماہیت کو معرضِ خطر میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ غزل تو دراصل ان اصنافِ سخن میں سے ہے جن کی ہیئت میں تبدیلی یا تجربے کی کوئی گنجائش مشکل ہی سے نکل سکتی ہے۔ غزل میں

آج تک جو بھی تجربے ہوئے ہیں یا ہو سکتے ہیں ان کا تعلق غزل کے موضوعات، اس کی زبان و بیان، اس کے اسلوب و آہنگ اور اس کے لب و لہجہ سے رہا ہے اور رہے گا لیکن غزل کی ہیئت میں کسی قسم کی تبدیلی کے بعد غزل کو غزل کی حیثیت سے برقرار رکھنا مشکل ہے اس لئے کہ غزل اس وقت تک غزل کہلانے کی مستحق ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ وہ ایک مخصوص ہیئت کی حامل نہ ہو۔ غزل کی یہ مخصوص ہیئت بنیادی طور پر تین اجزاء پر مشتمل ہے۔ ایک تو غزل کے ہر شعر کے دونوں مصرعوں کا مقررہ ارکان اور اوزان بحور کا پابند ہونا۔ دوسرے قافیہ کا التزام اور تیسرے مردف غزلوں میں ردیف کی پابندی۔ یہ ہے غزل کی ہیئت اور غزل اپنی اسی ہیئت سے پہچانی جاتی ہے۔ ہم غزل کو اس کے مواد کی بنا پر غزل نہیں کہتے بلکہ غزل کو غزل کا نام اس کی ہیئت کی بنا پر دیتے ہیں۔ مثلاً اقبال کی غزل کا مواد میر کی غزل کے مواد سے بہت مختلف ہے لیکن مواد کے اس اختلاف کے باوجود دونوں میں جو چیز مشترک ہے وہ غزل کی مخصوص ہیئت ہے ورنہ مواد تو غزل کے ہر شاعر کا دوسرے شاعر کے مواد سے مختلف ہو سکتا ہے۔ پھر یوں بھی غزل کے شاعر کا مواد اس کی داخلیت میں موجود ہوتا ہے اور یہ مواد ہیئت کے بغیر ظاہر نہیں ہو سکتا۔ ہر شاعر اس مواد کو غزل میں ظاہر کرنے کے لئے ہیئت کا محتاج ہے جو اس کے داخلی تجربہ سے الگ معروضی طور پر وجود رکھتی ہے اس ہیئت کے بغیر اس کا داخلی تجربہ غزل کی صورت میں خارجی شکل اختیار نہیں کر سکتا یا یوں کہیئے کہ اس کا داخلی تجربہ، غزل کی ہیئت ہی کے ذریعے وہ شکل اختیار کرتا ہے جسے ہم غزل کہتے ہیں۔ شاعر کا داخلی تجربہ (یا اس کا مواد) بجائے خود غزل نہیں ہوتا اور نہ اپنی کوئی متعین شکل رکھتا ہے بلکہ تخلیقی عمل کے ذریعے ہیئت سے مل کر غزل کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غزل کی ماہیت یعنی وہ شے جو غزل کو غزل بناتی ہے، غزل کی ہیئت ہے اس کا مواد نہیں۔ لہٰذا بدلتے ہوئے رجحانات یا مذاق کے نام پر غزل کی ہیئت کو تبدیل کرنا دراصل غزل کی ماہیت کو تبدیل کرنے کے مترادف ہے۔

غزل کی ہیئت میں تبدیلی کا سوال پوری سنجیدگی اور تواتر کے ساتھ پہلے کبھی نہیں اٹھایا گیا تھا اور اس لئے غزل کی ہیئت صدیوں سے ایک غیر متبدل اور غیر متغیر بنیادی سانچہ کی حیثیت سے محفوظ چلی آ رہی ہے اور غزل کی ماہیت ہر قسم کی تبدیلی اور تجربہ سے بالاتر سمجھی جاتی رہی ہے لیکن اب آثار کچھ ایسے نظر آتے ہیں کہ شاید یہ بھی مستقبل میں ہماری تجربہ پسندی کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکے گی۔ اس لئے کہ غزل میں ہیئت کے نئے تجربوں کا آغاز حال ہی میں ہو چکا ہے اور بعض شعراء نے اس قسم کے تجربے شروع کر دیئے ہیں جو غزل کے متعین عروضی سانچے سے انحراف پر مبنی ہیں حالانکہ اس بات کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ غزل میں ہیئت کی اس تبدیلی کو مستحسن سمجھ کر قبول کر لیا جائے گا۔ لیکن یہ ایک واقعہ ضرور ہے کہ بعض شعراء ایسی غزلیں کہنے لگے ہیں جو آزاد نظم کی طرح چھوٹے چھوٹے مصرعوں پر مشتمل ہیں اور وہ غزلیں بعض رسائل میں شائع بھی ہونے لگی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دور کی تجربہ پسندی نے غزل کی ہیئت میں بھی تبدیلی کے رجحان کا آغاز کر دیا ہے اور ہندوستان میں چھوٹے بڑے مصرعوں کی غزلوں پر

مشتمل ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے اب یہ بات تو اپنی جگہ درست ہے کہ غزل کی ہیئت میں اس تبدیلی کو ابھی ایک عام رجحان کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی۔ تاہم اسے ایک جدید ترین رجحان کا آغاز ضرور سمجھا جا سکتا ہے اور جو منطق اس رجحان کے پیچھے کام کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ جب ڈیڑھ مصرعوں میں بات مکمل ہو سکتی ہے تو پورے دو مصرعے کہنے کی کیا ضرورت ہے لیکن اس منطق کو اور آگے بڑھایا جائے تو بات محض ڈیڑھ مصرعے کی غزل ہی پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس منطق کی رو سے تو صرف ایک مصرعے کی غزل کا جواز بھی پیدا ہو سکتا ہے لیکن اس سلسلے میں ایک بنیادی بات یہ ہے کہ خواہ ڈیڑھ مصرعہ کی غزل ہو یا ایک مصرعے کی۔ اگر غزل کی بنیادی ماہیت دو مصرعوں پر مشتمل عروضی سانچے کی قید سے متعین ہوتی ہے تو ایک یا ڈیڑھ مصرعہ کی بنیاد پر لکھی جانے والی چیز پر غزل کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسی کسی بھی تخلیق کو غزل کا نام دینا غزل کی ماہیت سے بے خبری کی دلیل ہے۔

لیکن اس مسئلے کو ایک اور زاویئے سے دیکھیں تو کہا جا سکتا ہے کہ خود غالب جیسے شاعر کا "ظرفِ تنگنائے غزل" سے شاکی ہونا غزل کی ہیئت میں خامی یا خرابی کی دلیل ہے اور غزل کا یہی نقص بدلتے وقت کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے میں حارج ہو سکتا ہے علاوہ ازیں کلیم الدین احمد نے بھی غزل میں ربط و تسلسل کے نہ ہونے پر اعتراض کرتے ہوئے اسے نیم وحشی صنفِ سخن قرار دیا ہے اور یہ بات بھی ہیئت ہی کے نقص کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کے جواب میں غزل کے انتشار اور بے ربطی کو دور کرنے کے لیے مسلسل غزل کہنے کا رجحان پیدا ہوا جو بجائے خود اعتراض کی صحت کو درست تسلیم کر لینے کا نتیجہ تھا۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے لیکن اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اعتراضات صرف غزل کی ہیئت ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ ہیئت اور تخلیقی طریقہ کار سے لے کر مواد تک غزل کے معترضین نے اعتراض کا کوئی بھی گوشہ باقی نہیں چھوڑا، اور اعتراضات بھی ایسے جن کی بناء پر عظمت اللہ خان صاحب تو غزل کی گردن ہی بے تکلف مار دینا چاہتے تھے پھر اگر مسلسل غزل کا رجحان کلیم الدین احمد کے اعتراض کو درست ثابت کرتا ہے تو دوسرے اعتراضات کا حال بھی کچھ ایسا مختلف نہیں۔ مثلاً مولانا حالی کی غزل سے برہمی اور بیزاری اس کی ماہیت میں کسی خرابی کی بناء پر نہیں بلکہ عشق و عاشقی کے مضامین کی بناء پر تھی اس کے جواب میں عشقیہ مضامین کی جگہ اخلاقی اور سیاسی مضامین باندھے جانے لگے۔ شمع و پروانہ اور گل و بلبل کی علامتوں پر اعتراض ہوا تو ان کی جگہ نئی علامتیں وضع ہوئیں یا انہی علامتوں میں نئے معنی پیدا کر لئے گئے۔ ردیف اور قافیہ کی قیود جانِ سخن پر گراں تھیں تو اس گرانی کو کم کرنے کے لئے غیر مردّف غزلوں کا رواج ہوا۔ یہ کوششیں اپنی جگہ مستحسن ہوں یا غیر مستحسن اس بات سے قطع نظر دراصل سب کے سب اعتراضات کو درست تسلیم کرنے کا نتیجہ تھیں۔ حالانکہ اگر یہ سب اعتراضات بنیادی طور پر درست ہیں تو پھر غزل کو بحیثیت غزل کے باقی رکھنے کا کوئی جواز مشکل ہی سے نکل سکتا ہے اور عظمت اللہ خان کا یہ موقف درست معلوم ہونے لگتا ہے کہ غزل کی گردن بے تکلف مار دینی چاہیئے۔ علاوہ ازیں ایک بات یہ بھی سمجھ میں نہیں آتی اگر واقعی غزل میں اتنی خرابیاں اور اتنی خامیاں موجود تھیں تو اردو اور فارسی کی دونوں زبانوں میں غزل کہنا تک کیوں عروس سخن

بنیادی ہی۔ کلیم الدین احمد صاحب تو اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ دراصل مغربی شعراء کے مقابلے میں ہمارے شاعروں میں قوت تعمیر یا قوت ایجاد بڑی کم رہی ہے اور اسی لئے وہ ہمیشہ نظم کے بجائے غزل کی طرف مائل رہے لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اگر حافظ، رومی، میر، غالب اور اقبال جیسے شعراء میں قوتِ تعمیر کی کمی ہے اور مثال کے طور پر کلیم الدین احمد صاحب میں نہیں ہے تو کیا یہ کوئی ایسی چیز ہے جس کے نہ ہونے پر افسوس کیا جائے۔ قوت تعمیر قوت ایجاد، تسلسل کلام، تنظیم فکر۔ یہ سب الفاظ خواہ کتنے ہی بڑے ہوں لیکن جب ان کی مدد سے غزل کی نفی کی جاتی ہے تو بات سلجھنے کی بجائے کچھ الجھ سی جاتی ہے ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے۔

تہذیب اور ہیئت کا تعلق

اس سلسلے کا ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ اصناف سخن کا اپنی تہذیب سے کیا تعلق ہوتا ہے اور فنی اور جمالیاتی اصول کہاں سے برآمد ہوتے ہیں یہ ایک ایسا بنیادی سوال ہے کہ اگر ہمیں اس کا صحیح جواب مل سکے تو شاید پھر ہم یہ بھی جان سکیں گے کہ ہم جن باتوں کو غزل میں مستحسن سمجھتے ہیں وہ کیوں مستحسن ہیں اور جن باتوں کو غزل کے معترضین مستحسن سمجھتے ہیں وہ غزل کے معاملے میں کیوں ہمارے کام نہیں آتیں۔ جہاں تک کلیم الدین احمد صاحب کے اعتراض کا تعلق ہے تو اس کے جواب میں غزل کے حامیوں کی طرف سے جو کچھ کہا گیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہر تہذیب کے جداگانہ تنقیدی اصول اور معیار ہوتے ہیں یا غزل ایک مشرقی صنف سخن ہے۔ اسے مغربی اصول تنقید سے نہیں جانچنا چاہیئے وغیرہ وغیرہ۔ یہ جواب اپنی جگہ درست ہو سکتا ہے لیکن اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ اگر ہر تہذیب کے جداگانہ تنقیدی معیار ہوتے ہیں تو ہمارا تنقیدی معیار کیا ہے اور غزل اس پر کیسے پوری اترتی ہے۔ رہی یہ بات کہ غزل ایک مشرقی صنف سخن ہے لہٰذا اسے مغربی اصول تنقید پر نہیں جانچنا چاہیئے تو سوال یہ ہے کہ جب ہم زندگی کے ہر شعبے میں مغرب کو اپنا رہے ہیں تو صرف غزل کے معاملے میں مشرق پر کیسے قائم رہ سکتے ہیں۔ لیکن غزل کے دفاع کرنے والوں کی طرف سے اس بات کا کوئی واضح اور تسلی بخش جواب نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ فراقؔ صاحب کی طرف سے بھی نہیں۔ یہ درست ہے کہ کلیم الدین احمد صاحب نے جن اصولوں کو اپنی تنقید میں اپنایا وہ کلاسیکی مغربی تنقید کے اصول ہیں اور انہی اصولوں کی مدد سے اردو غزل کو پرکھ کر دیکھا ہے ان کے پیچھے ایک پورا تنقیدی نظام اور ایک مکمل جمالیاتی نظریہ موجود ہے۔ اس جمالیاتی نظریئے کی اساس جس تصور حقیقت پر ہے اس کا اصل اصول "وحدت فی الکثرت" کا تصور ہے۔ اس تصور سے فن کی دنیا میں توازن تناسب اور ہم آہنگی کا نظریہ برآمد ہوتا ہے اور توازن، تناسب اور ہم آہنگی کے تصورات اجزا کے ایسے تصور سے قائم ہوتے ہیں جن میں کل اور جزو کا امتزاج ہوتا ہے۔ ارسطو نے کل کی تعریف یہی کی ہے کہ یہ تین اجزا پر مشتمل ہے ابتدا انتہا اور درمیان اور یہ تینوں اجزا آپس میں اتنے مربوط ہیں کہ ان میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں کی جا سکتی چنانچہ ایک خوبصورت کی خوبی یہی ہے کہ وہ ایک وحدت یا کل ہو۔ اس کے اجزا باہم مربوط ہیں، ان میں توازن، تناسب اور ہم آہنگی

پائی جائے۔ اس کی ایک ابتدا، ایک انتہا اور ایک درمیان ہو اور یہ سب اجزا اتنے ناگزیر ہوں کہ ان میں کوئی کمی بیشی نہ کی جا سکے۔ کلاسیکی مغربی تنقید کے اس جامع فارمولے سے کلیم الدین احمد صاحب کے تنقیدی اصول اور معیار پیدا ہوئے ہیں وہ ان اصولوں کی روشنی میں غزل کو دیکھتے ہیں تو نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ:۔

غزل میں ربط، اتفاق اور تکمیل کی کمی ہے۔

غزل میں قصیدے اور قطعہ کی بہ نسبت تسلسل کی کمی ہے۔

غزل کی بے ربطی مسلّم ہے۔

غزل میں وحدتِ تخیّل کا فقدان ہے۔

اور انہی باتوں سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ غزل ایک نیم وحشی صنفِ سخن ہے لیکن ان خیالات کو آسانی سے مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ کلیم الدین احمد صاحب نے جن اصولوں کی میزان پر اردو شاعری کو تولا ہے وہ روایتی لحاظ سے تمام متمدن دنیا میں تسلیم شدہ تھے۔ اصل کیا ہے یہ شاید کوئی نہ بتا سکے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اردو غزل ان اصولوں کی میزان پر پوری نہیں اترتی اور اس میں وہ تمام خامیاں واقعی ملتی ہیں جو کلیم الدین احمد صاحب نے گنوائی ہیں پھر بھی سوال یہ اٹھتا ہے کہ ایسی "نیم وحشی" اور ربط و تسلسل سے عاری صنفِ سخن کو باقی رکھنے کا جواز کیا ہے۔ آخر کیوں نہ اس کی گردن بے تکلف مار دی جائے لیکن یہ مسئلہ ذاتی پسند اور ناپسند سے اوپر اٹھ کر دیکھنے کا ہے اس لئے کہ تہذیبی تصورات کا جواب ذاتی پسند و ناپسند سے نہیں دیا جا سکتا۔ غزل ہمیں لاکھ عزیز سہی مگر وہ اصول جو مغربی کلاسیکی تہذیب کی دین ہیں ان کی اہمیت اور قدر و قیمت بھی مسلّم ہے اور اسی طرح غزل بھی عجمی اسلامی تہذیب کی ایک بہت بڑی دین ہے۔ لفظ غزل کے معنی "حرف با زنان گفتن" نہیں ہے جیسا کہ بعض پرانے فارسی اردو لغت نویس لکھتے ہیں۔ غزل عربی لفظ غزال سے ہے جس کے معنی ہرن ہیں عالم عرب بلکہ دنیا بھر میں کہیں بھی چاندراتوں میں ہرن کی سسکاریاں ہزار معنی روایت بن سکتی ہیں لفظ غزل کی معنویت میں زندگی کی بے شمار لطافتیں اور درد شامل ہیں۔ فارسی اور سارا اردو شاعری کے ذکر سے صرف اور صرف غزل ہی ہمارے ذہن میں آتی ہے تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ عجمی اسلامی تہذیب ہی میں کوئی خرابی کی صورت مضمر ہے بالفاظ دیگر کیا عجمی اسلامی تہذیب کی جمالیات میں "وحدت فی الکثرت" کا اصول کارفرما نہیں، یا اس میں اس اصول کے علاوہ بھی کوئی اور اصول کام کر رہا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ "وحدت فی الکثرت" کا تصور صرف کلاسیکی مغربی تہذیب ہی کا نہیں دنیا کی دوسری بڑی تہذیبوں کا تصور بھی یہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ مختلف تہذیبوں میں حقیقت پر نظر ڈالنے کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک طریقہ ہے کثرت سے وحدت کی طرف آنے کا۔ یہ صعودی انداز نظر ہے جو کلاسیکی مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب دونوں میں مشترک ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا طریقہ نزولی انداز نظر بھی ہے یعنی وحدت سے کثرت کی طرف آنا۔ عجمی اسلامی

تہذیب کی انفرادیت یہ تھی کہ اس نے اپنی جمالیات میں نزولی انداز نظر کے لئے بھی جگہ نکالی ہے اور اردو غزل کی پیدائش اس تہذیب کی اسی انفرادیت کا نتیجہ ہے۔ اسے ہندو فلسفہ و تصوف نے مزید تقویت بخشی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ یت سے "سچے" ہندوؤں نے غزل کو نہایت گراں قدر سطح پر پہنچایا۔ چنانچہ غزل میں "وحدت فی الکثرت" کی بجائے "کثرت فی الوحدت" کا تصور کام کر رہا ہے۔ ایک نظر کثرت میں وحدت کو دیکھتی ہے اور دوسری نظر وحدت میں کثرت کو۔ غزل اسی دوسری نظر کی ترجمانی کرتی ہے اور ان معنوں میں ایک عظیم تہذیب کا کارنامہ ہے کہ حقیقت پر نظر ڈالنے کا یہ طریقہ دوسری تہذیبوں کے فنی اور جمالیاتی اصولوں میں کارفرما نہیں ہوا۔

عجمی اسلامی تہذیب کے اس مرکزی اصول کو سمجھ لینے کے بعد اب غزل پر نظر ڈالئے۔ غزل میں وحدت کی نمائندگی تو غزل کے وزن، ردیف کی یکسانیت اور قافیوں کی ہم آہنگی سے ہوتی ہے لیکن چونکہ غزل کا اصل زور وحدت کی بجائے کثرت پر ہے اس لئے غزل کا مروجہ اصول یہ رہا ہے کہ اس کے ہر شعر میں ایک مختلف مضمون باندھا جائے اور مضمون واحد کے تسلسل کو اس کا عیب سمجھا جائے اسی اصول کی وجہ سے تکرارِ قافیہ بھی غزل میں ایک عیب سمجھا گیا۔ کیونکہ اس سے کثرت کا نقشہ مجروح ہوتا ہے۔ پھر اگر ایک ہی قافیہ مطلع میں آجائے تو یہ بھی عیب ہے کیونکہ اصول کثرت کے خلاف ہے اور کثرت مضامین غزل کا عیب نہیں حسن ہے چنانچہ غزل میں حقیقت واحد کی بوقلمونی اس طرح دکھائی جاتی ہے کہ تجلی میں تکرار نہ ہو۔ فراقؔ صاحب جب یہ کہتے ہیں کہ پوری کائنات خود ایک غزل ہے تو اس کا مفہوم بھی یہی نکلتا ہے کہ جس طرح کائنات میں حقیقت واحدہ مظاہر کثیرہ میں جلوہ گر ہے اسی طرح غزل بھی ایک بوقلموں محبوب کا جلوۂ رنگا رنگ ہے جو اپنی یکتائی کے باوجود عالم کثرت میں ہزار در ہزار تجلیات کے ساتھ ظاہر ہوا ہے۔ اس وضاحت کے بعد دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کی بے ربطی، تسلسل کی کمی، وحدتِ تخیل کی عدم موجودگی یعنی ربط، اتفاق اور تکمیل کا نہ ہونا غزل کا عیب نہیں اس کی خوبی ہے اور یہ صنفِ سخن کسی "نیم وحشی" دماغ کا کارنامہ نہیں، بلکہ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی تہذیب کی شانِ انفرادیت کا مظہر ہے اس وضاحت کے بعد وہ سارے اعتراضات بے وزن اور غیر حقیقی معلوم ہونے لگتے ہیں جو اب تک غزل کے سلسلے میں مختلف گوشوں سے کئے جاتے رہے ہیں۔

ایک نتیجہ:۔

اب خلاصہ اس بحث کا یہ نکلتا ہے کہ غزل کا اصول "کثرت فی الوحدت" ہے اور نظم کا "وحدت فی الکثرت" نظم میں کائنات کی کثرت، وحدت بن جاتی ہے اور غزل میں کائنات کی وحدت کثرت بن جاتی ہے۔ نظم کا اصول اختلاف میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے اور غزل کا اصول ہم آہنگی میں اختلاف کو دیکھنا۔ اور غزل اور نظم دونوں اپنی اپنی جگہ پر اعلیٰ ترین تہذیبوں کے ذرائع اظہار ہیں لہٰذا انہیں ایک دوسرے سے بڑا یا چھوٹا قرار دینا قطعی طور پر خارج از بحث ہے اس گفتگو سے جب یہ بات واضح ہو گئی کہ غزل کا ہماری تہذیب سے کیا تعلق ہے تو ہم ایک مضبوط تہذیبی بنیاد پر کھڑے

ہوتے ہیں اور غزل کی ہیئت، اس کے اسلوب و آہنگ، رموز و علائم اور موضوع و مواد کے بارے میں پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ بات کرسکتے ہیں۔ اب کلیم الدین احمد، عظمت اللہ خان اور غزل کے دوسرے معترضین کے اعتراضات کا کھوکھلاپن ہمیں صاف دکھائی دینے لگتا ہے اور ہم جان لیتے ہیں کہ غزل کسی "نیم وحشی" دماغ کی پیداوار نہیں بلکہ انتہائی تہذیب یافتہ جذبے اور رچے ہوئے شعور کی مترنم لے ہے۔

اب جہاں تک غالب کا تعلق ہے تو اس کا "ظرف تنگنائے غزل" سے مطمئن نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ اسے غزل پہ کوئی ایسا اعتراض تھا جو اس کی ہیئت میں کسی نقص یا خامی پہ مبنی ہو۔ دراصل ایسا سمجھنا بھی ایک طرح کی غلط فہمی کی بنا پر ہے کیونکہ جہاں تک غالب جیسے بڑے اور عظیم شاعر کا تعلق ہے تو ایسے شاعر کے لئے ایک غزل ہی کیا، ہر صنفِ سخن کا ظرف "ظرفِ تنگنائے" ثابت ہوسکتا ہے ایسے شعراء کو اصنافِ سخن کے قالب ہی نہیں، کبھی کبھی تو پوری کی پوری زبان کا ظرف بھی "ظرف تنگنائے" ہی محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس لئے کہ کوئی بھی لفظ ایسے کسی بھی بڑے شاعر کے لئے بقدرِ شوق وسیع نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غزل کی تنگ دامنی کے شکوہ کے باوجود خود غالب جیسے شاعر کی انفرادیت کے جوہر بھی غزل ہی کے آئینۂ صد رنگ میں نکھرے ہیں اور خواہ غزل کے مخصوص عروضی سانچے اور ردیف و قوافی کی قیود نے غزل کے فن کو کتنا ہی مشکل کیوں نہ بنا دیا ہو مگر ولی سے لے کر آج تک غزل کے ہر قابلِ ذکر شاعر کی انفرادیت کے جوہر بھی انہی حدود و قیود اور پابندیوں کے درمیان نکھرتے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں غزل کا فن جہاں شاعر پہ بہت سی پابندیاں عائد کرتا ہے وہاں وہ اسے بہت سی آزادیاں بھی دیتا ہے۔ مثلاً شاعر جو بحر چاہے اختیار کرے جو ردیف و قوافی چاہے باندھے، جو لب و لہجہ چاہے اپنائے، اس پر کوئی پابندی نہیں۔ لیکن اتنی آزادیوں کے ساتھ کچھ پابندی بھی خود بخود عائد ہو جاتی ہے جنہیں نظرانداز کرنے سے غزل کے معیار کو ٹھیس لگتی ہے اور شاعر اور اس کا کلام دونوں پایۂ اعتبار سے گر جاتے ہیں ان پابندیوں سے صرف وہی شاعر عہدہ برآ ہوسکتا ہے جو غزل کے ہر شعر پہ "ستارہ می شکنند آفتاب می سازند" کا عمل بخوبی جانتا ہو۔

غزل کا موجودہ سفر

چنانچہ غزل کی ہیئت سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو بحیثیت مجموعی غزل کے بارے میں یہ بحث کہ غزل اپنے بنیادی مزاج اور اسلوب و آہنگ کے ساتھ ہمارے بدلتے ہوئے رجحانات اور مذاق سے کہاں تک ہم آہنگ ہوسکتی ہے۔ وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہے۔ خاص طور پر تقسیم ہند کے بعد ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ اس پر خاصی بحث ہوچکی ہے اور نظریاتی سطح پر اس سوال کا نقادوں نے جو بھی جواب دیا ہو لیکن تخلیقی سطح پر اس کا سب سے اچھا جواب خود غزل نے ہی فراہم کیا ہے یعنی دورِ حاضر کے دردوکرب کو سماجی، سیاسی اور تمدنی مسائل کو بہتر سے بہتر اور موثر انداز میں پیش کرکے بدلتے وقت سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت کا ثبوت دیا۔ غرض کہ بدلتے ہوئے

رجحانات اور مذاق کا ساتھ دینے یا وقت کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے یا نئے دور کے پیچیدہ مسائل کی ترجمانی کا حق ادا کرنے کے سلسلے میں اگر کبھی کسی کو غزل کی صلاحیتوں کے بارے میں کوئی شک و شبہ رہا ہے تو اس کا سب سے بہتر اور بھرپور جواب خود غزل ہی نے تخلیقی سطح پر فراہم کرکے اسے دور کر دیا ہے۔

چنانچہ آج بھی جب ہم آگے بڑھتی ہوئی زندگی اور پیچ در پیچ مسائل کے حوالے سے اردو غزل کے امکانات کا جائزہ لیتے ہیں اس کے لفظوں کے دروبست، علائم و رموز کے استعمال اور اسلوب و ادا کے آہنگ سے پیچیدہ تر ہوتی ہوئی زندگی کے شعور و ادراک کا سراغ ملتا ہے۔ ماضی کے ہر دور کی طرح آج بھی اردو غزل کے تشکیلی مزاج کا امتحان اس بات میں ہے کہ وہ مشینوں کی گھڑگھڑاہٹ اور طیاروں کی پرواز کے شور میں اپنے بنیادی مزاج اور آہنگ کو اپنی رمزیت، اشاریت اور ایمائیت کو ایک موثر تہذیبی ورثہ کی حیثیت سے برقرار رکھتے ہوئے نئے حالات و حوادث کی عکاسی کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید غزل کے ایک حصہ میں آج واقعیت زدگی کا رجحان ملتا ہے جو غزل کے داخلی آہنگ اور اس کی رمزیت اور ایمائیت کو چھوڑ کر ایک ایسے خارجی اور غیر مزاجی انداز کو اپناتا ہے جس میں غزل کے مزاج کی مخصوص تہ داری اور پہلو داری کی بجائے ایک طرح کا اکہرا پن پایا جاتا ہے اسی طرح اس میں ایک رجحان اینٹی غزل کا بھی در آیا ہے اور بعض تجربات ایسے بھی ہو رہے ہیں جو اگرچہ غزل کی ہیئت میں تو کوئی تبدیلی نہیں لاتے لیکن جو اس کے بنیادی غزلیہ مزاج کو مجروح کرکے اسے ناقابل شناخت اور ناقابل فہم مزو بنا دیتے ہیں بہرحال یہ ایک اچھی بات ہے کہ ایسے تجربات جدید غزل کے غالب رجحان پر اثر انداز نہیں ہوتے لہٰذا اس کے بعض خارجیت زدہ حصوں سے قطع نظر بحیثیت مجموعی جدید غزل آج بھی اپنا وہی مخصوص رمزیاتی اور ایمائی انداز برقرار رکھے ہوئے ہے جو غزل کے اشعار میں تہ داری اور پہلو داری کا ضامن ہے۔ غالبؔ سے اقبالؔ تک حسرتؔ سے فراقؔ اور فیضؔ تک اور آگے بھی غزل میں تبدیلیاں اور تجربات ہوتے رہتے ہیں (افسوس کہ میں اس فہرست کو طویل نہیں کر سکتا کہ جگہ کی قلت کے سبب جن محبوب ہندوستانی اور پاکستانی معاصرین کا نام نہ آسکے وہ مجھ سے خفا ہو جائیں گے) لیکن غزل کی غزلیت اور اس کا بنیادی مزاج آج بھی برقرار ہے اور جدید غزل آج بھی ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ ماضی کی روایات سے کلیتہً منقطع ہوئے بغیر اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی زندگی کے مشاہدات و تجربات کو منعکس کر رہی ہے۔

ہندوستان میں جو نئی غزل فراقؔ اور شاد عارفیؔ کے بعد کہی جا رہی ہے وہ نئے عہد کی روح سے ہم آہنگ ہے اور ایک نوع کی تازگی اپنے اندر رکھتی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، ندا فاضلی، شاذ تمکنت، بشیر بدر، باقر مہدی، زبیر رضوی، شہریار، بانی، شمیم حنفی، پرکاش فکری، فضل جعفری، محمد علوی، عادل منصوری وغیرہ ایسے نام ہیں جنہوں نے ہندوستان میں غزل کو ایک نئی معنویت اور نئی توانائی دی ہے لیکن انہی کے دوش بدوش یقیناً کتنے ہی اچھے اور سچے شاعر اور بھی ہوں گے جن کا ذکر ہم ہندوستانی غزل گو حضرات سے اپنی ناواقفیت کے سبب سے نہیں کر سکتا، مگر جو غزل کو اعتبار اور وقار دینے میں

دوسروں کے ساتھ برابر کے شریک ہوں گے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں ہندوستان کے تمام اردو ادب سے پوری طرح واقف نہیں اور اس کے اسباب ظاہر ہیں لیکن اپنی ناقص اور محدود معلومات کے مطابق اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں جدید غزل کا ارتقاء پاکستان سے نسبتاً مختلف خطوط پر ہوا ہے لیکن یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ ہندوستان میں بھی اچھے جتنے ہر طرح کے تجربوں کے باوجود بڑے نفیس اور اعلیٰ درجے کے شاعر موجود ہیں جو غزل کے امکانات کو وسعت دے کر اس کے حسن اور دلکشی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اسی طرح پاکستان میں بھی ۱۹۴۷ء کے بعد جدید غزل ایک نئے بانکپن اور توانائی کے ساتھ ابھری ہے۔ فیض۔ ندیم۔ حفیظ ہوشیارپوری، ممتاز صدیقی۔ ابن انشا، ادا جعفری، قتیل شفائی، مجید امجد، عزیز حامد مدنی اور بہت سے دوسرے شعراء (میں پریشان ہوں کہ اس محترم گروہ میں اپنا نام شامل کروں یا نہ کروں) پاکستان کے معماروں میں ہیں اپنے ماحول کے رشتوں اور رابطوں اور بدلتی ہوئی زندگی کے شعور و ادراک کے ساتھ اردو غزل میں جدیدیت کے نقوش ابھرتے نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر فیض صاحب جن کا مقام فکر و فن کے اعتبار سے نہایت بلند ہے اور جو نظم اور غزل دونوں میں اپنے منفرد اور اچھوتے اسلوب کی بنا پر ممتاز ہیں انہوں نے جدید غزل کو ایک نیا لب و لہجہ اور نیا رنگ و آہنگ دیا ہے۔ نئی نسل کے کتنے ہی شعراء نے ان کا اثر قبول کیا ہے۔ جدید غزل کو نئی زندگی اور نیا شعور دینے اور اسے نئے امکانات سے آشنا کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ بہرحال جدید غزل پر فیض صاحب کے اثرات ایک الگ مطالعہ کا موضوع ہیں۔ اسی طرح ناصر کاظمی کا نام بھی جدید غزل کے سلسلے میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ناصر کاظمی کے ساتھ یا اس کے بعد آنے والے دوسرے نوجوان شعراء نے بھی عہد حاضر کے سوز و ساز اور درد و داغ کی ترجمانی کا حق بہتر طور پر ادا کرتے ہوئے اردو غزل کو زیادہ سے زیادہ نکھارنے اور سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ اس گروہ میں ناصر کاظمی کے علاوہ اور اس ضمن میں جن دوسرے شعراء کے نام قابلِ ذکر ہیں اب میں ان میں سے چند کا حوالہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتا خواہ کمر والیں پر کچھ ہی گزرے۔ ان میں عبید اللہ علیم، شہزاد احمد، جمال پانی پتی، محشر بدایونی، پروین فنا، محبوب خزاں، منیر نیازی، اطہر نفیس، شکیب جلالی، کشور ناہید، محسن احسان، زہرہ نگاہ، رضی اختر شوق، جون ایلیا، حمایت علی شاعر، عالم تاب تشنہ، ظفر اقبال، ساقی فاروقی، رسا چغتائی، رئیس فروغ، سبط علی صبا، امید فاضلی، سحر انصاری، ضمیر ترابی، [illegible] پروین شاکر اور بہت سے دوسرے نوجوان شعراء شامل ہیں جو فنی لوازم کو معنوی خوبیوں سے ہم آہنگ کر کے جدید غزل کی راہیں ہموار کر رہے ہیں۔ جدید غزل کے افق کو نئی وسعتوں اور نئی جہات سے آشنا کر رہے ہیں۔ نئے خیالات کی روشنی میں نئی سچائیوں کا سراغ لگا کر اسے ایک نیا طرزِ احساس اور نیا پیرایۂ اظہار دے رہے ہیں۔ ان شعراء کے ہاتھوں جدید غزل، حسن و عشق کے بدلے ہوئے رویے میں عہد حاضر کی روح سے ہم آہنگ ہونے لگی [illegible] اندازِ فکر میں [illegible] معاملات و حقائق کی حقیقت پسندانہ ترجمانی بھی کی ہے [illegible] [illegible] ان اشعار سے سمجھئے۔

تمام عمر ترا انتظار ہم نے کیا
اس انتظار میں کس کس سے پیار ہم نے کیا

(حفیظ ہوشیار پوری)

وہ لوگ جن سے تری بزم میں تھے ہنگامے
گئے تو کیا تری بزمِ خیال سے بھی گئے

(عزیز حامد مدنی)

میں روز ادھر سے گزرتا ہوں کون دیکھتا ہے
میں جب ادھر سے نہ گزروں گا کون دیکھے گا

(مجید امجد)

وہ خار خار ہے شاخِ گلاب کی مانند
میں زخم زخم ہوں پھر بھی گلے لگاؤں اسے

(احمد فراز)

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرہ ترا

(ابن انشاء)

کچھ نہ تھا یاد بجز کارِ محبت اک عمر
وہ جو بگڑا ہے تو اب کام کئی یاد آئے

(راقم الحروف)

کیا لوگ ہیں کہ دل کی گرہ کھولتے نہیں
آنکھوں سے دیکھتے ہیں مگر بولتے نہیں

(اختر ہوشیار پوری)

یہ چاہا تھا کہ پتھر بن کے جی لوں
سو اندر سے پگھلتا جا رہا ہوں

(سلیم احمد)

اس کی ہر طرزِ تغافل پہ نظر رکھتی ہے
آنکھ ہے دل تو نہیں ساری خبر رکھتی ہے

(ظفر اقبال)

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ
جس دیئے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا

(محشر بدایونی)

نیتِ شوق بھر نہ جائے کہیں
تو بھی جی سے اتر نہ جائے کہیں

(ناصر کاظمی)

کس کے لئے جاگتے کس کی طرف بھاگتے
اتنے بڑے شہر میں کوئی ہمارا نہ تھا

(شہزاد احمد)

اُلجھے ہر آستاں سے محبت کبھی نہ کی
شکوے تھے اس قدر کہ شکایت کبھی نہ کی

(محبوب خزاں)

کچھ اس قدر تھی گرمیٔ بازارِ آرزو
دل جو خریدتا تھا اسے دیکھتا نہ تھا

(کشور ناہید)

آواز دے کے دیکھ لو شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں تو ہے

(منیر نیازی)

دلوں کی اور دھواں سا دکھائی دیتا ہے
یہ شہر تو مجھے جلتا دکھائی دیتا ہے

(احمد مشتاق)

تیرے آنے کا انتظار رہا
عمر بھر موسمِ بہار رہا

(رسا چغتائی)

دروازہ کھلا ہے کہ کوئی لوٹ نہ جائے
اور اس کے لئے جو کبھی آیا نہ گیا ہو

(اطہر نفیس)

گھر تو ایسا کہاں کا تھا لیکن
دربدر ہیں تو یاد آتا ہے

(امید فاضلی)

محبتوں میں عجب ہے دلوں کو دھڑکا سا
کہ جانے کون کہاں راستہ بدل جائے

(عبید اللہ علیم)

دیوار کیا گری مرے خستہ مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لئے

(سبط علی صبا)

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

(پروین شاکر)

مجھ کو مری شکست کی دوہری سزا ملی
تجھ سے بچھڑ کے زندگی دنیا سے جا ملی

(ساقی فاروقی)

جہاں تلک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے
مری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے

(شکیب جلالی)

کتنا پھیلے گا یہ اک وصل کا لمحہ آخر
کیا سمیٹو گے کہ اک عمر کی تنہائی ہے

(رضی اختر شوق)

گفتگو کسی سے ہو تیرا دھیان رہتا ہے
ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلم کا

(فرید جاوید)

میں جس کو اپنی گواہی میں لے کے آیا ہوں
عجب نہیں کہ وہی آدمی عدو کا بھی ہو

(افتخار عارف)

وصال و ہجر سے وابستہ تہمتیں بھی گئیں
وہ فاصلے بھی گئے اب وہ قربتیں بھی گئیں

(سحر انصاری)

عشق وہ کارِ مسلسل ہے کہ ہم اپنے لئے
ایک لمحہ بھی پس انداز نہیں کر سکتے

(رئیس فروغ)

شب فراق بھی چہرہ نما گزرتی ہے
کبھی چراغ بکف بھی ہوا گزرتی ہے

(نصیر ترابی)

مجھے احساس ہے کہ یہ جائزہ بہت سرسری اور تشنہ ہے اور وہ شعرا جو خصوصی توجہ کے مستحق تھے ان کا ذکر بھی شاید بھی اسکا اشعار بھی زیادہ منتخب نہیں کئے جاسکے۔ بہرحال ان اشعار سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جدید اردو غزل اجتماعی زندگی کے مختلف رجحانات کی صورت گری میں عصرِ رواں کے سماجی، معاشرتی اور تہذیبی عوامل کی عکاس انسانی زندگی کے بدلتے ہوئے شعور و شعار میں کس سلیقہ اظہار کا ثبوت دے رہی ہے اور کس طرح عہد حاضر کے آشفتگی کو حسن و عشق کے بدلتے ہوئے روابط کو، جدید زندگی کے درد و کرب اور اضطرار و انفعال کو انسان کے عصری تنہائی کو ایک جاذب توجہ نئے پن کے ساتھ فکر و فن کے سانچوں میں ڈھال رہی ہے۔ اپنے ماحول کی کثافتوں کی لایعنیت کے بیان میں کھردری حقیقتوں اور پیچ در پیچ مسائل کی آئینہ داری میں، غم و مسرت، ہجر و وصال اور فراق کی بدلتی ہوئی نسبتوں کے سبب سے ہر آن پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی ہوئی صورتِ حال کی عکاسی میں اگرچہ کبھی کسی کی سانس اکھڑ ضرور جاتی ہے لیکن بحیثیت مجموعی جدید غزل عہد حاضر کے بدلتے ہوئے رجحانات سے ہم آہنگ ہونے اور وقت سے عہدہ برآ ہونے میں اپنی امکانی صلاحیتوں کا بہتر سے بہتر ثبوت فراہم کر رہی ہے۔

لیکن! اگر کوئی اصرار کرے کہ غزل کے مستقبل پر کوئی واضح اور یقینی پیش گوئی کروں، مجھے خود "مستقبل" کے بارے میں ایک قول یاد آئے گا۔ یہ امریکہ کے مشہور فیوچرسٹ مسٹر HALE کا قول ہے۔

ماضی کا مستقبل مستقبل میں ہوتا ہے۔
حال کا مستقبل ماضی میں ہوتا ہے۔
مستقبل کا مستقبل حال میں ہوتا ہے۔

بہت بہت شکریہ۔

مرزا حامد بیگ

صیدِ زبُوں

یہ گرمیوں کی ایک دوپہر تھی

جب سارا دن تیز گرم لو چلتی رہی تھی بستی کی پُر پیچ گلیوں میں مٹی بولائی پھرتی تھی اور چیل انڈہ چھوڑ گئی تھی

ایسے میں اس بھری پُری آبادی میں ایک وہی تھی جو اپنے گھر سے باہر نکل آئی تھی۔ یہ سب اس کے معمول کے خلاف تھا، لیکن ہوا۔

بس پھر کیا تھا، ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔

اس ہنگام کی وجہ کیا تھی، کچھ پتہ نہیں۔ یہی کچھ سنا ہے کہ وہ ایک سانولا، متناسب کَس ہوا وجود تھا۔ اس کی غزالی آنکھوں، ستواں ناک، فراخ پیشانی اور صراحی دار گردن کی چھب نظروں میں نہیں سماتی تھی۔ ایک ہرنی تھی ہرنی۔ جو پوری آبادی میں قلانچیں بھرتی، دلوں کو دھڑکن جھلاتی، ہر طرف بکھر گئی تھی۔

سب اُسے دیکھ کر جیتے تھے اس کے دم سے سارا جگ سانس لیتا تھا، اس کا کہا کوئی ٹال نہیں سکتا تھا اس کی مرضی سب کی مرضی تھی لیکن اس کا انجام اچھا نہیں ہوا۔

اس کا سولہواں سال تھا جب وہ بدنام ہوئی ہے۔

وھلان پان سا رابعہ جس کو ایسی معنی مَسیں بھیگی تھیں، جانے کتنا عرصہ اسے آتے جاتے، سب سے ہنستے بولتے دیکھتا رہا تھا اور اس سے ڈر رہا گیا تھا

اور وہ اپنے گھر سے نکل آئی تھی۔

اس چلچلاتی دھوپ میں رابعہ آگے بڑھا، وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا اور کہہ نہ سکا تھا۔ گلی ویران تھی اور دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔

لیکن جانے کب اور کیسے، جیسے سب نے انہیں دیکھ لیا ہو۔

میں نے بتایا نہ کہ وہ قلانچیں بھرتی، دلوں کو دھڑکن سکھلاتی، ساری آبادی میں بھری ہوئی تھی۔ اس کا کہا کوئی ٹال نہیں سکتا تھا۔ اس کی مرضی سب کی مرضی تھی لیکن اس دن سب نے اُسے جھٹلا دیا۔

اس دن کسی نے اس کی نہیں سنی۔ سب اپنی اپنی کہہ رہے تھے۔

کسی نے کہا

"ان کا روز کا ملنا جلنا تھا"

کیمے نے اس کی بات کاٹی

تم کیا جانو ——— جو کچھ ان گنہگار آنکھوں نے دیکھا ہے"۔

فیکے نے لقمہ دیا

کیوں بھئی تاجے، سب کو بتلا ہی دوں، جو کچھ گئی رات ہوا ہے۔

ہم دونوں تو موقع کے گواہ ہیں۔

بڑھتے ہوئے ہجوم کے بیچوں بیچ، وہ دونوں، مجرموں کی طرح نہیں بلکہ سب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سیدھے کھڑے تھے لیکن کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور عیص بیص جڑیں کر گئی تھی۔

پھر جانے کیا سوچ کر راجو، ایک طرف کو نکل کر بھاگا۔

قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ اس کی تو ابھی محض مسیں بھیگی تھیں۔

اس کے نکل بھاگتے ہی سب نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

کیمے نے فیکے کی ہاں میں ہاں ملائی اور فیکے کی تصدیق تاجے نے کر دی۔

ہوا کیا تھا۔

یہ جاننے کی کسی کو کیا پڑی تھی۔

اور یہ کہ اس کا سولہواں سال تھا جب وہ بدنام ہوئی ہے۔

اس کا کہا کوئی ٹال نہیں سکتا تھا، لیکن اُس دن اس کی کسی نے نہیں سُنی۔ وہ اپنی ایڑی کی جگہ میں دھوپ چاہتی تھی۔

اس روز کے بعد وہ اپنے گھر کے ایک تاریک گوشے کی تاریکی بن کر رہ گئی۔ پھر اسے کسی نے نہیں دیکھا۔

اس کے بغیر بستی سونی تھی۔ ساری آبادی تو اُسے دیکھ کر جیتی تھی۔ اس کے دم سے سارا جگ سانس لیتا۔

ن جب اس بات کا سب کو احساس ہوا ہے تو وہ اپنے گھر کے ایک تاریک گوشے کی تاریکی بن چکی تھی۔
کیمے، فیکے اور تاجے نے سر جوڑے، تب راجہ کی ڈھنڈیا پڑی ہے۔ اب تک راجہ جانے کہاں چھپا رہا تھا۔ اس ہنگام
ہ دو روز بعد رات کا آخری پہر ہوگا، جب وہ سب سے چھپتا چھپاتا جرنیلی سڑک کو چڑھ گیا۔

زمانے بیت گئے، اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔

بچوں نے نفرت کرنا اپنے بڑوں سے سیکھا، اور بڑے بوڑھے اُس سے نفرت کرتے، منہ سے کف اڑاتے
تریاں بکتے، عمروں کی ڈھلوان سے نیچے اتر گئے۔

اس نے کیا ہی کچھ ایسے تھا کہ سب حیران تھے۔ اس کا جرم اپنے پرایوں کے وہم و گمان سے باہر تھا۔ سب سنتے
اور سُن رہ جاتے تھے۔ پر جب سب طیش میں آ کر اٹھے تھے تو وہ غائب تھا۔ ڈھنڈیا پڑی، نیچے کی زمین اوپر اور
پر کی نیچے کر دی گئی۔ اس کی کہیں خبر نہ ملی۔

زمانے بیت گئے، لوگ بھول بھلا گئے۔

ایک دن پتہ چلا کہ راجہ گزر گیا —— خون تھوکتا ہوا۔

اس کی موت کی خبر نے نئی نسل کے ذہنوں میں اُس بھولی ہوئی یاد کو کروٹ دی۔ لیکن انہیں اس گئے وقتوں کے
ے سے کیا دلچسپی تھی۔

اکا دکا پرانے لوگوں نے راجے کی موت کا سنا اور ایک دوسرے سے پوچھا۔

"اصل قصہ کیا تھا؟"

کوئی ایسا نہ تھا، جو آنکھوں دیکھی کہتا۔ بس ایک دوپہر کا قصہ تھا جب کیمے، فیکے اور تاجے نے آپس میں سر جوڑے
ے اور یہ کہ حیص بیص جڑیں کر گئی تھی۔ پھر لوگ اکٹھے ہوتے تھے اور بس ——

کسی نے اس سانولے، متناسب، کسے ہوئے وجود کو یاد کیا، جسے دیکھ کر سارا جگ سانس لیتا تھا۔

اُدھر اپنے گھر کے تاریک گوشے میں اس نے بھی سُنا:

"گزر گیا —— خون تھوکتا ہوا۔"

تب وہ ہڈیوں کا پنجر اور جھریوں کی مٹھی، سینہ کوبی کرتی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ پیٹتی ہوئی باہر
آ آئی۔

"لوگو —— میرا سولہواں سال تھا جب وہ نامرد مجھے پوری آبادی کے بیچ تنہا چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا۔ آخر گزر گیا
نا تھوکتا ہوا۔"

کون گزر گیا ——

نئی نسل؛ اس کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتی تھی۔ انہوں نے تو اس سے نفرت کرنا اپنے بڑوں سے سیکھا تھا اور بڑے اپنی عمر کی ڈھلوان سے نیچے اُتر گئے تھے۔

اب وہ تاریک گوشے کی تاریکی؛ ہڈیوں کا پنجر اور جھریوں کی مٹھی آبادی میں ہر طرف قہقہے لگاتی پھرتی ہے۔ اس تعفن کے بھبکے اٹھتے ہیں جب وہ کسی کی دہلیز پر بیٹھ جاتی ہے، مگر اُجاڑ کر رکھ دیتی ہے۔

کون ہے جو اس کا سامنا کرے۔

غلاظت چاٹتی اور جوہڑ کا بدبودار گدلا پانی پیتی ہے اور کہتی ہے:

"قلیلہ روح تو دنیا سے اٹھ گئی ہے ـــ اب کیسی غلاظت؟"

بستی اُجڑ کر رہ گئی ہے۔

کیسے؛ نیکے اور تلبے کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں اور ایک بار پھر آپس میں سر جوڑے ہوئے ہیں۔

اقبال نواز

فن و شخصیت کا قتیل شفائی نمبر — ایک جائزہ

عہد جدید میں جبکہ تاریخ اور فنون لطیفہ دونوں عروج پر ہیں ان کے انمول جواہر کو اکٹھا کرنا اور آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے کیونکہ جدید ذہن نے جہاں بہت کچھ ورثے میں پایا ہے وہاں بہت کچھ ورثے میں چھوڑنے کا بھی قائل ہے۔ اسی لئے شاید بھارت کے صابر دت نے عہد حاضر کے عظیم فنکاروں کی زندگی کے لمحات اور ان کے فن پاروں دونوں کو محفوظ کرنے کا مشن شروع کر رکھا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی "فن اور شخصیت" کا فیض احمد فیض نمبر تھا۔ جبکہ اب انہوں نے "قتیل شفائی نمبر" شائع کر کے اپنے مشن کو استحکام سے ہمکنار کیا ہے۔ قتیل شفائی عصرِ حاضر کے ان شعراء میں سے ہیں جنہیں قدرت نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ میں یہ بات کسی عقیدت کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ قتیلؔ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت خود اس کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ ادیت کے اس عہد میں جب کسی شخص کو اتنی فرصت بھی نہیں کہ دوسرے کے دو چار بھرے بول بھی پوری توجہ کے ساتھ سن سکے۔ تو قتیلؔ کا پینتیس چالیس برس تک مسلسل دنیائے ادب کی سکرین پر چھائے رہنا کسی معجزے سے کم نہیں۔ اس نمبر کی اشاعت کے حوالے سے قتیل شفائی نے خود لکھا ہے "میرا خیال ہے کہ مجھے اس نمبر کے سلسلے میں خاموش ہی رہنا چاہیئے۔ ہاں جب یہ نمبر شائع ہو جائے تو جس جس گلی سے جو جو پتھر آئے اسے اپنے لئے اعزاز سمجھ لینا چاہیئے۔ کیونکہ اس کم فرصتی کے دور میں پتھر پھینکنے کی بھی فرصت کسے ہے"۔ اس اقتباس سے ایک طرف جہاں قتیلؔ کی سادگی اور انکساری کا احساس ابھرتا ہے۔ دوسری طرف اس کی عظمت کا پہلو بھی نکلتا ہے کیونکہ میرے نزدیک پتھر پھینکنے والا اتنا اہم نہیں ہوتا جتنا کہ وہ شخص جس پر پتھر پھینکے جاتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ ہمیشہ زیادہ پتھر پھل دار درخت کی طرف ہی آتے ہیں۔ اور قتیلؔ ایک ایسا پھل دار درخت ہے۔ جس کے پھل کے ذائقول نے اردو ادب کو نئی رتوں کا نقیب بنا دیا ہے۔ "فن اور شخصیت" کے قتیلؔ شفائی نمبر کی اشاعت سے قتیلؔ کی زندگی کے بے شمار ایسے پہلو جو اب تک عام قاری کی نظروں سے اوجھل تھے۔ وہ بھی سامنے آ گئے ہیں۔ "اور اگر کوئی محقق ان کے فن اور شخصیت پر کام کرنا چاہیے" تو یہ نمبر ایک سنگ میل کی طرح اس کی بھرپور رہنمائی کر سکتا۔ صابر دت اسی نمبر کے حوالے سے لکھتے ہیں "اس نمبر میں صرف قتیل شفائی ہی نظر آئے گا۔ اگر اب تک آپ ان سے نہیں ملے تو اس شمارے کے ذریعے نہ صرف آپ ان سے متعارف ہو جائیں گے بلکہ اچھی طرح واقفیت حاصل کر لیں گے"۔ اب

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قتیل شفائی شاعر تو پاکستان کے ہیں لیکن نمبر چھپا ہے تو بھارت سے۔ اس کی آخر کیا وجہ ہے؟ میرے نز اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ کسی بھی فنکار کو حدود و قیود کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ فن تو ایک خوشبو ہے۔ جو چمن میں بھی رہے تو بھی چمن کی ا اور رعنائی کا باعث ہے اور چمن سے باہر ہوا اگر اسے اڑا کر لے جائے تو وہ چمن ہی کی شناخت کا سبب بنتی ہے۔ اور اس بات کی ا ہوتی ہے کہ چمن ابھی تک تازہ گلوں اور تازہ رُتوں سے خالی نہیں ہوا ہے۔ دوسری وجہ میں راہی معصوم رضا کے الفاظ میں یوں پیش کر ہوں کہ "پاکستان کے ہم وطنیوں کو آخر توفیق کیوں نہیں ہوتی کہ وہ ہندوستانی اردو ادیبوں پر کوئی نمبر نکالیں۔ "قتیل شفائی نمبر کے صابر دت نے ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد کی ہے۔ کوئی ادیب لندن بیٹھا ہے یا اس سے بھی آگے۔ صابر دت نے اسے بھی کسی نہ طرح اس نمبر میں قتیل صاحب کے حوالے سے شریک کر لیا ہے۔ فیض احمد فیض نے اس نمبر کیلئے بیروت سے بھیجے گئے اپنے پیغام میں لکھ کہ اظہار اور ترسیل کے مقامات میں قتیل کی آواز منفرد بھی ہے اور ممتاز بھی۔ قتیل شفائی کا کلام اپنے وقت کی مخلوق میں یقیناً مقبو محبوب ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے لکھا ہے کہ قتیل اس دور کا سب سے رسیلا شاعر ہے"۔ جبکہ سید ضمیر جعفری لکھتے ہیں" قتیل شفا کے عصری ادب کی ایک اہم شخصیت ہے"۔ غرضیکہ یہ صابر دت کا کمال ہے۔ صاحبِ نمبر کسی دوسرے ملک میں بیٹھا تھا اور وہ خود د میں بیٹھ کر اس نمبر کو وقیع بنانے میں مصروف عمل رہا۔ اور اس طرح انہوں نے دوریوں کے سفر کو محبت اور چاہت کی قربتوں میں بدلتے ہ یہ نمبر چھاپ کر اس دور کے نقاد کو حیران اور قاری کو سراپا اشتیاق کر دیا۔ آیئے اب میں اپنے ہمراہ آپ کو اس نمبر کے مطالعے میں شریک کر لیتا: ٹائیٹل پر قتیل کا خوبصورت پورٹریٹ ہے۔ اور اس پورٹریٹ کے پہلو سے ایک چھوٹا پورٹریٹ بر آمد ہو رہا ہے۔ اور ان دونوں کے امتزا اس نمبر کا خوبصورت سرورق وجود میں آیا ہے۔ اب ذرا اس سے آگے بڑھیے تو پیغامات کا حصّہ ہے۔ جن میں سے نسبتاً اہم شخصیات کی آرا اوپر درج کر آئے ہیں۔ ص ۳۲ سے ۴۰ تک قتیل صاحب کی زندگی کے اہم لمحات کی تصویری جھلکیاں بکھری پڑی ہیں جو قتیل کی نجی اور ادبی زندگا جھلکیاں لگتی ہیں غرضیکہ ایک زندہ قلم ان جھلکیوں میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ اس کے بعد کام آگہی دیوانگی اپنی" کے عنوان سے قتیل کی شخصیت پر شامل ہیں۔" ہم کہ ٹھہرے اجنبی" کے عنوان سے حمیدہ قمر نے ان کے نظریۂ فن کے بارے میں تعارفی مضمون اس حصے میں مرتب کیا ہے۔ جس میں قتیل اور زندگی دونوں کے بارے میں کھل کر اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ ددہ DIET کے حوالے سے کہتے ہیں" شاعر جو کچھ کہے اپنے میں کہے۔ اس کی آواز کورس کا ایک حصہ بن کر رہ نہ جائے"۔ گویا انہوں نے شاعر کی انفرادیت کو اس کی بقا کا جزو لازم قرار دیا اس کی آگے چل کر ترقی پسندی کا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے یوں وضاحت کرتے ہیں" میرے نزدیک ان اوجھل قسم کے رنگوں کو لانا زیادہ ترقی پسندانہ رویہ بھی ہے۔ اور اجتماعی کورس سے بچ نکلنے کا ایک اچھا طریقہ بھی۔ اس طرح ایک شاعر اس عالمگیر ادبی کے دائرے میں بھی رہتا ہے اور الگ سے اس کی پہچان بھی ہوتی ہے۔ اور اگر شاعر کو اپنے فن پر کامل دسترس بھی ہے۔ تو اعلیٰ شاعر تخلیق کا اعزاز بھی اس کے حصے میں آ جاتا ہے"۔ مجھے مندرجہ بالا دونوں اقتباسات اس لئے بھی درج کرنے پڑے ہے تاکہ واضح ہو سکے قتیل کے نزدیک شاعر کی انفرادیت کیا ہے اور ان کے نزدیک ترقی پسند شاعر کا کیا کردار ہونا چاہیئے۔ ان کے نزدیک جو شاعر کے اوجھل پہلوؤں کی ترجمانی فنکارانہ چابکدستی سے کرنے کی دسترس رکھتا ہے۔ اور جو زندگی کے تو مات کو ایک منفرد دلکش

ساتھ پیش کرتا ہے۔ اور کانِ نمک میں مل کر نمک بن جانے کی بجائے ایک الگ ہیرے کی آب و تاب لے کر نکلتا ہے وہ شاعر یا ادیب ترقی پسند ہے۔ ان کے نزدیک نعروں کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قتیل نے خود بھی اپنی شاعری میں استحصال اور حقوق کی پامالی کو نعرے بازی نہیں بننے دیا بلکہ ان تلخ مسائل کو فن کی ملائمت سے ہمکنار کرکے پیش کیا ہے۔

مری مفلسی سے بچ کر کہیں اور جانے والے
یہ سکوں نہ مل سکے گا تجھے ریشمی کفن میں

یہ تو تھی قتیل کے نظریۂ فن کی وضاحت اب ذرا آیئے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی طرف۔ قتیل کی شخصیت کا کمال یہ ہے کہ ان کا بڑے سے بڑا دشمن بھی ان کی فنی عظمت اور شخصی کردار دونوں کا معترف رہا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "قتیل اچھا شاعر، اچھا ادیب، بہت بڑا دشمن"۔ قتیل بڑا دشمن اس لئے بھی ہے کہ ایک بار اس کی جس سے ٹھن گئی تو واقعی ٹھن گئی۔

فارغ بخاری اس حوالے سے لکھتے ہیں۔ "قتیل جس کے پیچھے پڑ جاتا ہے اسے قبر تک معاف نہیں کرتا"۔ یہاں پوچھنے کی بات یہ ہے کہ آخر قتیل اتنا بڑا دشمن کیوں ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ قتیل کی دشمنی ذاتیات کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ اصولی دشمنی ہوتی ہے۔ اور اصولوں کے معاملے میں قتیل مفاہمت کا قائل نہیں۔ اس نے جو اصول بنا لیا اس پر خود بھی سختی سے عمل کیا اور دوسروں کو بھی اس کا درس دیا۔ یہی وجہ ہے کہ قتیل سے دشمنی مول لینا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ اسی لئے تو محمد طفیل قتیل کے خاکے میں لکھتے ہیں۔ "میرا ان سے واسطہ نادان دوست والا نہیں دانا دشمن والا ہے"۔ قتیل جو بھی کام کرتا ہے وہ ٹوٹ کر کرتا ہے۔ اس نے فلمی دنیا کو اپنایا تو فلم کو بھی ادب سے آشنا کر دیا۔

قتیل نے اگر کچھ دشمنیاں پالی ہیں تو اس نے دوستوں پر خلوص اور چاہت کی خوشبوؤں کے خزانے بھی نچھاور کئے ہیں۔ اس کے دوست امیر ہوں یا غریب فنکار ہوں یا غیر فنکار۔ بس جس سے ایک دفعہ تعلق قائم ہو گیا سمجھو کہ قتیل اس کے ہاتھوں قتیل الفت ہو کر رہ ہو گیا۔ یہاں مجھے ایک بار پھر محمد طفیل کا حوالہ دینا ہی ہوگا۔

"قتیل صاحب دشمنیاں ہی نہیں پالتے دوستیاں بھی پالتے ہیں۔ دوستیاں پالنے کا جذبہ ان کی شخصیت میں بہت نمایاں ہے۔ ان کے جو دوست ہیں وہ ان کے نزدیک ہر طرح کی طرف داری کے مستحق ہیں۔ جھوٹے ہوں تو سچے ہوں تو"۔ شاید یہ قتیل کی اسی چاہت اور محبت کا نتیجہ ہے۔ ساحر لدھیانوی قتیل شفائی کو "پرچھائیاں" پیش کرتے وقت یہ تاریخی جملہ لکھنے پر مجبور ہوا "پاکستانی ساحر لدھیانوی کی نذر۔ ہندوستانی قتیل شفائی کا ہدیۂ خلوص"۔ کیا یہ جملہ دو دوستوں کی گہری اور انمٹ محبتوں کا ایک حسین و جمیل استعارہ نہیں؟

"فن و شخصیت" کے اس مجموعے میں قتیل کی زندگی کے سب سے بڑے جذباتی حادثے پر بھی کھل کر قلم اٹھایا گیا ہے میرا اشارہ ... ... ہے۔ اس حادثے نے قتیل کے فن و شخصیت پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ اور بقول ابراہیم جلیس۔ "قتیل

کچھ دن ایسے گزارے جب کہ اس کے شانوں پر بیوی کے علاوہ ایک اور عورت کی زلفیں پریشان ہو گئی تھیں۔ ۔ ۔ اب قتیل کبھی کبھی اس عورت کے بارے میں یہ ضرور سوچتا ہے کہ اب وہ شمعِ فروزاں کہاں ہے۔ لیکن قتیل اس کی جدائی کو ایک بہت بڑا تجربہ سمجھتا ہے۔ اور وہ اس سبق اور تجربے کو بڑے سلیقے کے ساتھ اپنے شعروں میں گوندھتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی نظموں اور غزلوں کے پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی ہمارے اور آپ کے سامنے سے ایک نہایت خوبصورت عورت چپکے سے گزر گئی۔ صرف اس کے جسم کی خوشبو ہے جو باقی رہ گئی ہے۔ اور مشامِ جان سے ٹکرا رہی ہے۔" اس اقتباس سے اس جذباتی حادثے سے قتیل کے فن پر مرتب ہونے والے اثرات واضح ہو جاتے ہیں۔ وہ سانولی سی مرینوں جیسے نام والی عورت جسے قتیل نے مخصوص بازار سے چھین کر فن کے ایوانوں میں وقت کی آواز بنا دیا تھا۔ وہ ابھی تک اس کے فن کی صداؤں میں ہم سفر ہے۔ اور ہمارے نزدیک "مطربہ"۔ قتیل کی شاعری اور زندگی دونوں میں ایک ایسے تجربے کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس نے دنیائے ادب کو نئے لہجے سے آشنا کرایا اور جن موضوعات کے بارے میں کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ قتیل نے انہیں اپنے تجربے اور اپنے فن کی صداقت سے ایک ایسی آب و تاب دی کہ جس کی روشنی ان موضوعات پر لکھنے والوں کے لئے چراغِ راہ بھی ہے اور اگلے سفر کی بشارت بھی۔" "مطربہ کا مطرب" کے عنوان سے اپنے مضمون میں فکر تونسوی نے قتیل کی شاعری کا اسی حوالے سے جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ قتیل شفائی نے "مطربہ" کیوں لکھی۔ کیسے لکھی۔ اس کی بھی ایک کہانی ہے۔ کہانی جو آپ بیتی ہے۔ کہانی جو جگ بیتی بھی ہے۔ شاعر نے نظموں کی اس کڑی کو غمِ ذات کی بھٹی میں پگھلا پگھلا کر ڈھالا اور جب یہ کڑی ڈھل کر نکلی تو غمِ ذات کی محدودیت سے نکل کر غمِ جہاں تک پھیلتی چلی گئی۔ اس لئے کہانی کا ہیرو اکیلا قتیل شفائی ہے۔ مگر قتیل شفائی کا تجربہ چونکہ ہم سب کا تجربہ ہے۔ اس لئے ہم سب "مطربہ" کے ہیرو ہیں۔ اسی طرح قتیل کی قریباً ہر کتاب کا علیحدہ علیحدہ جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اور مجموعی طور پر ان کے فنی رویوں اور مابعد الطبیعیاتی حوالوں کو بھی موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ قتیل کی شاعری میں ایک بات ایسی ہے جسے کوئی نقاد بھی نظرانداز نہیں کر سکتا بلکہ کہنا چاہیے کہ یہ بات نقاد کی مجبوری ہے اور وہ یہ ہے کہ قتیل شفائی کی شاعری کا رسیلا پن، نغمگیت اور تجربات کو ایک کومل کومل انداز میں پیش کرنے کا طریقہ ہر ایک کی اشاعت سے ملک بھر میں تک ہر طرف ہر گیت اور ہر نظم میں قتیل شفائی کی شاعری میں یہ بات نظر آئے گی اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہزاروں دوسرے شعراء کے شعروں میں اگر قتیل کا ایک شعر بھی شامل ہو تو وہ منفرد نظر آئے گا۔

اسی حوالے سے فارغ بخاری لکھتے ہیں کہ "اس نے بعض دوسرے شعراء کی طرح تقلید کی بیساکھیوں یا تائیش باہمی کے زینوں سے اوپر اٹھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ بلکہ اپنے نظریئے سے روشنی حاصل کی اور اپنی مسلسل محنت، ریاضت اور لگن سے اپنے لئے مقام بنایا۔ آج نصف صدی گزار دینے کے بعد اس کا ذہنی زنگ آلود نہیں ہونے پایا اور اس کی سوچ شاداب اور ہری بھری ہے۔ اس نے اپنے ذہن و فکر کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھے ہیں۔" اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے "قتیل شفائی تا آگہی سیا بھی" میں جرات حسن نے لکھا ہے کہ "اس نے اپنے ذہن کی کھڑکیاں ہمیشہ کھلی اور کشادہ رکھی ہیں تاکہ انسانی تہذیب کے مختلف دھارے آزادانہ طور پر اس میں آتے جاتے رہیں۔ مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی ایک دھارے کے سیلاب میں خود بہہ جائے۔" اور ہمارے نزدیک یہی وجہ ہے کہ قتیل کی شاعری میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نکھار آتا جا رہا ہے۔ جبکہ اس کی صف کے بہت سے دوسرے شاعر ذہنی طور پر بوڑھے ہو چکے ہیں۔

احمد جمال پاشا

کتاب کی جلد

ہمارے بچپن میں کتاب کی جلد بہت مضبوط واقع ہوا کرتی تھی۔ ایک بھائی کے ہاتھ میں "علی بابا چالیس چور" ہوتی تو دوسرے کے "ٹھگوں کا بادشاہ"۔ بلا تکلف گھنٹوں پنگ پانگ کھیلا کرتے۔ تھک گئے تو کتاب کھول کر قصّہ پڑھنے لگے۔ تازہ دم ہوئے تو پھر کتاب بلّا بن گئی۔ بھائی بہنوں میں جنگ مغلوبہ ہوتی تو "الف لیلیٰ" اور "ہزار داستان" جیسی ضخیم کتابوں سے جوابی حملے کیے جاتے۔ کیا مجال جو کبھی کوئی کتاب شہید بھی ہوئی ہو۔

گھر میں سبھی کو پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ اس لیے کتابوں کو چاٹنے کے بعد ان سے دسترخوان کا بھی کام لیا جاتا۔ ہمدرد، کامریڈ، اور ہمدم کی فائلوں پر ہمیں بیسیوں بار کھانے اور اخبار سے دسترخوان کا کام لینے کا شرف حاصل ہے۔ ڈھکن غائب ہو جانے کی صورت میں گھڑے پر "اسٹوڈنٹس پاکٹ ڈکشنری" ڈھک دی جاتی۔ بارہا بیمار کا نسخہ کتاب کی جلد میں اور دوا کتاب پر رکھ دی جاتی۔ کسی نے پوچھا "نسخہ کہاں ہے" جواب دیا "گلستاں میں"۔ نولکشور پریس کی باتصویر "گلستان" کی جلد اتنی مضبوط تھی کہ بھائی لوگوں نے گھریلو سینما کے لئے اس کی تمام اہم تصویریں کاٹ لی تھیں۔ پھر بھی جلد کی شکل میں شیخ سعدیؒ باقی رہ گئے اور عرصہ تک مجلّد ہونے میں ڈٹے رہے۔

اللہ بخشے ماموں جان کو مرحوم علامہ یاد بریلوی تخلص کرتے۔ کبھی اپنے کمرے میں کسی کو جھانکنے تک نہ دیتے۔ جب علامہ صاحب کے مشاعرے میں ایکسپورٹ ہوتے تو ہم لوگ چپکے سے ان کے کمرے میں گھس کر ریل ریل کھیلتے۔ قاموس، مخزن، سکندر نامہ، اخلاق جلالی، اخلاق ناصری اور کیمیائے سعادت، وغیرہ کو بطور ریل کے ڈبوں استعمال کرتے۔ انجن کے طور پر سب سے آگے "شاہنامہ" فٹ کیا جاتا اور "قرابادین" گارڈ کے ڈبے کا کام [illegible] پھر کتابوں کی اُٹھا پٹک اور کتابوں پر بیٹھ کر انہیں کھسکانے کا سلسلہ جاری رہتا۔ مگر کیا مجال کہ کبھی کوئی جلد [illegible]۔ دراصل اس زمانے میں جلدوں کا دل رکھنے کے لئے "واٹر پروف" یا "[illegible]" قسم کی [illegible]۔

ہم پہ جوانی آئی تو جلدوں پر بڑھاپا آگیا۔ وجہ ہماری جوانی نہ تھی۔ بلکہ کتابوں کا ما نجھا ڈھیلا تھا۔ دراصل خنکارانہ
فن کی جگہ کاروباری اور پھر کام چلاؤ جلدوں نے لے لی تھی۔ اس کے بعد دو نمبری کا فیشن چلا تو چلتاؤ جلدیں
یا دو نمبری بننے لگیں۔
نئی قسم کی جلدوں میں جلد ساز سے زیادہ خریدنے والوں کا قصور ہے۔ پرانی جلدیں تو پڑھنے والے خریدا
تے مگر نئی جلدیں لائبریریوں کے لئے باندھی جاتیں۔ جہاں اچھی بھلی کتاب کا سرورق نمائش کے لئے اور کتاب
باندھنے کے لئے بھیج دی جاتی۔ اس خوف سے کہ قاری غلطی سے کتاب خرید کر مصنف کے بارے میں رائے
ب کرے۔ قیمتیں آسمان سے بھی بلند کر دی گئیں کہ نہ پہنچ پاؤ نہ خرید سکو۔
لائبریری جلد نہیں کمیشن کی شکایت کرتی ہے۔ اس لئے ماہرین نے کتاب پہ سے قاری کا خطرہ ختم کرنے کے لئے یہ
بنایا کہ "مجبوراً قاری کتاب نہ خریدنے پائے" جس کا خوشگوار اثر یہ ہوا کہ پڑھنے والی مخلوق یا تو ناپید ہو گئی یا
پریشانیوں میں پناہ گزیں۔ رہ گئے شاعر، ادیب تو انہیں اپنی قیمتی تحریروں کے مطالعے سے کہاں فرصت کہ دوسروں
پہ نگاہ کرا پنی اور بینلیٹی پہ بٹہ لگا دیں۔ کافی ہاؤس میں بیٹھنے کے بعد پڑھنے کی یوں بھی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔
جب دو نمبر کا زمانہ آیا جلدوں میں مضبوطی کی جگہ حسن و نزاکت اور نفاست نے لے لی تو جلد بندی کی رہی سہی کسر
آرٹ نے پوری کردی جس سے فوری فائدہ یہ ہوا کہ کتاب پر نظر کے بجائے ترچھی نظر پڑنے لگی اور وہ بھی
نہیں کتاب کی ہوشربا قیمت پر۔
کتاب کی بہت سی منزلیں ہوتی ہیں۔ مگر جلد کی صرف ایک کہ اس کا انتہائی محنت سے مطالعہ کرنے والا ہو۔ مطالعہ ایک
ذہنی عمل ہے جس میں قاری اور کتاب میں باقاعدہ کشتی ہوا کرتی ہے۔ اور دونوں کی قلعی ایک دوسرے پر کھل جاتی ہے
لے پڑھتے لیدر پڑا تو کتاب روانہ ہوگئی۔ کوئی کام نکل آیا تو کتاب بغل میں۔ ڈاکٹر کے یہاں نمبر آنے یا دوا لینے میں دیر
تو کتاب جیب سے نکالی اور پڑھنے لگے۔ بہت سے لوگوں کو خوش فہمی ہے کہ صرف جاسوسی ناول بڑے ذوق و
ق سے پڑھے جاتے ہیں۔ اور داستان پڑھنے والے کو کھانے پینے تک کا ہوش نہیں رہتا۔ ہم نے نہایت خشک اور
میں تحقیقی کتابیں نیاز فتح پوری اور قاضی عبدالودود کو اس طرح پڑھتے دیکھا ہے کہ کتابیں ان کا اوڑھنا بچھونا بن گئے
دیکھا ہے تو پائنتیا نے کتاب کا پڑھا ہوا حصہ، زیر مطالعہ حصے کو بشیر کی طرح ہاتھ میں دبوچے ہوتے ہیں۔
تاب سے کاظم علی خان کو پڑھتے نہیں دیکھا تو پھر کچھ نہ دیکھا۔ ان کے مطالعے کا طریقہ رشید حسن خاں سے بھی نرالا
ہے۔ پہلے وہ گیان چند جین کی طرح کتابوں کے چھوٹے بڑے چبوتروں کا حلقہ اپنے گرد بنا لیتے ہیں۔ ہر چبوترے کو مواد
تاریخی ترتیب کے اعتبار سے سجاتے ہیں۔ ہر بار الماریوں کے تالے کھولتے کتابیں نکالتے اور تالے بند
کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے پڑھنے کے کمرے کی کنڈی اندر سے بند رہتی ہے [illegible]

ضخیم ادیب کی طرح تالے پر تالہ اس پر تالہ اور پھر تالہ۔ غرض لوہے کے تالے زندگی ہیں۔ گویا کتاب نہیں بینک ہے جس کے اسٹرانگ روم سے کرنسی نکالی جا رہی ہے۔ پھر بڑے اہتمام سے ان کتابوں کے بیچ میں حُقّہ رکھا جاتا ہے۔ تاؤ تیز کرنے کے لئے مخطوطات سے پنکھے دھونکنی اور مچھونکنی کا کام لیا جاتا ہے۔ ہمارے پٹھان دوست عابد پشاوری کی طرح اس شان سے علمی و تحقیقی تخت پر جلوہ افروز ہوا کرتے ہیں کہ اگر موسم معتدل ہے تو بنیائن اور تہبند جس پر تہمد کی تہمت ہے خدانہ کرے کہ موسم گرم ہے تو پھر لباس گرمیٔ تحقیق کی تاب بھلا کہاں لا سکتا ہے۔

موصوف نے ایک جلد اٹھائی اُسے کھا جانے والی نظروں سے پڑھا۔ سناٹے میں آگئے۔ اُچھل پڑے۔ بڑ بڑائے مصنف کا شجرہ نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ غُصّے سے بیان کیا۔ غصہ سے بھنویں تن گئیں "بکواس" کے فلک شگاف نعرے کے ساتھ کتاب اتنے زور سے پھینکی کہ اِس کونے میں کتاب اور اُس کونے میں جلد گری۔ یا ماٹھ ہی میں رہ گئی۔ پھر کسی مخطوطے میں غرق ہو گئے۔ تاؤ کم ہوا تو جلدی سے کچھ چلم اور کچھ جسم کو ہوا دی۔ کہیں بدن اس سے کھجلا لیا۔ اس سے ماتھے کا پسینہ اس طرح صاف کیا جیسے مہتر پنجے سے نالی صاف کرتا ہے۔ کھانے کا وقت ہوا تو بیگم صاحبہ نے ڈرتے ڈرتے یاد دلایا۔ اتنے زور سے گھُرکا "مجھے غالب کے شاگرد میر مہدی مجروح کے پرنواسے کی تاریخ پیدائش نہیں مل رہی ہے اور تمہیں کھانے کی پڑی ہے"۔ بیچاری سہم کر رہ گئیں۔ رئیس التحقیق پھر غلام رسول مہر اور مالک رام کی جلدوں میں ڈوب گئے۔

سب سے پہلے کتابوں کے ننگے کوَر دریافت کئے گئے۔ اندر ایک جانب کی دفتی جس پر جلد کی تہمت اور پر مریل سا پتنگی کا غذ جلد کے اندر آدھا اِنچ مُڑا ہوا۔ کتاب کھولنے پر جلد سے کور اس طرح نکل جاتا جیسے کسی نے جلد کا ازار بند کھول کر جلد کو عریاں کر دیا۔ مگر یہ سب باتیں اس زمانے کی ہیں جب لوگ کتاب خرید کر پڑھتے تھے اگر کتاب اس کی عقل سے بھی موٹی ہوتی تو اس کور سے "بک مارک" کا کام لیتا۔ یا بچے ناؤ بنا کر پانی میں اپنے ہاتھ سے تیراتے صاحب کتاب کو چنداں کوفت نہ ہوتی۔ کور ڈوبا تو کیا ہوا۔ بچوں کا گھڑی بھر دل تو بہل گیا۔ اگر کتاب دریا برد بھی کر دیتے تو لب پر شکوہ نہ آتی۔ مہدی افادی جب تک نفیس جلد نہ بندھواتے کتاب کی طرف دیکھتے تک نہیں۔ ابتدائی چند صفحات فیصلہ کر دیتے کہ کتاب لائبریری میں رکھی جائے یا ردی کی ٹوکری سے جلد نکال کر بنیے کی دکان تک پہنچا دی جائے ٹیڈی جلدوں کو تاؤ کی طرح موڑ کر بآسانی جیب میں رکھا جا سکتا ہے۔

پتہ نہیں چل پاتا کہاں سے جلد شروع ہوئی ہے۔ اور کہاں پر کتاب کی سرحد واقع ہے۔ سنگم کہاں ہے۔ کتاب میں جلد ہے بھی یا محض "ہارڈ کور" ہے۔ یا ساری الجھن اس وجہ سے ہے کہ "کور سافٹ" ہے۔

فی زمانہ اچھی کتاب کی یہ پہچان ہے کہ وہ جعلی ہو۔ مگر آپ اسے پڑھنے کے لئے بے تاب یا مجبور ہوں۔ جعلی ایڈیشن کی شانِ نزول یہ ہوتی ہے کہ کاغذ اس سے خراب نہ مل سکا۔ اس سے سستا کاتب میسر نہ آ سکا۔ جلد بس ملکی

ہو گئی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ اسے پڑھنے کے لئے غیر معمولی بینائی اور حاضر دماغی کی ضرورت ہوتی ہے کہ انگلی رکھ کر کام نکالا جا سکے۔ تقریباً بیشتر کتب فروش انتہائی اہم بیرونی کتب کے انتہائی اہم جعلی ایڈیشن اندھے نفع کمانے کے لئے چھاپتے۔ بلکہ کاغذ کا کر کے ہوشربا قیمتیں اینٹھتے رہتے ہیں۔ کچھ متنازعہ، کچھ نصابی اور کچھ اہم کتابوں کا حشر ویسا ہی برپا کر دیتے ہیں۔ جوش صاحب کی "یادوں کی بارات" کا اصلی ایڈیشن دیکھ لیجئے تو آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں مگر دستیاب ایڈیشن پڑھنے سے فاضل مصنف کی اردو تک مشکوک ہو جاتی ہے۔ کوئی جملہ بگڑا رہا ہے تو کوئی محاورہ ہے۔ ابن انشا کی "اردو کی آخری کتاب" کا اصل ایڈیشن حسن و جمال میں دلہنوں کو شرما دیتا ہے۔ مگر جعلی ایڈیشن۔ اندازہ ہوتا ہے کہ خرابی میں بھی کس قدر خرابہ ہو سکتا ہے۔ یوسفی کی "چراغ تلے" کا فٹ پاتھ ایڈیشن دیکھ پائیں تو آسانی سے سمجھ جائیں کہ "آنکھوں میں خون اترنا" کے آخر معنی کیا ہوتے ہیں۔

کتابیں اب صرف پیٹ کی خاطر چھاپی جا رہی ہیں یا توند بڑھانے کے لئے۔ ایک دفعہ بھی پڑھنے پر کتاب تار تار اور کاغذ بکھر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اگر کتاب قاعدہ کی طرح اہتمام سے سامنے رکھ کر پڑھی گئی تو غنیمت اگر بے خیالی میں موڑ دی تو ورقیاں جھڑنے لگیں گی اور ختم ہونے تک گور سر مرد فتی ملیدہ اور کتاب معوسہ ہو جائے گی۔ جب ہم نے ایک ناشر سے جلدوں کی زبوں حالی کی دبے لفظوں میں شکایت کی تو وہ یوں گویا ہوئے:۔

"صاحب آپ بھی عجیب آدمی ہیں؟ اس مہنگائی میں کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں۔ اس طرح تو ہو چکا آپ کا پڑھنا لکھنا اور ہو چکا گزارا۔ اللہ شوق دے تو پہلے جلد بندھوا لیجئے۔ ایک پڑھائی تک تو ساتھ دے ہی دے"

ہم نے پوچھا: "آخر آپ پڑھا لکھا کسے کہتے ہیں؟" وہ چمک کر بولے: "جس شاعر ادیب نقاد وغیرہ کو کوئی بڑا عہدہ مل جائے بس ہو گیا وہ سب سے بڑا۔ اور اگر اپنے ساتھیوں کو زندہ درگور کر کے صدر شعبہ اردو ہو گیا تو بس ہو گیا سب سے بڑا پڑھا لکھا۔ محقق فاضل" ہم نے کہا معاف کیجئے گا! بڑے عہدے دار اور صدور شعبہ جات ہائے اردو کے میں آپ کی رائے خاصی مشکوک ہے:

ناشر نے شانوں سے اینٹھتے ہوئے گھڑک کر فرمایا۔ میاں جن کے علم و فضل کے ڈنکے بجتے ہوئے ہیں ان کو کوئی بلا پروٹوکول طرح عنایت کر دیجئے مطلع ہوتا ہیں عنایات کی ہوا نہ نکل جائے تو میرا ذمہ!

ہم نے پوچھا۔ "مالی حالت سے آخر آپ ادبی حالت کو ملانے پر کیوں مُصر ہیں؟" بولے۔ "ان علاقوں پر خود جو دامن بھی کم پیش شاعر ادیب پیدا کرتے ہیں۔ شاعروں کی بین الاقوامی ٹیم تیار کرتے ہیں جن کا آپ نام چھپنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ بہر حال اس مہنگائی میں اگر آپ کی ماہوار آمدنی پانچ ہزار سے کم ہے تو کوئی کا نقاد بھی آپ کا نام تو لینے سے رہا۔ نقاد غریب ادیب کو کھاتا نہیں، کھاتا تو آخر شاعر اور ادیبوں کو ہے۔ پھر اگر ان کے نام پر ہم ان کے جعلی ایڈیشن چھاپ کر کما لیتے ہیں تو کیا ظلم کرتے ہیں:

اس ستم ظریفی پر ہمیں یاد آیا کہ لیسنگ (LESSING) کی "عقلمند ناتھن" (NATHAN THE WISE) کو حسن اتفاق کہ ہم نے بزبانِ اردو اس کا ترجمہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۷۸۱ء میں انگریزی زبان میں اتنا ابہام تھا یا وہ یورپ کی جلد بازی کی بگڑی تھی۔ اس کا اگر شبہہ بھی ہو جاتا کہ انگریزی کے معنی اطالوی، یونانی، ہسپانوی، فرانسیسی وغیرہ بھی ہو سکتے ہیں تو ہم فیصلہ واپس لے لیتے۔ دشواری یہ تھی کہ اولین سو صفحات جہازی جو عقل و نقد، تاریخ و معلومات کا بیش بہا خزانہ تھے۔ کنگ ریڈر پہاڑے کی طرح سادہ آسان اور رواں تھے۔ جن کا ہم نے فر فر ترجمہ بھی کر ڈالا۔ اب ہماری حالت اس جہاز کی تھی جو ساحل کے نزدیک لنگر انداز ہو۔ پر کنارا دور ہو۔

مجبوراً ہم نے بابائے اردو کی "انگریزی اردو لغت" یعنی "بابا" کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ کبھی کبھار یونانی انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، لاطینی وغیرہ لغات پر بھی تکیہ کر لیتے۔ بیٹھ کر، لیٹ کر، ٹہل کر، سر کو ہاتھوں سے پکڑ کر ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر، ہوا میں ہاتھ لہرا کر، فکر میں غرق ہو کر کتاب کے ان نازک مقامات سے بدقت تمام گزرتے بلکہ کھسکتے رہے۔ الجھن اور ذہنی کش مکش کی جتنی بھی قسمیں ہو سکتی ہیں وہ سب ہم پر آشکار ہو گئیں۔ آئینہ بھی شرمانے لگا۔ گھر والوں نے ہمارے حلیے اور صحت کے بارے میں چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔ ڈاکٹر کو دکھانے پر زور دیا۔ سب باتوں سے بے پروا ہم جونک کی طرح "بابا" سے چمٹے ہوئے کتاب کا پیچھا کرتے رہے۔

ابھی ہم نے کتاب کے ابتدائی دس صفحات کا ترجمہ کیا تھا کہ "بابا" نے ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا۔ جلد کی دونوں دفتیاں اس طرح سے جھولنے لگیں جیسے مرنے سے کچھ پہلے گدھا اپنے دونوں ڈینے ڈال دیتا ہے۔ ہمارے ایک مہمان جو کھانا کھا کر برآمد ہوئے تھے بابا کی پشتی جو اب اُدھڑ چکی تھی اور جزبندی کی سلائی سے جھٹ پٹ نکل آئے تھے انہوں نے بڑی بے تکلفی سے ایک تاگا توڑ کر دانتوں کے آر پار خلال کا عمل شروع کر دیا۔ ہمارا خون ہی تو کھول گیا۔ بس پی گئے۔ آگے عبارت کچھ ایسی بے ڈھب تھی کہ ہماری ترجمے کی گاڑی اس طرح رک گئی تھی گویا مختلف النوع زبانوں نے مل کر اس کی زنجیر کھینچ لی ہو۔

کتاب میں کچھ عبارت ایسی آگئی تھی کہ معلوم ہوا کہ ڈکشنری نہیں کوئی وکیل ہی ان اصطلاحات کو بتا سکتا ہے۔ وکیل صاحب نے مشورے کی فیس طلب کر لی۔ مگر ایسا سمجھایا اور بتایا کہ ہم فیس ادا کرنے کے باوجود پھڑک اٹھے۔

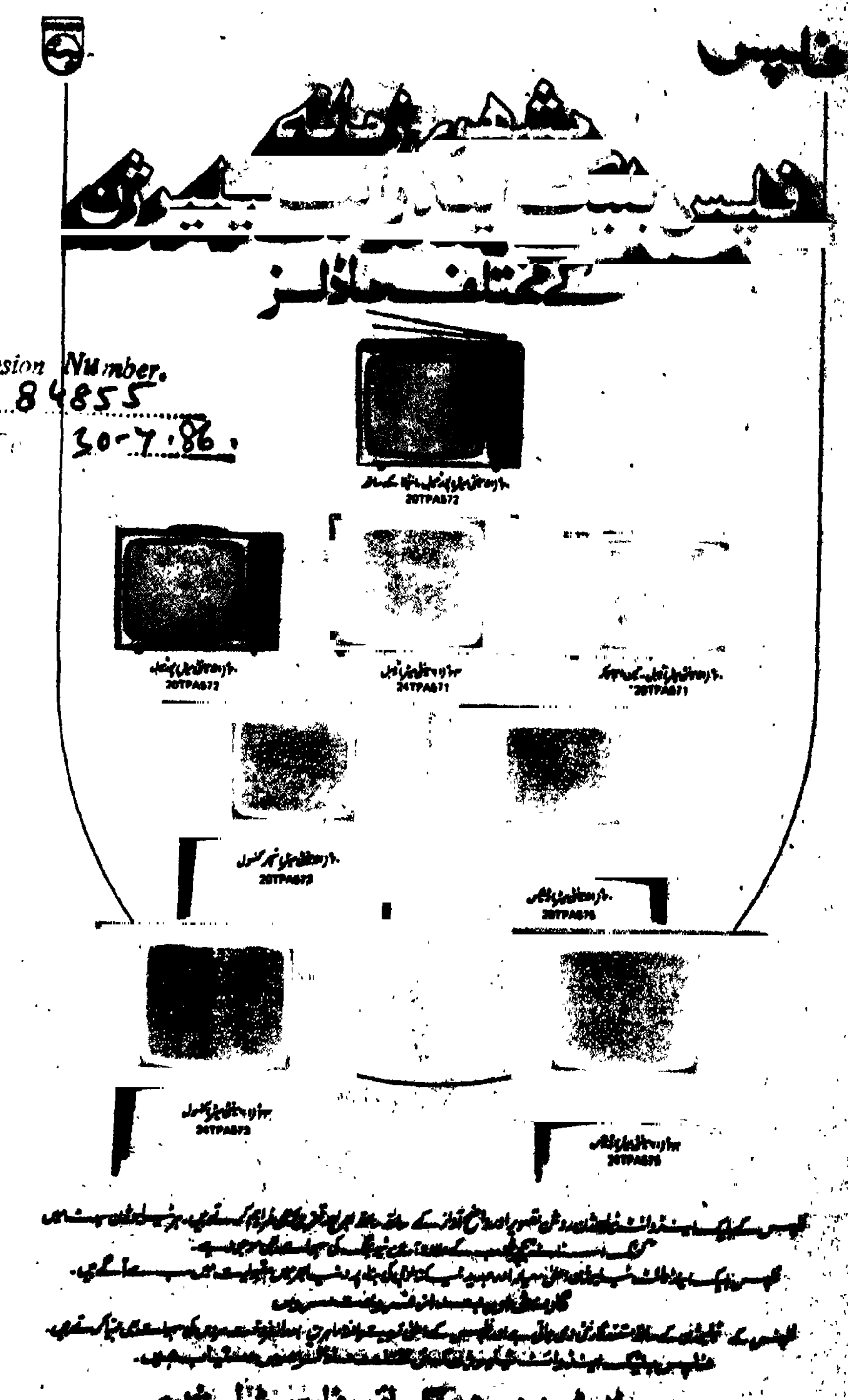
فاضل مصنف کو شاید علم تھا کہ دو سو سال بعد ہم اس فخرِ روزگار کو اردو میں پیش کریں گے اور اس سلسلے میں ہمیں مسلسل زحمت رہے۔ اس لیے اچانک وہ خالص سادہ اور آسان انگریزی پر اتر آیا تھا۔ انداز بیان یہ تھا کہ وہ فر فر بیان کرتا کینیڈین انجن کی طرح تیز گام اُڑا چلا جا رہا تھا۔ سو صفحات ہم نے بآسانی ترجمہ کر ڈالے۔ یہاں تک کہ مصنف پر پھر قابلیت کا دورہ پڑ گیا۔ اور گاڑی جام ہو گئی۔ بابا کی حالت ورق ورق تھی۔ اگر پنکھا تیز ہو جاتا یا ہوا کا جھونکا آتا تو ان کے پرزے اُڑنے لگتے۔ سہولت کے اعتبار سے ہم نے حروف تہجی کے لحاظ سے ڈکشنری کی

یہاں بنا کر پیپر ویٹ بلکہ ہر دلی شے کے نیچے دبا دیں۔ اب مصیبت یہ تھی کہ اگر مسز ار۔ کی گٹھڑی اٹھاتا تو پنکھے کو گٹھڑی ورق اڑتے۔ بھلا ان کی ورق گردانی کیسے کی جائے۔ معلوم ہوتا کہ ہم ڈکشنری نہیں دیکھ رہے ہیں کرنسی نوٹ گن رہے ہیں۔

تعجب اس بات پر ہے کہ ملّا بابا سے زیادہ ہم نے دوسری زبانوں کی ڈکشنریوں سے استفادہ کیا۔ جن کے اصلی پبلشر کسی سے مِس ہو گئے۔ مگر اس دو نمبر کی حالت یہاں تک غیر ہو چکی تھی کہ اچانک ہم پر انکشاف ہوا کہ کچھ حروف تہجی ایسے سرے سے پائے ہی نہیں جاتے۔ خاصی چھان بین کے بعد پتہ چلا کہ کسی دن ہوا سے کچھ کتریاں اڑ کر فرش پر گر گئی تھیں جن کو بہتر کوڑا سمجھ کر جھاڑو سے صاف کر کے کوڑے پر ڈال چکا تھا۔ کوڑے کو کریدنے پر کچھ صفحات ٹھیک مل گئے۔ مگر بارش نے ان کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ کچھ صفحات نہایت مشکوک حالات میں باورچی خانے سے برآمد ہوئے مگر ہمارے تیور دیکھ کر باورچی صاف مکر گیا۔ یوں بھی خراب کھانے کے علاوہ وہ کوئی دوسری ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔ مجبوراً ہم بابا کے اردو کا سالم جعلی ایڈیشن مکتبہ سے خرید لائے تاکہ ترجمے کی جو غلطی شروع کی تھی اسے نباہ آئندہ کے لیے اس قوم کے ترجمے سے معافی مانگ لیں۔ جس پر اب سورج غروب ہونے لگا ہے۔

خدا خدا کر کے تین سو صفحات پورے ہوئے جن میں سے دو سو کا دکھڑا یہ کہ اس مرحوم کے نام لگایا جا سکتا ہے بلکہ ملا بابا کے کھیتے بھی دھر لگایا جا سکتا تھا کیونکہ ان کے اکثر بیس پچیس صفحات پر اتنے ڈھیلے ہو گئے تھے کہ دیکھنے پر معلوم ہوتا کہ حادثے کے بعد ہوائی جہاز کے ملبے سے نکلنے والا مسافر جس کا سر کہیں دھڑ غائب چھوٹے بڑے کٹے پھٹے سے چوتھائی اعضا۔ آسانی کے لیے ہم نے بہت سے جوتے کے ڈبے میز پر سجا دیئے، ہر ڈبے پر کسی نہ کسی حرف کا نام جلی طور پر لکھ دیا۔ جب کوئی لفظ ڈھونڈنا ہوتا تو متعلقہ ڈبے میں معنی خیز غوطہ لگا دیتے

جوتے کے ڈبوں میں غوطہ خوری کا سلسلہ جاری تھا۔ اب محض آخری باب کے دس صفحات کا ترجمہ باقی تھا۔ اسی خوشی میں سینما دیکھنے چلے گئے۔ انٹرول ختم ہونے کے تھوڑی دیر بعد مزید ایک جبری انٹرول ہوا یعنی بجلی غائب ہو گئی۔ بڑی دیر بعد بجلی واپس آئی۔ معلوم ہوا کہ طوفان آ گیا تھا۔ آندھی کا پہلا نزلہ بجلی پر گرا تھا جب مجھے معلوم ہوا تو آندھی ختم ہو چکی تھی۔ آندھی کا نام سنتے ہی اندھیرے میں پکچر چھوڑ کر بگٹٹ گھر بھاگا۔ طوفان آندھی کے بعد بارش میں تبدیل ہو چکا تھا۔ بھیگتا ہوا گھر پہنچا۔ لائبریری کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں جوتے کے سارے ڈبے غائب تھے۔ اور پرانے دونوں باباؤں کو آندھی اڑا لے گئی ہے۔ چنانچہ بس دس صفحات کا میں نے آزاد بلکہ شاعرانہ ترجمہ کر دیا۔ جس کا لینڈنگ سے زیادہ حالات سے تعلق تھا کیونکہ ڈکشنری کی دفتیوں سے ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔



فلپس
شہرۂ آفاق
فلپس بلیک اینڈ وائٹ ٹیلیویژن سیٹس
کے مختلف ماڈلز
20TPA672
20TPA672
24TPA671
20TPA671
20TPA673
20TPA676
24TPA673
24TPA676
چھوٹے بڑے سب کی پسند فلپس ٹیلیویژن

گھر کے چراغوں کو روشن رکھیئے

ذمہ دار والدین بیمہ پالیسی حاصل کرنے میں کبھی غفلت یا دیر نہیں کرتے۔ اسٹیٹ لائف کے پاس ہر کنبے کی ضروریات اور مقاصد کے لیے موزوں بیمہ پالیسی موجود ہے۔ بیمہ تحفظ اور بچت کا بہترین ذریعہ ہے۔ اب آپ کو بیمہ میں لگائی ہوئی رقم پر پہلے سے بھی زیادہ بونس ملتا ہے اور اس پر انکم ٹیکس میں رعایت بھی ملتی ہے۔ بیمہ آپ کے بال بچوں کی خوشحالی کا محافظ بھی ہے اور ملک کی ترقی و فلاح کا ضامن بھی۔

• بیمہ کرائیے • نفع کمائیے • انکم ٹیکس بچائیے



ہمارے نمائندے آپ کو بسر و چشم مناسب مشورہ دینگے۔ ان سے رابطہ قائم کریں۔

اسٹیٹ لائف

انشورنس کارپوریشن آف پاکستان

United PIC